کلیات رشید احمد صدیقی

(آپ بیتی)

جلد اوّل

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

کلیات رشید احمد صدیقی

(آپ بیتی)

جلد اوّل

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110

پہلی اشاعت : 2009
تعداد : 550
قیمت : -/174 روپے
سلسلہ مطبوعات : 1311

Kulliyat-e-Rashid Ahmad Siddiqui (Aap Biti) Vol. I
Compiled by Abul Kalam Qasmi

ISBN : 81-7587-279-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: گویل اسٹیشنر یز آف سیٹ پرنٹرس، 433، گلی روبن ٹاکیز، اولڈ، نئی دہلی۔ 110 007

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیش تر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کرلیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتدادِ وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔

مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کے بنیاد گذار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کو رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ایسا استحکام نہ بخشا ہوتا تو بعد کے زمانے میں مشتاق احمد یوسفی، مختار مسعود، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز و مزاح کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں میں ایسی رنگارنگی نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ علی گڑھ اور دبستانِ علی گڑھ کو ایک روایت میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس طرح ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک شائستہ طرزِ زندگی کی علامت کی شکل میں پیش کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ، عرصہ دراز تک اپنے علمی اور تہذیبی کارناموں کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات رشید احمد صدیقی کے پروجیکٹ میں ان کی کتابی شکل میں مطبوعہ تحریروں کے ساتھ رسائل کے صفحات میں منتشر تحریروں، ان کے خطوط اور غیر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ کلیات محض رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی دوبارہ اور یکجا اشاعت ہی نہیں، تحقیق و تلاش اور تدوین کا بھی عمدہ نمونہ بن کر قارئین کے سامنے آرہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کے اپنے تمام منصوبوں میں اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو باخبر کریں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کرلیا جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

آپ بیتی

رشید احمد صدیقی

فہرست مضامین

●

دیباچہ

رشید احمد صدیقی کو انشاء پرداز کہا جائے یا تنقید نگار، انھیں ظرافت نگار کا نام دیا جائے یا طنز و مزاح نگار کا، ان کو ادیب سمجھا جائے یا دانش ور۔ وہ اپنے ہر رنگ اور ہر روپ میں ایک پختہ کار اور مشاق فن کار کی حیثیت سے اپنا مخصوص امتیاز برقرار رکھتے ہیں۔ اس لیے رشید احمد صدیقی کے لیے، کسی مخصوص صنف ادب کے ساتھ وابستہ کر کے ان کی قدر و قیمت کو متعین کرنا، ان کی بڑائی کو محدود کرنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے جس صنف اور جس اسلوب میں بھی اپنا اظہار کیا اس صنف اور اس اسلوب کے ضوابط کی پابندی سے زیادہ انھوں نے صنفی اور اسلوبیاتی ضابطوں کو اپنے پیرایۂ اظہار کا پابند رکھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ظریفانہ مضامین ہوں یا طنز و مزاح پر مبنی انشائیے، دوستوں اور بزرگوں پر لکھے ہوئے ان کے شخصی خاکے ہوں یا غالب اور اقبال کی شخصیت اور شاعری کے جائزے، ہر جگہ رشید صاحب اپنی مخصوص شناخت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں اور ہر موضوع میں اپنے رچے ہوئے مذاق، اخلاقی اقدار اور بزلہ سنج طبیعت کی افتاد کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ کے دبستان تہذیب و ادب کے عاشق اور ترجمان کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب علی گڑھ سے وابستگی کو اپنی

کمزوری کبھی نہیں بننے دیتے۔ رشید صاحب کے لیے علی گڑھ ایک مقام، ایک درس گاہ اور محض ایک چھوٹا سا قصبہ نما شہر نہیں، علی گڑھ ان کے لیے ایک علامت ہے۔ وہ علی گڑھ کو تہذیب و شائستگی، شعر و ادب اور مغل ہند تمدن کی ایک ایسی علامت سمجھتے ہیں جس کی نشو و نما میں گذشتہ کئی سو سال کی روایت اور ریاضت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کو یوں تو ہر شائستہ آدمی، علی گڑھ کا تعلیم یافتہ اور ہر نستعلیق شخصیت علی گڑھ کی پروردہ دکھائی دیتی ہے، لیکن اس رویے میں ان کی علی گڑھ پرستی سے کہیں زیادہ ایک مخصوص تہذیب و ثقافت اور آدابِ زندگی کی دل دادگی پوشیدہ ہے۔ اس طرح رشید صاحب کے اس زاویۂ نگاہ کا رشتہ تہذیبی اقدار اور شعر و ادب کے پروردہ مذاق سے جاملتا ہے۔ تہذیبی قدروں اور شعر و ادب کے ذوق کو اگر کوتاہ نظری سے دیکھا جائے تو یہ تمام چیزیں ایک شخص کی ذاتی پسند و ناپسند میں سمٹ کر محدود بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر رشید احمد صدیقی جب اسی رویے کو اپنی وسعت نگاہ سے آشنا کرتے ہیں تو ان ہی کے اقدار کے وسیلے سے ان کو پڑھنے والا، قوموں کے عروج و زوال کی پوری داستان پڑھ لیتا ہے، اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی نہ تو محض تنقید نگار ہیں اور نہ محض مزاح نگار، وہ دراصل شعر و ادب پر صرف تنقید نہیں کرتے بلکہ شعر و ادب کے وسیلے سے تہذیب و تمدن کی اقدار کا تعین کرتے ہیں۔ وہ اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے صرف طنز و مزاح کی کیفیت کو نہیں اُبھارتے ہیں بلکہ اخلاقی اقدار کے عدم توازن کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے مضامین میں زیرِ بحث آنے والی شخصیات ہی نہیں بلکہ شعر و ادب سے متعلق موضوعات بھی ایک ایسا سیاق و سباق اختیار کر لیتے ہیں کہ ہم ان کے موضوعات کو ثقافتی ابتری و زوال آمادگی پر اظہارِ خیال کا وسیلہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ رشید صاحب جب کسی شخص کے بارے میں کوئی طنزیہ جملہ لکھتے ہیں تو وہ طنزیہ جملہ ایک شخص کی ذاتیات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس سے کسی قومی یا اجتماعی نوعیت کے ایسے نقص کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جس کی نمائندگی کے لیے ایک آدمی کو محض موضوع بنالیا گیا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ رشید صاحب چھوٹے چھوٹے مسائل و موضوعات اور حقیر سے حقیر آدمی میں پورے پورے معاشرہ کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے ''آشفتہ بیانی میری'' کے نام سے خودنوشت سوانح بھی لکھی ہے
خنداں اور مضامین رشید میں اپنی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے جوہر بھی دکھلائے ہیں، گنج ہائے گراں مایہ
اور ہم نفسانِ رفتہ کے عنوانات سے خاکہ نویسی بھی کی ہے اور غالب، جدید غزل اور طنزیات و
مضحکات جیسے موضوعات پر تنقیدی اور تحقیقی کتابیں بھی لکھی ہیں، مگر اپنے ہر موضوع اور ہر طرز
اظہار میں رشید صاحب پہلے ایک انشا پرداز ہیں اور ممتاز ترین اسلوب نگارش کے مالک نثر نگار کی
حیثیت سے اپنی شناخت کراتے ہیں اور اس کے بعد اپنے موضوع کی مناسبت سے موضوعاتی یا
صنفی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کوئی موضوع کبھی ان
پر غالب نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنے آپ کو اپنے معتقدات و مسلمات کو اپنے انداز نگارش کو اور اپنی
مطلوبہ اقدار کو ہر جگہ ادبی اصناف اور موضوعات پر غالب رکھتے ہیں۔ غالب اور اقبال سے
متعلق رشید صاحب کی دو کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر دونوں کتابوں میں شاعر کے ساتھ
شخص کا سابقہ لگا ہوا ہے یعنی غالب، شخص اور شاعر اور اقبال، شخص اور شاعر۔ یہ دونوں عنوانات
صرف عنوانات یا کتابوں کے نام نہیں ہیں بلکہ ان کتابوں کے مصنف کے زاویہ نظر اور طرز تنقید
کی بھی غمازی کرتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں چوں کہ ایک ایسے ادیب اور تنقید نگار کی ہیں جو
شاعری یا فن کو شاعر یا فن کار کی شخصیت کے پس منظر کے بغیر نامکمل سمجھتا ہے اور یہی وہ زاویہ نقد
ہے جس کے باعث رشید احمد صدیقی کے اس مشہور جملے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں
انھوں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ''اچھا آدمی ہی اچھی شاعری کر سکتا ہے'' یا یہ کہ ''برا آدمی
اچھی شاعری نہیں کر سکتا''۔ اس طرز فکر پر اعتراض کیا جا سکتا ہے، اس خیال کو غلط قرار دیا جا سکتا
ہے اور اس طرح کے کسی بھی مفروضے کو مسترد تک کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار مشکل
ہے کہ شعر و ادب اور فنی اظہار کو تہذیب و ثقافت کا مظہر ماننے والے کسی ادیب کے لیے معیار و
اقدار کے ایسے ہی مسلمات اس کے موقف کی ترجمانی کر سکتے ہیں اور اس نوع کے کسی موقف
کے وجود کے بغیر اقداری فیصلے اپنی قیمت کا احساس نہیں دلا سکتے۔

رشید صاحب کی ہر کتاب ہی نہیں، ہر تحریر ان کی شگفتگی طبع کا اظہار کرتی ہے۔ مگر
طبیعت کی یہ شگفتگی صرف مزاحیہ عناصر اور طنز و تمسخر سے عبارت نہیں۔ ہر طنز کے پیچھے کسی اخلاقی

بحران کا نکتہ، ہر مزاح کے پس منظر میں کوئی معاشرتی بے اعتدالی اور ہر تمسخر کے اندر کوئی نہایت سنجیدہ ذہنی اور فکری کسک چھپی دکھائی دیتی ہے۔ رشید صاحب کی ظرافت میں شگفتگی اور زندہ دلی کا مظاہرہ تو یقیناً ہوتا ہے، مگر ان کا ہر ظریفانہ جملہ کسی نہ کسی مقصد کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بذلہ سنجی کبھی پھکڑ پن یا بے جا تضحیک کا روپ نہیں اختیار کرتی۔ اس لیے شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ رشید صاحب کی گفتگو داخلی سنجیدگی اور خارجی شگفتگی کا مرکب ہوتی ہے۔ داخل اور خارج کے مابین اس نوع کا اعتدال و توازن قائم رکھنا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب رشید صاحب کی تحریروں کا موازنہ دوسرے ظرافت نگاروں یا انشائیہ نگاروں سے کیا جائے۔ رشید صاحب ان کے بالمقابل اپنی ذہنی تربیت، قدروں کے تصور اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کو مزاح اور ظرافت کی تخلیق کے سرچشمے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ طنز و مزاح اور ظرافت کی تخلیق کے جو ترکیبی عناصر ہو سکتے ہیں ان میں بھی نت نئی ندرت اور انفرادیت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ادب رشید صاحب کے وسائل فیضان میں سے صرف ایک وسیلہ ہے، ورنہ ادب اور زندگی کا رشتہ، تہذیب کی شناخت کا مسئلہ اور شعر و ادب میں جذب ہو کر ادبی روایت کا حصہ بننے والا اجتماعی شعور، جیسے غیر معمولی عناصر در حقیقت رشید صاحب کی تخلیق کے لیے خام مواد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی مزاح اور ظرافت کی تخلیق کے لیے کبھی Paradox کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، کبھی غیر متعلق اور بے ربط حقائق میں رشتہ ڈھونڈ لیتے ہیں، کبھی تضاد کی صنعت سے مزاح کا عنصر پیدا کرتے ہیں اور کبھی اشعار کے برمحل استعمال یا ان میں لفظوں کی تحریف سے کوئی نیا جہانِ معنی روشن کر دیتے ہیں اور کبھی رمزیت اور ایمائیت کا انداز اختیار کر کے بہ ظاہر مضحک، مگر در حقیقت بہت دور رس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ایسے مصنفین کے کلیات کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے جن کی ہمہ گیری ان کے بالاستیعاب مطالعہ کی تقاضہ کرتی ہے۔ اس ضمن میں بعض اہم مصنفین کے کلیات کی اشاعت ہو چکی ہے۔ چوں کہ رشید احمد صدیقی کی تمام تحریریں قارئین کو دستیاب نہیں، اس لیے اس کلیات میں ان کی ان مطبوعہ تحریروں کے ساتھ جو کتابی

صورتوں میں موجود ہیں، ان تحریروں کو بھی شامل کیا جارہا ہے جو یا تو مضامین اور متفرقات کی صورت میں رسائل کی فائلوں میں دفن ہیں یا پھر بہت سی تحریروں کو ہنوز شائع ہونے کا موقع ہی نہیں ملا ہے۔ ان میں رشید احمد صدیقی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط و خطبات بھی شامل ہوں گے اور سفر نامے بھی۔

اس کلیات کو صنفی اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں ان کی معروف آپ بیتی ''آشفتہ بیانی میری'' کے ساتھ اس نوع کی تمام تحریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں جن کو آپ بیتی کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ رشید صاحب کی تحریروں میں تمام وضاحت طلب مقامات پر ضروری حواشی اور معلومات بھی فراہم کر دیے جائیں، تا کہ ہر تحریر کا سیاق وسباق بھی قارئین کے لیے واضح ہو جائے۔

مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ رشید احمد صدیقی کے اس کلیات کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

میں اپنے معاون اور کرم فرما جناب مہر الٰہی ندیم (علیگ) کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ رشید احمد صدیقی کی تمام تحریروں کی دستیابی کو آسان بنایا، بلکہ غیر مطبوعہ تحریروں کی تلاش وجستجو کا بھی حق ادا کر دیا۔ مزید یہ کہ ضروری معلومات اور حوالے کے لیے تمام مآخذ تک ہماری رسائی کرادی۔

ابوالکلام قاسمی

دیباچہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی (1977ء-1894ء) کی خودنوشت ''آشفتہ بیانی میری'' کا شمار اُردو کی بہترین خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔ مشرقی یو پی کے شہر جون پور اور اطراف جون پور کی بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے سماجی و تہذیبی حالات کے علاوہ 1915ء میں ایم۔اے۔او۔ کالج میں اپنے داخلہ سے 1950ء کے اوائل تک یہاں کے اساتذہ، ساتھیوں اور یہاں کی اقامتی زندگی و تعلیمی سرگرمیوں کو اپنے مخصوص انداز میں رشید صاحب نے بیان کیا ہے۔

''آشفتہ بیانی'' کا پہلا ایڈیشن فروری 1958ء میں، دوسرا اگست 1958ء میں اور تیسرا جون 1962ء میں مکتبہ جامعہ، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ تیسرے ایڈیشن میں رشید صاحب نے اس پر نظرِ ثانی کی اور ترمیم و اضافہ کیا۔

آخر میں علی گڑھ کے مصنفین کی کتابوں کی فہرست نکال دی اور اپنے بعض اساتذہ کے ذکر میں چند اوراق بڑھا دیے اور طلبا کی سہولت کی خاطر بعض جگہ تشریحی نوٹ بھی درج کر دیے۔ مرتبین نے تیسرے ایڈیشن مطبوعہ 1962ء کو ہی تدوین کے لیے منتخب کیا ہے۔ ''آشفتہ بیانی میری'' ہندو پاک کے اکثر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اُردو کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ 1958ء سے اب تک یہ کتاب ہندو پاک میں متواتر شائع ہو رہی ہے جو اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

نوٹ: اس فہرست کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر قارئین کے افادے کے لیے اس کو شامل کرلیا ہے۔ مرتبین

کیوں؟

جہاں جائیں وہاں تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے!

علی گڑھ مجھے عزیز ہے، اس کی کوتاہیوں کے باوجود اگر وہ قابلِ اعتنا ہوں۔ یقیناً ان عزیزوں اور بزرگوں کو بھی عزیز ہوگا جن کو اس نے اپنے فیضِ تربیت سے اخلاص و افتخار سے رہنے سہنے اور دوسروں کو رکھنے کا سلیقہ اور حوصلہ دیا اور انسانی زندگی جن قیمتی اقدار و روایات کے سہارے نمود پاتی اور برگ و بار لاتی ہے ان سے آشنا کیا۔ بیالیس سال تک مسلسل جس کو علی گڑھ نے اپنی ان نعمتوں سے بہرہ مند رکھا ہو علی گڑھ کے بارے میں اس کے تصورات و تاثرات اگر

بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے "حواس"

کی حد تک پہنچتے ہوں تو کیا تعجب۔

علی گڑھ سے میری یہ عقیدت ذاتی ہی نہیں ہے، اس اعتبار سے ہے کہ مسلمانوں کا یہ ادارہ جب سے قائم ہے جس کو آج کم و بیش بیاسی سال ہونے آئے۔ اس کے دروازے بلا امتیاز مذہب و مسلک، رنگ و نسل، امارت و افلاس، ہر طالب، ہر معلم، ہر اہلِ کار اور اہلِ حرفہ کے لیے کھلے رہے۔ آج ہندوستان میں کوئی سرکاری یا غیر سرکاری تعلیم گاہ علی گڑھ کے سوا نظر نہ

آئے گی، جہاں اتنے اور اس طرح کے لوگ جن کا ذکر اوپر آیا ہے، یکساں فراغت وفخر سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے سہتے، کام کرتے اور خوش رہتے ہوں، جتنے علی گڑھ میں۔ علی گڑھ کی اس نمایاں و بے نظیر خدمت و خصوصیت کو ان لوگوں نے خاص طور پر نہیں پہچانا جن کو سب سے پہلے اور سب سے بعد تک پہچاننا چاہیے تھا، اس لیے کہ اپنے میں وہ یہ امیاز پیدا کر کے ملک کی بڑی مبارک خدمت کر سکتے تھے!

علی گڑھ کی یہ خدمت بھی ہمیشہ فخر سے یاد رکھی جائے گی کہ اس نے اردو شعروادب کو بہت سی نامناسب پابندیوں سے نجات دلا کر زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں سے آشنا مربوط و مستحکم کیا۔ جدید اردو کے بیش تر اسالیب اور صحت مند رجحانات و روایات علی گڑھ کے دیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے تحفظ و ترقی میں جیسی بروقت اور بیش بہا خدمات، براہِ راست یا بالواسطہ، قیام کالج سے آج تک علی گڑھ نے انجام دی ہیں وہ ایک گراں بہا ورثہ اور قابلِ قدر روایت کی حیثیت سے ہم تک پہنچی ہیں، جن کی نگہ داشت واحترام بہ ہر گونہ ہم پر لازم آتی ہے۔

زمانہ اور زندگی بے اندازہ تیزی اور شدت سے منقلب ہو رہے ہیں جیسے:

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"[1]

مسلمہ اقدار و قابلِ قدر روایات زد میں ہیں۔ ان کے وزن اور وقعت میں تذبذب اور تزلزل راہ پانے لگا ہے۔ علی گڑھ بھی اس دور سے گزر رہا ہے۔ کوئی نہ کہہ سکتا کہ زندگی کے نت نئے مسائل اور مطالبے علی گڑھ کے "شب و روز و ماہ و سال" پر کس حد تک اثر انداز ہوں گے۔ اس لیے اندیشہ گزرا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس شان دار و فیض بخش ادارے کے کارناموں سے آئندہ نسل ناآشنا رہ جائے اور کچھ اس طرح کا سانحہ پیش آئے جس کی طرف حالی نے اشارہ کیا ہے ع

"بھول جائیں گے کہ تھے کن ڈالیوں کے ہم ثمر!"

آئندہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ علی گڑھ کے بارے میں میرے ذاتی خیالات اور تاثرات ہیں اور زیادہ تر انھی سے متعلق ہیں۔ ان میں کہیں درازنفسی ملے گی، کہیں

---

[1] رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں — غالب

ژولیدہ بیانی، کہیں خود کلامی یا حدی خوانی۔ ایک آدھ جگہ خام خیالی بھی۔ جا بجا ''رندانِ درِ میکدہ'' کی گستاخی نظر آئے گی۔ فقیہ شہر یا ملائے مکتب کے فیصلے یا فضیحتے سے بھی سابقہ ہو تو عجب نہیں، لیکن ان سب پر بھاری وہ منطق ہے جو اس شعر میں ملے گی:

حدیث دل کش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

''قصۂ زلفِ پریشاں'' میں یہ سب (اکثر ان سے زیادہ بھی) انگیز کرنا پڑتا ہے۔ اس سے اپنی ہی کوتاہیوں کی جواب دہی مقصود نہیں ہے۔ ان سطور کے پڑھنے والوں کے بھی کسی نہ کسی قصۂ زلفِ پریشاں کی جواب دہی مد نظر ہے! اگر ان خیالات و تاثرات سے کسی کو اتفاق ہو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اختلاف ہو تو تعجب نہ ہوگا۔ علی گڑھ سے متعلق بعض دوستوں اور عزیزوں کے خیالات یقیناً ویسے نہ ہوں گے جیسے کہ میرے ہیں۔ وہ علی گڑھ کو اس رنگ میں اور اس طرح پر دیکھنا چاہتے ہوں گے جو ان کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ لاریب یہ بھی علی گڑھ کی خیر اندیشی میں ہوگا۔

لیکن جیسا کہ وقتاً فوقتاً اعتراف کرتا رہا ہوں میں بہ ذات خود کچھ ''مقامی'' سا آدمی واقع ہوا ہوں۔ ''آفاقی'' یا ''ماورائی'' قسم کا ہونے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں نہ حوصلہ نہ ہوس۔ اس لیے میری فکر و نظر بھی محدود اور ''آنی و فانی'' قسم کی چیز ہے۔ ہر شخص کی ہمت اس کی طبعی اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لیے اگر میں علی گڑھ کو اصغر مرحوم کے اس شعر سے تطبیق دیتا آیا ہوں یا دے لیا کرتا ہوں تو کیا ہرج:

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا مے خانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں!

میری ''ہمت'' یقیناً بلند نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے ''پیش خدا و خلق'' میرا اعتبار بھی کچھ زیادہ نہ ہو، بایں ہمہ خود اپنی نظر میں کچھ ایسا نا معتبر بھی نہیں ہوں۔

رشید احمد صدیقی

15/فروری 1958ء

آشفتہ بیانی میری

میری تحریروں میں یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ان میں ''علی گڑھ'' بہت ہوتا ہے، اس لیے وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے اُن کو ان مضامین یا اس طرح کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑھنے بھی لگے ہیں۔ ان سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ وہ خود علی گڑھ سے کیوں واقف نہیں! اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اردو کا نام علی گڑھ بھی ہے!

کسی اجنبی سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کے طور طریقوں سے خوش ہوتا ہوں تو اکثر پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کبھی علی گڑھ کا طالب علم رہا ہے یا نہیں۔ ہوتا ہے تو اس کے خوش اوقات خوش مذاق ہونے پر تعجب نہیں ہوتا۔ ورنہ افسوس ہوتا ہے کہ وہ اس نعمت سے بھی کیوں محروم رہا۔ اس سے یہ جتانا مقصود نہیں کہ علی گڑھ کا ہر لکھا پڑھا ہر خوبی سے متصف ہوتا ہے اور جو علی گڑھ کا نہیں ہوتا وہ ان خوبیوں سے عاری ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کا ایک خاص رنگ، رکھ رکھاؤ یا ٹھپّا ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز یا متمائز کرتا ہے۔ اس ٹھپّے کے بھی اقسام ہیں، بعض پسندیدہ بعض ناپسندیدہ۔ علی گڑھ کوئی جنّت یا جہنّم نہیں ہے، جہاں صرف منتخب لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست رہتا ہو، وہ تو اسی دنیا جیسی ہے جہاں اپنی جنّت یا جہنّم بنانے کی ہر شخص کو

آزادی ہوتی ہے۔ محض علی گڑھ کا ہونا کسی شخص کے معقول ہونے کی دلیل نہیں، جس طرح محض مسلمان ہونا کسی کے معقول ومعتبر ہونے کا ثبوت نہیں!

علی گڑھ میگزین کے ''علی گڑھ نمبر[1]'' میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علی گڑھ کیا ہے اور کیوں ہے۔ اس نمبر کے شائع ہونے سے مجھے یہ فائدہ پہنچا کہ بہت سی ایسی باتیں سمجھانے بتانے سے بچ گیا، جس کو مجھ سے کہیں بہتر طور پر دوسرے عزیزوں اور بزرگوں نے واضح کر دیا۔ ان مقالات کی روشنی میں میرے تاثرات اور تجربات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور غالباً دلچسپی بھی۔ زیرِنظر صفحات میں جو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا وہ علی گڑھ کے بارے میں ایسے دیرینہ اور مسلسل تاثرات ہیں جواب میرے لیے تجربے کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح ممکن ہے ان میں ''واقعیت'' کی کمی ہو لیکن اس کو کیا کروں بعض اوقات مجھے اپنے تاثرات اپنے تجربات سے زیادہ عزیز اور زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ یوں بھی مخلصانہ خامی کو میکانکی، خوبی پر کبھی کبھی ترجیح دیتے رہنا چاہیے! یہ بات ان سطور کے پڑھنے والوں کے لیے قابلِ وقعت ہو یا نہ ہو ان سطور کے لکھنے والے کے لیے بہت اہم رہی ہے۔

جن باتوں کو جس طرح بیان کرنا چاہتا ہوں معلوم نہیں اس میں کامیابی ہوگی بھی یا نہیں۔ اس وقت کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے میرا حال وکٹر ہیوگو[2] کے مشہور ناول ''دی ہنچ بیک آف نوتر دام''[3] کے عجیب الخلقت کریہہ منظر کبڑے کازی[4] مادو کا سا ہو جو مدت العمر

---

1. علی گڑھ میگزین کا علی گڑھ نمبر رشید صاحب کی نگرانی میں اور نسیم قریشی کی ادارت میں 1955ء میں شائع ہوا تھا۔ ترمیم واضافہ کے بعد کتابی صورت میں ''علی گڑھ آغاز تا امروز'' کے عنوان سے 1960ء میں شائع ہوا۔ مرتبین

2. Victor Hugo

3. The Hunch Back of Notre-Dame

4. Quasimado یہ فرانسیسی زبان کا ناول ہے، فرانسیسی تلفظ میں اس کا نام ''وکٹر یوگو کا نوتر دام دپاری''، یعنی پیرس کا گرجا گھر Notre-Dame Paris by Victor Hugo ہے۔ اس کا ہیرو ایک کبڑا ہے جس کا نام کازی مادو (Quasimado) ہے جو خود کو نوتر دام (یعنی گرجا گھر) میں جذب کر دیتا ہے اور اپنی الگ ہستی نہیں مانتا، اس ناول کی بنا پر انگریزی میں ایک فلم بھی بنی ہے جس کا نام ''دی ہنچ بیک آف نوتر دام'' (یعنی نوتر دام کا کبڑا) ہے۔

نوتر دام کے مشہور گرجے کا گھنٹہ بجانے پر مامور رہا اور بجاتے بجاتے اس پر ایسی وارفتگی طاری ہوتی تھی جیسے وہ نوتر دام میں یا نوتر دام سے اس میں پیوست ہو گیا ہو! ممکن ہے میں علی گڑھ کے نوتر دام کا کبڑا بن گیا ہوں!

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند ناپسند، رہن سہن، گفتار کردار اور فکر ونظر جسے بحیثیت مجموعی ''شخصیت'' کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علی گڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے ۔ یا تھا، لیکن اس کو تب وتاب، رنگ وآہنگ، لمس ولذت اور صورت ومعنی علی گڑھ نے دیے۔ اگر میں علی گڑھ میں نہ آتا اور میری صلاحیتوں کا سابقہ اس کسر وانکسار سے نہ ہوتا جو علی گڑھ کہلاتا ہے تو مجھے اندیشہ ہے وہ صلاحیتیں (کل نہیں تو اکثر) مفید ہونے کے بجائے میرے اور دوسروں کے لیے مضر ثابت ہوتیں۔ اب تک میں نے نہ کبھی محسوس کیا نہ کسی نے بتایا کہ مجھ پر علی گڑھ کا جو اثر ہوا وہ فی الجملہ میرے یا دوسروں کے لیے نامبارک ثابت ہوا، البتہ علی گڑھ نے جتنا فائدہ مجھے پہنچایا، اس سے یقیناً بہت کم میں اسے پہنچا سکا۔

مجھے اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے اور اس کے جواز میں کسی طرح یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ایسا کون ہے جس میں کمزوریاں نہیں ہوتیں! لیکن یہ علی گڑھ کی دی ہوئی نہیں ہیں، میں ان کو ساتھ لایا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ شاید علی گڑھ کی پیدا کی ہوئی مجھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس کو بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے کہ جب تک آدمی رتبے میں بہت بڑا نہ ہو جائے کمزوریوں کے اقرار کرنے میں نہ اس کا فائدہ ہے نہ دوسروں کا، پولیس کی دست اندازی یا ملاؤں کی دست درازی کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے، گو بڑھاپے کی وجہ سے کل کی بات معلوم ہوتی ہے، جب طالب علمی سے معلمی کے حدود میں داخل ہوا تھا میں نے اپنی کتاب ''طنزیات ومضحکات'' کا انتساب علی گڑھ کے نام ان الفاظ میں کیا تھا: ''اپنے کالج کے نام جس کے فیضان نے کسی دوسرے کے فیضان کا محتاج نہ رکھا۔'' حال ہی میں ایک اہم موقع پر جہاں فضلائے عظام کا اجتماع تھا، جس میں علی گڑھ اور باہر کے حضرات بھی شامل تھے، یہ سوال کیا گیا کہ میں نے لکھنے کا

انداز کہاں اور کیوں کر پایا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے، بے اختیار زبان پر یہ فقرہ آیا: ''علی گڑھ نے دیا۔'' تفصیل کسی نے نہ پوچھی۔ مطمئن سب ہو گئے!

ایڈیٹر ''علی گڑھ میگزین'' کا مضمون کے لیے تقاضا انتہا کو پہنچ گیا اور میں بھی بے حسی یا بے غیرتی کی آخری حد تک پہنچ گیا تو ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی دوسرے موضوع پر لکھنے کے بجائے اسی امر کو واضح کرنے کی کوشش کیوں نہ کروں کہ علی گڑھ نے مجھے کیا دیا اور کیسے دیا!

پھر یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید مجھ پر یہ الزام رکھا جائے کہ میں اپنا پروپیگنڈا (Propaganda) کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ میرا پروپیگنڈا (Propaganda) دوسرے کیا کم کرتے ہیں کہ میں خود کرنے لگوں۔ پھر عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں پروپیگنڈا (Propaganda) نہیں کرتے، توبہ واستغفار کرتے ہیں، یا عقدِ ثانی و ثالث۔ مجھے اب تک ان میں سے ایک کی بھی توفیق نہ ہوئی، ممکن ہے آئندہ بھی نہ ہو۔ اس لیے کہ کچھ اس طرح کا اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں توبہ واستغفار اور عقدِ ثانی وثالث لازم وملزوم تو نہیں ہیں؟

ایک بات کا خیال اور آتا ہے وہ یہ کہ علی گڑھ نیز اپنے بارے میں اکثر لکھتا رہتا ہوں، کبھی اپنی عادت سے بے اختیار ہو کر کبھی دوستوں اور عزیزوں کے تقاضے سے برافروختہ ہو کر۔ نادانستہ طور پر بھی وہی باتیں یہاں دُہرائی گئیں تو ممکن ہے ناظرین پر گراں گزریں، لیکن اتنی فرصت نہیں اور جی بھی نہیں چاہتا کہ پچھلی تحریروں میں اس طرح کے حالات اور واقعات اس خیال سے تلاش کرتا پھروں کہ ان کو یہاں دُہرانے سے بچوں! ضمناً یہاں اپنی ایک کمزوری کا بھی اعتراف کر لینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اب تک جتنے مضامین لکھ چکا ہوں وہ سب میری نظر سے گر چکے ہیں۔ اگر کوئی ان کا ذکر خیر کرتا ہے، لیکن مجھ سے طاقت ور ہوتا ہے تو درگزر سے کام لیتا ہوں، کمزور ہوتا ہے تو اوّلاً اس کو مار ڈالنے کا جی چاہتا ہے! اسی بنا پر میں اپنے مطبوعہ مضامین دوبارہ پڑھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اپنے چھپے ہوئے مضامین بہ طیبِ خاطر شاید ہی میں نے دوبارہ پڑھے ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں ایسے لوگ ناپید نہیں ہیں جو اپنے کس مپرس رشتے داروں یا ہم وطنوں سے رُتبے یا روپے کے اعتبار سے اونچے ہو جاتے ہیں تو ان سے تمام عمر منہ چھپائے پھرتے ہیں۔

اور فرض کر لیجیے کسی معذوری کی بنا پر میں اس حقیقت کو تفصیل سے نہ بیان کر سکوں کہ علی گڑھ کسی اور کے لیے نہیں تو خود علی گڑھ والوں کے لیے ادب اور زندگی کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صالح و صحت مند لائحہ عمل رکھتا ہے اور اس اعتبار سے ادب اور زندگی کا اس کا ایک مخصوص اور مسلمہ اسلوب بھی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی نہ کوئی علی گڑھ کا ہو خواہ باہر کا کبھی نہ کبھی اس حقیقت کو ثابت کر سکے گا جس کی وضاحت ایک کمزور اور نا تمام کوشش آج میں ان صفحات میں کر رہا ہوں۔

....

رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گزرا۔ اچھے ساتھی، ان سے اچھے اُستاد اور سب سے اچھے اپنے ماں باپ، بھائی بہن پھر دوستوں کے ماں باپ، بھائی بہن —— سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی اور دوسروں کی عزّت و خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ البتہ ریاضی اور اس کی ذرّیات ''الجبرا، اقلیدس اور مساحت'' ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہو سکی۔ ان سبھوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا رسوا کیا کہ ع

اُنگلیاں دور سے اُٹھتی تھیں کہ وہ آتے ہیں

ہم تین چار دوست ایک ہی بینچ (Bench) پر ہر درجے میں سالہا سال بیٹھتے آئے۔ ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیے جاتے جب بھی پاس مارکس (Pass Marks) تک رسائی نہ ہوتی! امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا، اس لیے ترقی دے دی جاتی۔ ہم کو اس کی سخت کوفت تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صدی تک ہماری باتیں کتابی باتوں کے مقابلے میں مان لی جاتی تھیں، ریاضیات میں آخر کیا سُرخاب کا پر لگا تھا کہ ایک شوشہ، ایک صفر تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا! اُس زمانے میں اقوام متحدہ (United Nation) قسم کا کوئی ادارہ نہ تھا ورنہ ہم اس مسئلے کو وہاں ضرور لے جاتے، کوئی فیصلہ ہو پاتا یا نہیں، مشاعرہ تو ہوتا رہتا۔

انٹرنس (Entrence) میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور سے کیا۔ اس عہد کے بورڈنگ ہاؤس کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت مختلف تھی، خاص طور پر جونپور کے اس بورڈنگ ہاؤس کی جہاں نہ خاص قسم کی کوئی نگرانی کی جاتی تھی، نہ قواعد وضوابط کی ایسی کچھ پابندی تھی۔ عموماً ہر سینئر (Senior) لڑکا، جونیئر (Junior) لڑکے کا نگراں ہوتا۔ یہ بڑی کڑی نگرانی تھی جس سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لڑکے کے نگراں، خواہ وہ جونیئر ہو یا سینئر، کسی لڑکے کے دور یا قریب کے وہ رشتے دار ہوتے جن میں سے اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر آئے ہوتے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم اُن کا کہنا نہ مانے یا اُن کی موجودگی میں اس سے کسی قسم کی لاپروائی یا بے راہ روی سرزد ہو جائے۔

یہ لوگ قدیم تہذیب اور وضع داری کا نمونہ ہوتے اور اسلاف کے حالات اس شفقت اور اس دلچسپ انداز سے سناتے اور اخلاق وتہذیب کے حدود میں رہنے کی نصیحت اس پیرائے میں کرتے کہ لڑکوں پر بڑا اچھا اور گہرا اثر پڑتا۔ اسکول یا بورڈنگ ہاؤس کے حکام ان رشتے داروں سے تعرض کرنا درکنار ان کا خیر مقدم کرتے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ طلبا پر ان رشتے داروں کا اثر سرکاری نگرانی سے کہیں زیادہ بہتر پڑتا ہے۔

جون پور تاریخی شہر ہے وہاں شاہانِ شرقی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ کئی جید مسجدیں، مزارات اور مقبرے، ایک عالی شان قلعہ، عیدگاہ، پُل، پختہ سرائے اور کتنے سارے کھنڈر شاہی زمانے کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دریائے گومتی وسط شہر سے گزرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پُل ہے۔ برسات میں بالضرور طغیانی آتی ہے۔ یہ زمانہ شہر میں تردّد اور تفریح دونوں کا ہوتا ہے۔ شہر سے متصل دریا کے کنارے شاہانِ شرقی کا ویران قلعہ ہے، کتنا اونچا، مستحکم اور شان دار! پُل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دومنزلہ عمارت ہے جس کی دیوار کے ایک رُخ پر دریا کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کرنے کے لیے نمبر لگا دیے گئے ہیں۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات واشراف، اتنا کتابیں یا اخبارات پڑھنے کے لیے نہیں جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لیے جمع ہوتے، شعر وادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کبھی دور ونزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لیے گم ہو جاتے!

جن لوگوں نے جون پور کا قلعہ اور مسجدیں نہیں دیکھی ہیں وہ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ یہ کتنی ٹھوس، کوہ پیکر اور پُر شکوہ عمارتیں ہیں۔ دہلی اور آگرے کی مغلیہ عہد کی عمارتوں میں حُسن، نفاست، نزاکت اور پُر کاری زیادہ ہے اور ان باتوں میں ان کا جواب دور دور نہیں، لیکن جو سطوت و جلال جون پور کی مسجدوں اور آثار قدیمہ میں نظر آتا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ یہ شان مجھے لاہور کی شاہی مسجد میں بھی نظر آئی۔ ان مسجدوں کے اندرونی صدر دروازے کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی، جیسے یہ ہم کو پیس ڈالیں گی یا نگل جائیں گی۔ یہاں نماز پڑھنے میں خاص طرح کا انشراح و افتخار محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم واقعی خدائے برتر و توانا کے سامنے حاضر ہوں۔

جون پور کی یہ پُرانی شاہی عمارتیں اس درجہ پاس پاس واقع ہیں کہ تقریباً ہر روز ان کے دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ کبھی دن میں کئی بار جیسے ان کا دیکھنا زندگی کے روزمرّہ کے معمولات میں داخل ہو گیا ہو۔ اس زمانے میں جون پور میں ایسے کھنڈر اور ایسے خاندان بھی کثرت سے موجود تھے جو اس شہر کی گذشتہ عظمت اور فضیلت کی بے اختیار و بار بار یاد دلاتے رہتے تھے۔ 1913ء یا 1914ء میں شیعہ کانفرنس کا ایک بڑا شان دار جلسہ جون پور کے شاہی قلعہ کے اندر منعقد ہوا تھا۔ تصور کی نگاہ میں حضرت صفی مرحوم اپنی مشہور نظم بڑے دل نشیں اور ولولہ انگیز لہجے میں سُناتے نظر آتے ہیں:

جون پور اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ
....

میں نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے جون پور واقعتاً اپنی عظمت دیرینہ کے ساتھ ہمارے اردگرد آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہو!

اب سوچتا ہوں اُس زمانے کا جون پور علم و فضل اور شاعری و شرافت کی قدیم روایات کے اعتبار سے کتنا قابلِ قدر خطہ تھا۔ بیش تر مسلمان گھرانے ایسے تھے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے۔ رؤسا، علما اور فضلا کے علاوہ عوام کا طبقہ تھا جس کے افراد پہلوانی کرتے تھے، پنجہ لڑاتے تھے، مچھ باندھتے تھے، علم اُٹھاتے تھے، طبل بجاتے، سوز خوانی اور ماتم کرتے،

فیرنی کباب بیچتے تھے، بٹیر لڑاتے اور کبوتر اُڑاتے تھے۔ بہ ایں ہمہ سوسائٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، کرتے کچھ ہوں بیٹھتے سب کے برابر تھے۔ نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا۔

ہر خاندان میں خواہ وہ کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی شاعر مرثیہ خواں، خوش نویس، پہلوان، پتنگ باز، داستان گو ہوتا۔ بزرگوں کے زمانے کی ایک بیاض ہوتی جس پر خاندان ہی کے کسی اگلے پچھلے سربرآوردہ شاعر کا کلام محفوظ ہوتا، جسے صاحب خانہ گھر پر مجلس منعقد کر کے بڑے فخر سے اور فن کے جملہ آداب ملحوظ رکھ کر سُناتا۔ اس کلام کو نسلاً بعد نسلٍ گھر کا کوئی کاتب بیاض پر خوش خط نقل کرتا۔ اس بیاض میں جہاں تہاں کچھ مجرب دوائیں اور دعائیں، افرادِ خاندان کی شادی، ولادت، وفات وغیرہ کی تاریخیں، مہاجن کے قرض اور سود سے متعلق یادداشت بھی درج ہوتی!

....

میری طالب علمی کے زمانے میں سربرآوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر ان ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ان کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ چھوٹوں سے شفقت اور عزت سے پیش آنے کا جو انداز میں نے اس زمانے کے بزرگوں میں پایا اب وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعرا کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اس خوبی سے سُناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کا اندازِ شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اتنی مکمل اور دل نشیں ہوتی کہ آج اچھے اچھے فن کاروں اور معلموں میں نہیں نظر آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔

شعر سننے سے زیادہ ان کی زبان اور انداز سے شعر کا "اظہار و ابلاغ" دل کش معلوم ہوتا تھا۔ ایک شعر اب تک یاد ہے:

بعد مرنے کے گناہوں سے سبک باری ہے
پھول اٹھاتے ہیں، جنازے کے اُٹھانے والے

شعر پُرانے انداز کا ہے لیکن پڑھنے والے نے شانوں کو خفیف سی جنبش اور ہاتھوں کو ہلکی سی تکان دے کر ثانی مصرع کو کچھ اس طرح پڑھا اور ادا کیا کہ واقعی ایسا معلوم ہونے لگا جیسے پھول اور جنازہ اُٹھانے میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا! اب خیال آتا ہے جیسے یہ لوگ شعر ہی نہیں پڑھتے تھے بلکہ اسے کر دکھانے میں فنونِ لطیفہ کی جتنی اقسام ہیں سب برتتے تھے اور کس سلیقے سے برتتے تھے!

لکھنؤ، فیض آباد، پٹنہ یا الہ آباد میں معرکے کا کوئی مشاعرہ یا مرثیہ خوانی کی مجلس منعقد ہوتی تو جون پور کے لوگ کثرت سے شریک ہوتے۔ واپس آ کر پبلک لائبریری کے برآمدے میں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، جلسے کی کارروائی پر نقد و تبصرہ ہوتا۔ اس نشست کی حیثیت ایک طور پر آج کل کے سمپوزیم[1] (Symposium) کی ہوتی۔ پوری پوری غزلیں اور مرثیے ازبر ہوتے اور اسی انداز سے سنائے جاتے جس سے سُنے گئے تھے اور پڑھنے والوں کو داد اس طرح سے دی جاتی تھی جیسی شاید خود مصنف کو نہ دی گئی ہوگی۔ ایک صاحب نے غالباً صفی صاحب کا ایک شعر اس لطف سے سُنایا تھا کہ حاضرین دیر تک جھومتے رہے اور ایک بزرگ نے جو بڑے سنجیدہ اور سن رسیدہ تھے بہ آواز بلند ان الفاظ میں داد دی تھی ''میاں، جزاک اللہ آدھا شعر تمھارا ہو گیا۔'' پڑھنے والے نے اس داد کی پذیرائی جس فخر اور مسرّت سے کی اس سے کچھ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے صفی صاحب بقیہ مصرع کی ملکیت سے بھی محروم ہو گئے! شعر یہ تھا:

کچھ نہ کچھ گورِ غریباں پر بھی ساماں ہو گیا
چار تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا

طالب علمی کے زمانے میں میرا اول پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جا سکتا، اس کتب خانے میں جو دوسری منزل پر واقع تھا۔ کھڑکی سے متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ یہاں سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ پُل کے طاقوں سے الغاروں مٹیالے پانی کا اینڈتے، بپھرتے، گونجتے، غرّاتے گزرنا اور پُل کا اس طغیان و ہیجان سے یکسر بے خبر و بے پروا ہونا کہ دریا کی دوسری

[1] سمپوزیم (Symposium) فلسفیانہ مذاکرہ، کسی قسم کا مذاکرہ یا مباحثہ جو ایک ہی موضوع سے متعلق ہو۔

طرف نزدیک ہی قلعہ کی سنگین فصیل، دیو پیکر پشتی بانوں سے مستحکم جن پر کہن سال تناور درخت اور کنٹیلی گنجان جھاڑیاں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی سیلاب کے تیز و تند دھارے سے اپنے ہمدم دیرینہ پُل کی طرح بے نیاز، پورب کی برسات کا ہر چہار طرف تسلّط، سُرمئی مٹیلے بادلوں کے غلاف کئی کئی دن تک سورج کی روشنی کا راستہ بند رکھتے۔ یہ بادل طرح طرح سے اُمڈتے منڈلاتے رہتے ہیں، کہیں تہ بہ تہ اکٹھا ہو کر ہوا کے جھکّو میں ایک دوسرے کو روندنے پھاندنے لگتے۔ کبھی ان کے گونجنے گرجنے کی آواز اس طرح سنائی دیتی جیسے غیب کی آواز دور اور قریب سے یکساں سنائی دے اور قضا و قدر کا کوئی اندوہ ناک فیصلہ نافذ ہونے والا ہو، تاریکی اور تہلکے کی اس گیر و دار میں پُل کی سنگین حصار اور قلعہ کی فصیل اور پشتی بان ایسے معلوم ہوتے جیسے بے ڈول بادلوں کے بڑے بڑے تودے بغیر کسی ارادے یا منصوبے کے ایک دوسرے پر ڈھیر کر دیے گئے ہوں۔

شکستہ تاریخی عمارات آثار قدیمہ اور کھنڈر دیکھ کر میں بہت متاثر ہوتا ہوں، جیسے ان کے آگے جھکنے اور گلے لگانے کو دل چاہتا ہو۔ ذہن ان کی گذشتہ شان و شوکت اور عروج و زوال کے طرح طرح نقشے بنانا اور بُننا شروع کرتا ہے۔ پھر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ اپنی ویران اور سنسان اوقات گزاری میں میری موجودگی اور غم خواری سے تسکین پاتے ہوں!

اس عمر، زمانے، ماحول و معاشرت میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لطف آیا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے ان افسانوں اور ناولوں کا میں ہی مصنف تھا، میں ہی ماحول اور میں ہی ہیرو! لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پُل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پُل کے اوپر چلتی ہوئی مخلوق اور فضا کا نم ناک رست خیز رک جائے گا!

ان کتابوں اور مصنفین کے نام گنانے سے کچھ حاصل نہیں اور خطرے سے بھی خالی نہیں، اس لیے کہ اندیشہ ہے کہیں ایسی کتابوں کے نام نہ لینے لگوں جو میں نے نہیں دوسروں نے پڑھی ہوں!

مجھے ہر طرح کی چیز پڑھنے میں لطف آتا تھا البتہ یہاں ایک بات کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ اس لیے کہ اس پر آج بھی مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا آج سے چالیس پینتالیس سال

پہنچے تھے وہ یہ کہ اس زمانے میں بھی جب مجھے اردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی۔ میں زبان وادب کے اعتبار سے انگریزی کو اردو سے اونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے مصنف جو کچھ کہہ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے اور میرا بہی خواہ ہے۔ اردو کتابوں کی عبارت کا اکثر یہ اثر ہوتا جیسے مصنف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہو کوئی مجھے فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈمڈ ہو کر ذہن میں آتیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی رہا ہو کہ ذہنوں پر انگریز، انگریزی حکومت اور انگریزی زبان کی گرفت عام تھی۔ غرض یہ تعبیر صحیح رہی ہو یا غلط، مجھے انگریزی کے مطالعے سے فائدہ پہنچا۔ انگریزوں سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا لیکن انگریزی زبان وادب سے اب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔ علوم وفنون کے بے پایاں ذخائر سے قطع نظر جو انگریزی میں ملتے ہیں اور اردو میں ''برائے نام'' سے بھی کم ہیں! ابھی اردو کو انگریزی سے بہت کچھ سیکھنا ہے!

بیسویں صدی کے پہلے 25-30 سال تک جتنے طالب علم انگریزی اسکول کے اونچے درجوں میں ہوتے، ان میں بیش تر انگریزی بولنے کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ایسی استعداد جو آج کل کے بی۔ اے کے طلبا میں نہیں ملتی۔ ان میں جہاں تک مسلمان طلبا کا تعلق ہے اس کا سبب یہ تھا کہ عربی، فارسی، اردو وہ گھر سے پڑھ کر آتے تھے۔ ایک زبان پر عبور ہو تو دوسری زبان کا سیکھ لینا آسان ہوتا ہے، اس لیے انگریزی میں وہ آسانی سے مہارت پیدا کر لیتے اور یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ انگریزی سیکھنا مسلمانوں کے لیے روزی کمانے، بالفاظ دیگر سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ تھا۔ کچھ دنوں بعد عربی اور فارسی سے توجہ ہٹ گئی۔ اب انگریزی سے بھی کچھ ایسا لگاؤ نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہے آج کل کے طلبہ کلاسکس (Classics) سے تقریباً بیگانہ ہو گئے ہیں۔ موجودہ طلبہ قدیم طلبہ سے معلومات عامہ، حالات حاضرہ اور واقعات عالم سے یقیناً زیادہ واقف ہوتے ہیں اور اپنے پیش رووں سے کہیں زیادہ جلد اور ہر طرح کے کاموں میں ہمت آزمائی یا قسمت آزمائی کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ مسابقت کا مطالبہ اب اتنا تیز وتند ہے کہ ٹھہرنے اور سوچنے کی فرصت نہیں ملتی، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ کلاسکس (Classics) کی گراں مائیگی سے ذوق وظرف کو جو

وزن وقار، اور زندگی کی جوتب وتاب یا خوبی وخوب صورتی منتی تھی اس سے ہمارے نوجوان محروم ہو گئے۔ اس بحث کو غلط مبحث تک پہنچا دینے کے لیے یہ بھی کہوں گا کہ مذہب واخلاق کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ میں مذہب واخلاق کو افکار واعمال میں وہی درجہ دیتا ہوں جو کلاسکس (Classics) کو شعر وادب میں!

جنگ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں پندرہ ویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گزرتا، ستھرا، شریفانہ اور پروقار جلوس، نہ پولیس کا انتظام نہ ایسا کوئی ازدحام، ہزار پانچ سو آدمیوں کا مجمع ہوتا۔ تخمیناً ایک میل فاصلہ آہستہ آہستہ طے کرتا پھر منتشر ہو جاتا، ''زندہ باد''، ''مردہ باد'' کے نعرے، نہ دند پکار، نہ کہیں راستہ بند ہوتا نہ لوٹ مار، آتش زنی یا آبروریزی ہوتی۔ معلوم نہیں ترانہ کون پڑھتا ساتھ بھی دیتے۔ پڑھنے کا انداز اتنا موثر اور پُر وقار ہوتا کہ رگ وپے میں بجلیاں کوندتی معلوم ہوتیں۔ ہندو مسلمان، مرد عورت، بوڑھے بچے، سب غور واحترام سے سنتے۔ تھوڑی دیر کے لیے کاروبار کا ہمہمہ تھم جاتا۔ جلوس گزرتا تو لوگوں کی زبان پر ترکوں کی بہادری اور یورپین طاقتوں کی ظلم وزیادتی کا چرچا ہوتا۔ اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ گو یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم:

''خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا''

ایک صاحب نے بڑے پراثر لہجے وانداز سے سنائی تھی۔ محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ بھی ہو گئے تھے اور ''رہے نام اللہ کا'' کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی سے برہم ہو گئی۔

جس عہد کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں معمولی درجے کا بھی کوئی مسلمان گھرانا ایسا نہ تھا جہاں سو پچاس کتابیں یا رسائل، قصے کہانیاں، شعر وشاعری، مسئلے مسائل، مذہب وتصوف اور وظائف کی موجود نہ ہوں اور گھر کے چھوٹے بڑے کی نظروں سے نہ گزرتی ہوں۔ میری ایک یہ عادت ہے کہ اردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو، میں اسے اٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا، اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے، اس لیے کہ میں اردو کی ہر چھپی

ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جارہی ہو، بلکہ تصویر دیکھی جارہی ہو!

ان متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی دل چسپ یا بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے جس طرح کس مپرس، فاقہ کش اور فلاکت زدہ بچے، عورتیں اور بوڑھے کوڑے کرکٹ کی ڈھیریاں چھانتے پھرتے ہیں اور اپنے کام کی کوئی نہ کوئی چیز اس میں سے نکال لیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ضروریات کی بنا پر ایسا کرتے ہیں، میں عادتاً یا تفریحاً۔ اردو میں لکھنے کے اتنے انداز، اتنے فقرے، ترکیبیں، لب و لہجے اور پینترے ہیں کہ کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں محظوظ یا منغص ہونا لازمی ہے۔ موضوع، سیاست، قومیت، انقلاب، امراض، ادویات، عورت یا عقبا جو کچھ ہو کوئی نہ کوئی فقرہ گفتنی یا ناگفتنی ضرور مل جائے گا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اردو میں ہر طرح کی شاعری کا کاروبار مدت الایام سے بڑی کثرت سے رہا ہے۔ وہ بھی گرم ملک کی شاعری کا، اس لیے اردو لکھتے وقت اعصاب کا تناؤ یا خون کا دباؤ اکثر اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے اور لکھنے والا بھلا چنگا بہکنے لگتا ہے۔

اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پا جاتی تھی۔ یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور اسلوب تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے۔ تعجب ہے شاہ صاحب کا نام اردو کے ممتاز لکھنے والوں میں کیوں نہیں لیا جاتا۔ شاہ صاحب شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب عبدالمجید صاحب رئیس اعظم جون پور کے داماد تھے لیکن تعلقات خوش گوار نہیں تھے۔ کبھی کبھی نواب صاحب پر بڑے خوب صورت طنزیہ فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے۔ سرخ و سپید رنگت، بلند قامت، متناسب الاعضا، خوبرو، خوش گفتار، نگاہ نیچی رکھتے تھے۔ گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں مسحور کن انداز سے کھلنے بند ہونے لگتیں، جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو! بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقرے، جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب و لہجے کی سنجیدگی سے مل کر ادا ہونے لگتے جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل و ترنم میں فرق آجاتا ہو۔

انگریز، انگریزی حکومت اور یورپین سیاست سے بیزار تھے۔ اس لیے حکومت کی بارگاہ میں شبہے کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سیاست پر ان کا مطالعہ اتنا گہرا تھا کہ گفتگو کرنے میں بے اختیار تاریخی اور دستاویزی حوالے دیتے جاتے۔ طالب علموں پر بڑے مہربان تھے۔ برابر والوں سے اخلاص واحترام سے ملتے تھے۔ کبھی کبھی ہم سب کو دیکھنے بورڈنگ ہاؤس آجاتے۔ جب تک رہتے ان کے گرد طالب علموں کا جمگھٹا رہتا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی ادبی یا سیاسی مسئلے پر انہماک سے اپنے خاص انداز میں گفتگو کرتے۔ مدتوں بعد جب میں اسکول چھوڑ کر کالج آگیا تھا اور نظم ونثر کے حسن وقبح کو پہچاننے کی شُد بُد ہوگئی تھی۔ شاہ صاحب کی نثر کو میں اتنی ہی دل آویز، پرمغز اور فکر انگیز پاتا جتنا کسی دوسرے سر برآوردہ نثر نگار کی نثر کو۔ کپڑے بڑے سادہ لیکن صاف ستھرے پہنتے تھے۔ میں نے کبھی رفتار، گفتار، کردار میں ان کو بے جھجک نہ پایا۔ اکثر سوچ میں رہتے لیکن مخاطب کیجیے تو فی الفور متبسم ہو کر متوجہ ہو جاتے اور پھر کوئی نہ کہہ سکتا کہ اس سے پہلے استغراق میں تھے۔ آج ان سطور کو لکھتے وقت مرحوم بے اختیار یاد آگئے، جیسے وہ پاس آکر گفتگو کرنے لگے ہوں۔ وہی انداز، وہی باتیں اور وہی ماحول۔

لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ میرا دل کرکٹ، ہاکی، فٹ بال میں لگتا تھا۔ میں دراصل علی گڑھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آیا تھا جتنا علی گڑھ کے کھیل، نیز اس کی عام وقعت و وقار کا چرچا سن کر۔ ان کھیلوں میں علی گڑھ نے مجھے قابل اعتنا سمجھا تو میں نے ٹینس کی طرف رخ کیا اور کالج کے اس عہد کے معیار کے مطابق اوسط درجے کے کھلاڑیوں میں نیاز مند نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ کھیل ہی کا تصرف تھا کہ مجھ میں جو اچھی صلاحیتیں تھیں وہ برگ و بار لائیں جو کمزوریاں تھیں وہ ختم ہوگئیں ابھرنے بھی نہیں پائیں۔

اچھا کھلاڑی عموماً معقول آدمی ہوتا ہے گو یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض نامور کھلاڑی خفیف الحرکات بھی پائے گئے ہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ کھلاڑی اکثر قابل اعتبار ہوتا ہے، بالخصوص کرکٹ کھلاڑی! انگریز چاہے جیسے رہے ہوں، ان کے ہاں کھیل کا جو احترام ملتا ہے اس کی میری نظر میں بڑی وقعت ہے۔ انگریز معاملے کی صفائی کو کرکٹ کے کھیل سے تعبیر کرے گا اور جب کبھی اس میں فتور پائے گا کہہ دے گا کہ "یہ کرکٹ نہیں ہے" جس طرح ہم کبھی کہتے تھے

''یہ مسلمان کا شیوہ نہیں!'' کھیل کی ایسی حرمت شاید ہی کسی اور قوم میں ملتی ہو!

....

بے محل نہ ہوگا اگر میں اس کا تذکرہ بھی کردوں کہ ہائی اسکول سے پہلے کی میری تعلیم کیا اور کیسی تھی۔ جیسا کہ اس زمانے کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور ہے، میں نے بھی قاعدہ بغدادی، کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اس عہد سے بھی پرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اسی طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے مضحکہ خیز اردو میں پڑھائیں۔ اسی دوران میں ایک اور مولوی صاحب سے چند رسالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اس طرح کا بن گیا تھا کہ جس طرح کے مولوی ہوں اسی طرح کی پڑھائی ہو، یعنی مولوی صاحب قرآن شریف پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں، فارسی پڑھا سکتے ہوں تو فارسی، عربی جانتے ہوں تو عربی، صرف مسئلے مسائل سکھانے بتانے پر اکتفا کرتے ہوں تو وہی سہی، مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب کی پرورش ہو، گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور محلے والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو!

ان مضامین اور اس طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو، پہاڑے، حساب وغیرہ سیکھنے کے لیے دیہات کے پرائمری (Primary) سے بھی پرائمری اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ جس پر پرائمری سے زیادہ ''پری مٹو'' (Primitive) ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس بات پر اکثر ہنسی آئی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لیے وجہ معاش قرار پائی یعنی اردو وہ میں نے اسکول میں سیکھی ایسے ماسٹر صاحب سے جو اردو میں صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے اور جو اتنے ہی کٹر برہمن تھے جتنے شریف النفس اور دردمند انسان۔ کوئی کلاس سامنے ہو، وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن، لوٹا ڈوری گھر سے ساتھ لاتے، راستے میں کسی متبرک کنویں سے پانی بھر لیتے اور صبح اسکول پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی کرسی کو غسل دے دیتے۔ پانی تھر جاتا تو کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور اس کی احتیاط رکھتے کہ پاؤں کے تلووں کے سوا جسم کا کوئی اور حصہ کرسی کو نہ چھو جائے۔ موٹی مضبوط کھردری رسی سے مرصع و مستحکم کم و بیش چھ انچ اونچی کھڑانو پہنتے تھے۔ اسی کھڑانو پر وہ چار پانچ میل کا روزانہ سفر کر کے اپنے گاؤں سے اسکول آجاتے تھے۔ اسکول پہنچنے پر

دس پندرہ منٹ تک ان سانپ بچھو اور مینڈکیوں اور کبھی کبھی ایک آدھ خرگوش کی اچانک رحلت پر تعزیت کے ریزولیوشن (Resolution) پاس کرتے جو ہر روز کھیتوں پگڈنڈیوں پر ان کے گھڑانو یا ٹرک (Truck) کے تلے آ کر آنجہانی ہو جاتے! وہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ لطف نہ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ میں نے ان کو کسی طالب علم کے قلم، پنسل، کاپی، تختی کو چھوتے نہ دیکھا۔ ان پر جو کچھ لکھا یا بنا ہوتا دور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے، نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سنتے۔ صرف رمائن سناتے۔ نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے، نہ کسی شخص یا شے کو ہاتھ لگاتے۔ دور سے ترس کھاتے مسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے!

اچھے معلم کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا علم متعدی ہو یعنی طالب علم کو از کر لگے اور ایسا معلم ناکارہ قرار دیا گیا ہے جس کا علم اسی تک محدود رہے۔ معلوم نہیں ماسٹر صاحب اس نکتے سے واقف تھے یا نہیں لیکن ان کا عقیدہ کچھ اس طرح کا ضرور تھا کہ چھوت چھات کے اصول پر پڑھے لکھے طالب علم کا علم اس کے ساتھیوں کو جا لگے گا۔ اس لیے وہ خود پڑھانے لکھانے کا دھندا نہ کرتے۔ معلوم نہیں وہ ایسا کر بھی سکتے تھے یا نہیں اور یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ خود ماسٹر صاحب کلاس میں اس طرح کی علمی یا تعلیمی چھوت چھات سے بہرہ مندہ ہوئے یا نہیں۔ بہر حال کلاس میں ہوتا یہی رہا کہ پڑھے لکھے طالب علم ان پڑھ ساتھیوں کو اسکول کا کام بڑی خوش اسلوبی سے کرا دیتے تھے اور ان معلم طالب علموں کا اثر و اقتدار فرداً فرداً ہر ساتھی طالب علم پر ماسٹر صاحب کے اثر و اقتدار سے زیادہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ کلاس کے نیک نہاد اور ذی استعداد طلبہ کا اثر اپنے ساتھیوں پر کلاس ٹیچر (Class Teacher) سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہر جماعت میں شریر اور بے راہ طالب علم بھی ہوتے ہیں جن پر مدرس کا پورا قابو نہیں ہوتا لیکن یہی طالب علم کلاس کے متذکرہ صدر صفات کے طالب علم کا احترام کرتے ہیں۔ وقت آنے پر پڑھائی میں ان سے مدد لیں گے اور کیسے ہی بیزار یا برافروختہ کیوں نہ ہوں ان کا کہنا مان لیں گے۔ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم و تربیت کے معاملے میں ماہرین تعلیم کو چاہیے کہ کسی نہ کسی حد تک ہر کلاس کے اچھے طلبہ سے مدد لینے پر زور دیں۔ طالب علم پر بھروسا کرنا قرین فطرت ہے۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب چھ فٹ سے اونچے قد کے بڑے کڑوے کڑیل ٹھاکر تھے۔ پڑھانے لکھانے سے ان کو بھی دل چسپی نہ تھی۔ زیادہ وقت لکڑی پھاڑتے اور رسوئی بناتے رہتے۔ تھوڑی (مکرر لکھتے) تھوڑی دیر بعد رسوئی سے باہر آتے، سانس پھولا، چہرہ تمتمایا، آنکھیں انگاراسی دہکتی ہوئی، ایک ہاتھ میں نیم سوختہ چیلا ہوتا، دوسرے میں کلہاڑی، وسط اسکول میں پہنچ کر نعرہ لگاتے ''مہاراج پاٹھ پرساد بند، لکھائی پڑھائی کرو'' ہیڈ ماسٹر صاحب اور ان کی آواز سے چھوٹے بچوں کا سہم جانا تو سمجھ میں آتا ہے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ماسٹر صاحب سب سے زیادہ ڈرتے تھے۔ نعرہ سن کر بیٹھے بیٹھے کرسی پر کھڑے ہو جانے کی کوشش کرتے خیال آنے پر اُتر پڑتے اور ننگے پاؤں اٹینشن (Attention) ہو جاتے۔ کھڑانو پر کبھی نہ کھڑے ہوتے اس خدشے سے کہ کھڑانو اور کرسی پر کھڑا ہونا شاید یکساں بلندی تک پہنچ جاتا تھا، جو یقیناً گستاخی کا مترادف تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی گرج سن کر اور چیلے کلہاڑی سے مسلح دیکھ کر سارا اسکول ایک زبان ہو کر جو دل میں آتا چیخ چیخ کر پڑھنے لگتا، جس میں ماسٹر صاحب کی آواز سب سے اونچی ہوتی اور پہچانی جاتی، اس لیے کہ ساری بامعنی آوازوں میں وہی ایک آواز بے معنی ہوتی!

اس زمانے میں تقریباً تمام پوربی اضلاع میں سال کے زیادہ حصے میں طاعون پھیلتا رہتا۔ ان مواقع پر ہمارا اسکول پاس ہی کے ایک مندر میں منتقل ہو جاتا۔ میں نے اتنا وسیع اور شان دار مندر بڑی بڑی بستیوں میں بھی کم دیکھا ہے۔ ایک وسیع مربع قطعہ کے چار گوشوں پر یکساں شکل اور سائز کے چار مندر تھے۔ ان کے وسط میں سب سے بڑا مندر تھا۔ طویل برآمدوں کے ذریعے ان سب کو ایک دوسرے سے ملا دیا گیا تھا۔ طرح طرح کی چھوٹی بڑی مورتیاں جا بجا رکھی ہوئی تھیں۔ بعض نہایت خوب صورت بعض ڈراؤنی۔ ہم دو تین لڑکے مسلمان تھے، جو مورتیاں برآمدے اور صحن میں تھیں ان کو چھونے کی ہم کو اجازت تھی۔ ہم سب یعنی ہندو مسلمان دونوں اس پر خوش تھے کہ مورتیوں کو چھونے کا منصب ہم کو حاصل تھا۔ ماسٹر صاحب کو نہ چھو سکتے نہ سہی۔ ماسٹر صاحب تو ہمارے ہی جیسے گھریلو قسم کے لوگوں میں تھے۔ ان کا تو نہ چھونا ہی افضل تھا۔ چھونے سے معلوم نہیں ہم پر کیا مصیبت نازل ہو یا ماسٹر صاحب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں ممکن ہے اس پاداش میں ہماری خبر والدین لیں اور ماسٹر صاحب کی ہیڈ ماسٹر صاحب۔

اسکول مندر میں آجاتا تو جیسے ماسٹر صاحب کی عید آجاتی! ہمہ تن بھجن، رامائن، اشنان، آرتی اور پوجا پاٹھ کا اہتمام رہتا۔ آس پاس کے مرد عورت بچے بھی آجاتے، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی میلا لگا ہوا ہے اور یہ سب اس لیے اور بھی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب خود مدرسہ چھوڑ کر نہ آتے تھے۔ ان کو جیسے اس کا یقین ہوا اور ان کو نہ ہو تو مجھے اور ماسٹر صاحب کو تھا کہ خود طاعون ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیم سوختہ چیلے اور کھاڑی سے ڈرتا تھا۔

ہر لڑکا مندر ہی کے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔ مندر سے متصل گیندے اور کنیر کے پھولوں کا بہت بڑا قطعہ تھا۔ پھول توڑنے اور چڑھانے میں دوسرے بچوں کی طرح مجھے بھی کسی قدر دل چسپی تھی۔ ان پھولوں کی بو عام طور پر لوگ پسند نہیں کرتے۔ مجھے پسند ہے۔ کہتے ہیں پھول کی خوشبو سے جوانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کنیر اور گیندے کے علاوہ ایسے پھول ہیں جن کی خوشبو سے مجھے اپنی ہی نہیں بعض دوسروں کی جوانی بھی یاد آجاتی ہے، لیکن کنیر اور گیندے کی بو مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس سے مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ جوانی کی ''ملوث'' یاد سے طفلی کی ''معصوم'' یاد میرے نزدیک زیادہ قابلِ قدر ہے۔ تعجب ہے کہ مسلمان بچوں کے ساتھ شوالے کے اندر مختلف سلوک کیوں نہیں کیا جاتا تھا۔ ممکن ہے اس وقت کے لوگ جو آج کل کے لوگوں سے یقیناً زیادہ مذہبی تھے اسکول میں یا اسکول سے قطع نظر بچوں پر مذہبی ٹھپا لگانا روا نہ رکھتے ہوں۔

ماسٹر صاحب رامائن بڑے والہانہ انداز سے پڑھتے اور اس کا مطلب اتنی ہی نرمی اور محبت سے اپنی زبان میں جو ٹھیٹھ پوربی سے بھی زیادہ ٹھیٹھ کوئی چیز ہوتی سمجھاتے۔ حاضرین جن میں دیہاتی مرد، عورت، بچے ہوتے زمین پر ہاتھ جوڑے اس طرح اُکڑوں بیٹھے ہوتے جیسے اس زمانے کے تھانے داروں کے سامنے مستغیث اور ملزم دونوں روزنامچے میں پولیس کا بیان اپنی زبان میں لکھاتے ہوتے۔ اس طور پر رامائن کی پوری داستان مجھے یاد ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے دسہرے کی تقریب کا بڑے شوق سے انتظار کیا کرتا تھا۔ رامائن کا قصہ، شوالے کی فضا اور اس کی ایک خاص مہک، کنیر اور گیندے کے پیلے پھول، بچوں کا ہر مذہب یا پڑھائی لکھائی سے بے نیاز و بے خبر ہو کر محض دل چسپ مصروفیت کا دلدادہ ہونا میرے رگ و پے میں پیوست ہو گیا جس کا

تصرف اب تک محسوس کرتا ہوں۔ داستان طویل اور مزے دار ہے۔ بچپن کی داستان کس کی اس طرح کی نہیں ہوتی۔

دیہات اور شوالے کی فضا میں جو ابتدائی تعلیم میسر آئی اس نے ذہن و دماغ کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ طنز وظرافت باوجود مدت العمر کے ادبی مشغلہ ہونے کے آج تک اس کا اتفاق نہ ہوا کہ طنز وظرافت کا کوئی فقرہ ہندو معتقدات کے بارے میں زبان یا قلم سے نکل جائے۔ علی گڑھ آیا تو اس پر مزید مہر لگ گئی اور شاید یہ دونوں کا تصرف تھا کہ حتی الوسع میں نے کسی مذہب پر نہ تو کبھی نکتہ چینی کی، نہ اس کا مذاق اڑایا۔

دیہات مندر اور مکتب کی تعلیم کے علاوہ انگریزی اسکول میں داخلہ لینے سے قبل جن مواقع، مقامات اور مردان کارآگاہ سے میرا سابقہ رہا شاید ہی کسی اور کا رہا ہو۔ بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی، چنانچہ والدین کو جہاں کسی ''تیر بہ ہدف'' قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بوڑھیاں، ملا یا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کردی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پیے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہوگی، جتنی میں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے انار کے درختوں میں کسی کے لیے اتنے نقوش سلیمانی نہ ٹھونکے گئے ہوں گے، جتنے میرے لیے۔

....

1915ء میں یہاں فرسٹ ایر (Frist Year) میں داخل ہوا جب سے آج تک کم وبیش چالیس پیالس سال ان تمام چھوٹے بڑے انقلابات سے دوچار رہا جو علی گڑھ میں یا اس سے باہر، دور نزدیک پیش آتے رہے۔ علی گڑھ کو زیادہ مجھے کم، بہت کم! خیال کیا جاتا ہے کہ پچھلے پچاس سال میں جیسے شدید اور عالم گیر تہلکے یکے بعد دیگرے برپا ہوئے اور جنھوں نے ہمارے ذہن اور زندگی کو جس سفاکی سے زیر وزبر کیا اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ انسان اور انسانیت کو فکر وعمل کے احتساب کے لیے ایسی مہیب اور مہتم بالشان آزمائشوں سے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد اپنی حیثیت منوانے اور تفوق جتانے کا جذبہ ہر فرقے اور ہر صوبے میں ابھرا۔ انگریزی حکومت کے استحکام کے ساتھ یہ اختلافات دبے رہے، مٹے نہیں۔ مذکورہ حکومت کے جانے کے دن آئے تو ان اختلافات نے زور پکڑا اور پھر جو کچھ پیش آیا وہ چھپا نہیں ہے!

علی گڑھ آیا تو پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی قطع نظر اس سے کہ اس جنگ کے اسباب کیا تھے اور اس کا اثر تمام دنیا پر کیا پڑا۔ یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اس سے پہلے مسلمان حکومتیں دول یورپ کی ریشہ دوانی اور دراز دستی کی زد میں آ چکی تھیں۔ دراصل یہ آویزش صلیبی جنگوں سے شروع ہو کر پہلی جنگ عظیم پر ختم ہوئی تھی، گو فتنہ سامانی کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں اب تک جاری ہے۔ اس دوران میں مشہد مقدس پر روسیوں کی گولہ باری بلقان اور طرابلس کے محاربے، ترکوں کے خلاف ہندوستانی افواج کا سرزمین عرب پر اتارا جانا، قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا تسلط، یہ تمام واقعات مسلمانان ہند کو نہایت درجہ مایوس و مضطرب کرنے کے علاوہ یورپین حکومتوں سے بالعموم اور انگریزوں سے بالخصوص بیزار و برہم کرنے میں معاون ہوئے جس میں شبلی، محمد علی، ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد کی شعلہ نوائیوں کو بھی بڑا دخل ہے!

اس صورت حال کی طرف شبلی نے اشارہ کیا ہے مثلاً:

کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک!

یا اقبال نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو

یا:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ
مل رہا ہے خاک و خوں میں ترکمانِ سخت کوش

دوسری طرف ان حادثات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو براہ راست مسلمانوں کو ہندوستان میں پیش آئے۔ غدر سے انیسویں صدی کے اختتام (سرسید کی وفات) تک سرسید

مسلمانوں کے یکہ وتنہا یاور وناصر رہے۔ان کی زندگی کا یہ دور تمام تر مسلمانوں کی آبادکاری اور ان کے مفاد ومقاصد کی ترجمانی اور تحفظ پر مشتمل رہا۔وہ ایک طرف انگریز مصنفین کی ظلم وزیادتی سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے میں اپنی بہترین بے پایاں صلاحیتیں صرف کررہے تھے،دوسری طرف ابنائے وطن تھے جو سیاسی برتری کے لیے ہر طرح کی جدوجہد میں منہمک تھے،کم وبیش تیس سال تک سرسید اسی طرح کی مصیبتوں اور نزاکتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔1875ء میں کالج کی بنیاد پڑی اور 1885ء میں کانگریس کی ابتدا ہوئی۔1906ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی۔اسی زمانے میں بنگال تقسیم ہوا جس نے ہندو بنگال کو سخت مشتعل کردیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ 1911ء میں تقسیم کی تنسیخ عمل میں آئی۔یہ پہلا اور بہت بڑا سیاسی دھچکا تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے۔

1918ء میں مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا۔اسی دوران میں مسلم یونی ورسٹی کی تحریک بروئے کار آئی اور ہزہائی نس آغا خاں[1] اور شوکت علی خاں[2] کی قیادت میں اس کا غلغلہ تمام ہندوستان میں بلند ہوا۔الحاق اور عدم الحاق اور مسلم یونی ورسٹی یا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا شاخسانہ اٹھ کھڑا ہونے سے یہ پوری اسکیم (scheme) معرضِ التوا میں پڑگئی اور سارا جوش مایوسی میں تبدیل ہوگیا۔

1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔1915ء میں محمد علی شوکت کی نظر بندی عمل میں آئی جو مذکورہ جنگ عظیم کے ساتھ 1919ء میں ختم ہوئی۔اس کے بعد ہی تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔مہاتما گاندھی اور علی برادران کی سربراہی میں اس تحریک کو ہندوؤں سے زبردست تائید ملی۔یہ ایک بہت بڑا سبب تھا تحریک ترک موالات میں مسلمانوں کے سرگرمی اور خلوص سے شریک ہونے کا۔ہندو مسلم اخلاص واتفاق کا اس سے بہتر زمانہ آج تک پھر دیکھنے میں نہ آیا!

---

[1] آغا خاں سلطان محمد شاہ (1875ء۔1957ء) اسماعیلی فرقہ کے سربراہ علی گڑھ تحریک کے سرگرم رکن، یونی ورسٹی کی مالی امداد میں پیش پیش رہے۔یونی ورسٹی کا درجہ دلانے میں اُن کی کوششوں کو دخل تھا۔1906ء کے شملہ ڈیپوٹیشن کی سربراہی کی۔آغا خاں ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور صحیح معنوں میں لبرل تھے۔

[2] مولانا شوکت علی (1873ء۔1938ء) مجاہد آزادی، صحافی، علی گڑھ کے اولڈ بوائے مولانا محمد علی کے بڑے بھائی۔

ہندوستانی افواج کو انگریزی حکومت سے علاحدگی کی ترغیب دینے پر مولانا محمد علی پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا اور سزا ہوئی۔ انگریزی حکومت سے کھلم کھلا ٹکر لینے کی جو مثال مولانا محمد علی نے پیش کی تھی اور جس بے باکی اور قابلیت سے انھوں نے عدالت میں مسلمانوں کی پوزیشن واضح کی تھی اس کی مثال بیسویں صدی کی تاریخ آزادی میں اس وقت تک نہیں ملتی۔ 1924ء میں ترکوں نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کردیا جس سے ہندوستانی مسلمان نہایت دل گرفتہ ہوئے۔ کچھ دنوں بعد نہرو رپورٹ شائع ہوئی، اس سے مسلمان اور زیادہ مایوس ہوئے۔ باہر کا رشتہ اس طرح ٹوٹا، اندر کی امیدیں یوں پامال ہوئیں! ترک موالات کی بنا پر لیڈروں کو جیل خانے بھیج دیا گیا تو ملک کی رجعت پسند قوتوں کو ابھرنے کا موقع ملا اور شدھی سنگھٹن نے زور پکڑا۔ اس وقت ہندوستان میں ایسا کوئی مخلص اور سربرآوردہ لیڈر جیل سے باہر نہ تھا جو اس تحریک کا انسداد کرتا چنانچہ جو ہندو مسلم اتحاد ترک موالات کے زمانے میں بروے کار آیا تھا وہ تقریباً ہمیشہ کے لیے نابود ہوگیا۔

1921ء میں کالج میں ترک موالات کا بڑا کاری حملہ ہوا تھا۔ یہاں کے اکثر مخلص اور ہونہار طلبہ نے ادارے کو خیر باد کہا اور مولانا محمود حسن صاحب اور حکیم محمد اجمل خاں کے ہاتھوں جامعہ ملیہ کی تاسیس کا اعلان علی گڑھ کی جامع مسجد میں ہوا، ایک طور پر علی گڑھ کے حریف کی حیثیت سے۔ اس کے بعد ہی جامعہ کے توڑ پر مسلم یونی ورسٹی قبول کر لی گئی، ان تمام پابندیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ جو حکومت نے اس پر عائد کردی تھیں اور کچھ ہی دن پہلے عام مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہ تھیں۔

جامعہ اور مسلم یونی ورسٹی دونوں کا اپنے اپنے اختیار کیے راستوں پر آگے بڑھنے کا زمانہ ایک ہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زبردست دشواریوں کے باوجود قوم اور ملک میں جامعہ نے اپنی ساکھ قائم کی اور مسلم یونی ورسٹی نے سہولتوں کے ہوتے ہوئے اپنی ساکھ کھوئی۔ گو یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ دونوں کا ایک سطح پر موازنہ قرین انصاف نہ ہوگا۔ کارگزاری اور کارکردگی کے اعتبار سے علی گڑھ سن رشد کو پہنچ چکا تھا اس کی خدمات کی تاریخی اہمیت تھی۔ یونی ورسٹی کا درجہ حاصل ہو جانے پر اس کی خدمات اور ہماری توقعات کی نوعیت اور اہمیت بدل

بھی گئی تھی اور بڑھ بھی گئی تھی۔ جامعہ کی حیثیت ایک ایسے ہونہار بچے کی تھی جس کی دوست دشمن سبھی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اس کے تھوڑے کو بھی بہت قرار دیتے ہیں۔ جامعہ کو جہاں بہت سی دشواریوں کا سامنا تھا وہاں کچھ آسانیاں بھی میسر تھیں، جن میں ایک یہ تھی کہ ہم میں سے بیشتر خواہ اس کے پروگرام (Programme) پر اعتقاد رکھتے ہوں یا نہیں اس کو کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سے ان مصیبتوں کو تھوڑا کر کے دکھانا مقصود نہیں ہے جو جامعہ کو پیش آئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کارکنان جامعہ نے جامعہ کو ترقی دینے میں جس ایثار واستقامت کا ثبوت دیا وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو جامعہ کی تاریخ میں ہمیشہ فخر ومسرت سے یاد رکھا جائے گا۔ ان باتوں کے باوجود ہم پر جونئی اور نہایت اہم درجہ ذمے داریاں یونی ورسٹی ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتی تھیں ان کا حق ہم ادا نہ کر سکے۔

یونی ورسٹی ملتے ہی قومی سیادت وقیادت کا مرکز ثقل علی گڑھ سے منتقل ہو گیا۔ نتائج و عواقب کے اعتبار سے یہ بہت بڑی تبدیلی تھی جس نے یہاں کی دیرینہ اہمیت کو ایک طور پر ختم کر دیا اور بہت جلد علی گڑھ سیاسی ومذہبی لیڈروں کی گرفت میں چلا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے ماتحت علی گڑھ کو وہ حیثیت دیر تک نصیب نہیں رہ سکتی تھی جس پر وہ شروع سے اب تک فائز رہا تھا۔ لیکن یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اگر سیاسی قیادت جا چکی تھی تو کارکنوں کو چاہیے تھا کہ وہ یونیورسٹی کو اچھا اور بڑا بنانے پر اپنی بہترین استعداد صرف کرتے، اس لیے کہ ایک اعلیٰ تعلیم گاہ قوم کے فکر وعمل کو جس قدر صحت مند اور تازہ کار اور اس کے مستقبل کو روشن وصحت مند رکھتی ہے کوئی دوسرا ادارہ رکھ نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے اکابر سیاسی سرگرمیوں کے اس درجہ شیدائی ہو چکے تھے یا سیاسی ریشہ دوانیوں کی زد میں تھے کہ یونیورسٹی کے صلاح وفلاح پر غور کرنے تک کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونی ورسٹی مقصد ہونے کے بجائے وسیلۂ مقصد بن گئی۔ سیاسی ریشہ دوانیوں اور سیاسی بالا دستی کا اکبار، اصغار، انفار سب کا اور یہ کوئی معمولی سانحہ نہ تھا!

یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ تعلیم گاہوں میں سیاست اور مذہب کا عمل دخل کیا اور کتنا ہو اور ہونا چاہیے بھی یا نہیں، میں تو صرف اپنا خیال ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ علی گڑھ

میں سیاسی مذہبی یا مذہبی سیاسی تحریکوں کو جس طرح ابھارا یا بگاڑا گیا اس کا نتیجہ علی گڑھ کے حق میں اچھا نہ ہوا اور شاید اس لیے کہ علی گڑھ کے بنیادی مقاصد میں سیاست و مذہب کی تبلیغ نہ تھی نیز یہ کہ اچھی تعلیم گاہوں کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کو عملی سیاست کے شوروفتن سے دور رکھا جائے، بہت دور!

یونی ورسٹی ملنے سے تقسیم ملک تک کا زمانہ ابتدا کے چند سالوں کے علاوہ افراتفری کا زمانہ ہے۔ یونی ورسٹی کے مفادومقاصد کے سوا تمام دوسرے مفادومقاصد کے حصول کی جدوجہد رہی۔ کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوا جیسے برے دن گزر گئے اور اچھے دن آئے۔ لیکن واقعتاً حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور تقسیم ملک سے پہلے کے چند سال تو یونی ورسٹی میں ایسے دیکھنے میں آئے کہ پہلے کبھی نہ دیکھے تھے نہ سنے۔ ایسی حالت میں بیرونی طاقتوں کا غلبہ پانا تعجب کی بات نہ تھی۔ پھر یہ بھی کوئی راز نہیں ہے کہ اس زمانے میں علی گڑھ کے سپیدوسیہ کا انصرام ایسے ہاتھوں میں تھا جو نہ اندرونی انتشار کو قابو میں رکھ سکتے تھے نہ بیرونی فشار کو!

سلطنت مغلیہ کے زوال اور غدر کے عواقب کو کچھ مرور ایام سے اور کچھ سرسید کی قیادت کے طفیل مسلمان ایک حد تک بھلا چکے تھے اور رفتہ رفتہ عافیت، عزت اور فراغت کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ بچی کھچی زمین جائداد تھی، تھوڑی بہت چھوٹی بڑی نوکریاں تھیں، کچھ کاروبار تھا اور بہت کچھ ساکھ تھی۔ کام چل نکلا تھا۔ یہ حالت کم وبیش تیس چالیس سال تک قائم رہی جس میں انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں وہ حالات وحوادث بھی پیش آتے رہے جن کی طرف گذشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم آئی اور گزر گئی اور ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اب تک ہندوستان دو عالمگیر جنگ کی براہ راست ہلاکتوں سے محفوظ رہا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ کمی 1947ء میں وہ خود اپنے ہاں ایک خونیں تقریب منا کر پوری کرے گا! اس کا اثر مسلم یونی ورسٹی اور مسلمانان ہند پر جیسا کچھ پڑا وہ محتاج بیان نہیں!

1857ء کے بعد ہندوستانی مسلمان جن حالات وحادثات سے دوچار رہے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انھوں نے کل ہند نوعیت کی جن تحریکات کو چلایا ان میں غالباً

مدرستہ العلوم علی گڑھ (ایم۔ اے۔ او کالج) ہی ایسا ادارہ تھا جس پر قوم کا پورے طور پر ہمیشہ بھروسا رہا۔ جس نے بحیثیت مجموعی قوم کی سب سے مفید اور دیرپا خدمات انجام دیں اور جس کی خدمات کو متفقہ طور پر تقریباً ہر حلقے میں سراہا گیا۔ جس نے مسلمانوں کو ہر سمت سے تقویت پہنچائی، ان کے حوصلے اور عزائم کو پروان چڑھایا اور دور و نزدیک ان کی توقیر بڑھائی۔ اس کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کے نشیب و فراز بھی آئے جن پر بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کی خدمات کے بیش بہا ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ خالص مذہبی یا نیم مذہبی ادارے پیش نظر نہیں ہیں!

سرسید مغلیہ سلطنت کی تباہی اور غدر کی ہولناکیوں سے برآمد ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت ان صلاحیتوں پر مشتمل تھی جن کو ایک طرف مٹتے ہوئے عہد کا قیمتی ورثہ اور دوسری طرف اس کی جگہ لینے والے صحت مند تصرفات کی بشارت کہہ سکتے ہیں! وہ ایک ایسے رشتے یا واسطے کی مانند تھے جو ایک عظیم ماضی کو اس کے عظیم تر مستقبل سے منسلک و مربوط رکھتا ہے، جس کے بغیر نہ تو کسی قوم کے تہذیبی شعور میں ربط و تسلسل باقی رہتا ہے نہ خود نسل انسانی اس منزلت پر فائز ہو سکتی ہے جس کی اس کو بشارت دی گئی ہے! مدرستہ العلوم کا قیام انھیں صلاحیتوں کا تقاضا تھا جن کو سرسید اور ان کے رفقائے کرام نے اپنی تحریر، تقریر، شاعری، شخصیت اور عمل محکم اور مسلسل سے متشکل، مستحکم اور مزین کر دیا۔

اس طور پر علی گڑھ شرقِ اوسط کی اس طرز توحید فکر اور طریق بود و ماند کا ایک طرح سے امین بنا جس کا ظہور عرب سے ہوا اور جو صدیوں سے متمدن دنیا کا طرۂ امتیاز رہا تھا۔ اس طرز و طریق کو اس نے غیر نامی طور پر نہیں اپنایا تھا، بلکہ اس میں ہندوستانی تہذیب کے ایسے قیمتی اور دل کش عناصر اس خوبی و خوب صورتی سے سموئے کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا (اکثر پہچاننا) دشوار ہو گیا! اس کسر و انکسار میں علی گڑھ اپنی بیداری اور اپنی تخلیقی و تعمیری صلاحیتوں کی بشارت دیتا اور ثبوت پہنچاتا رہا۔ ہندوستان، چین اور ایشیا کے دوسرے ممالک اپنی اپنی مخصوص تہذیبوں پر فائز رہے اور تہذیبوں کے گراں مایہ ہونے میں کلام نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ وہ تہذیب جس کا ذکر اوپر آیا ہے وہ بہت دنوں تک روح عصر کی حیثیت سے ایشیا، یورپ اور

افریقہ کے مختلف رقبوں پر ضوفگن رہی۔ یہاں تک کہ صنعتی وسائنسی تہذیب نے اس کی جگہ لے لی یا کہیں کہیں اس کو بہت پیچھے ڈھکیل دیا!

میرا ذاتی خیال کچھ ایسا ہے کہ سرسید نہ تو مذہب کے ایسے کوئی جید عالم تھے، نہ سیاست کے ماہر یا شعروادب کے شیدائی۔ لیکن بقول ایک فاضل کے ایک غیر معمولی صفت ان میں یہ تھی کہ وہ جس موضوع پر جو کچھ لکھنا یا کہنا چاہتے تھے اس کے لیے تمام ضروری معلومات فراہم کرنے کی انتہائی کوشش کرتے جو مستند کام کرنے والوں کا امتیاز ہے۔ وہ بڑے مخلص، ہمدرد، ذہین، دلیر، عالی حوصلہ، دوراندیش، انتھک اور ناقابل تسخیر تھے۔ ان میں جہاں داری اور جہاں بینی دونوں کی جھلک ملتی ہے جو کبھی ہمارے اسلاف کی صفات تھیں!

غدر کے بعد جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی شیرازہ بندی کا سوال تھا وہ قائدٗامامِ عہدٗ یا روحِ عصر یقیناً تھے۔ وہ شاید کسی فن میں یگانۂ روزگار نہ تھے لیکن کتنے یگانۂ روزگاران کے گرد جمع ہو گئے تھے، شاید جمع ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے! ان سب کی بیش بہا تخلیقی استعدادوں کو ایک مقصد پر مرکوز کر کے قوم وملک کے لیے بابرکت بنانا سرسید کی غیر معمولی شخصیت کا فیضان تھا! سرسید کو پہچاننے میں ہم نے دیر بھی کی اور ناانفاقی بھی، اب ان کو ہر موقع پر یاد کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔

سرسید کے[1] رفقائے کرام سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اگر سرسید کی عظیم شخصیت ان جینیسوں (Geniuses) کو اپنے حلقۂ اثر میں لے کر ان کے بطون میں تہلکے نہ پیدا کر دیتی تو کون کہہ سکتا ہے متفرق اور منتشر رہ کر یہ قوم وملک کی کیا خدمت کر سکتے۔ سرسید مسلمانوں کو ملاؤں کی گرفت سے نکالنا چاہتے تھے۔ یہی مہم اقبال کے سامنے تھی۔ دونوں کا زمانہ اور دونوں کا طریقۂ کار مختلف تھا۔ حال کو سدھارنے کے لیے کبھی کبھی ماضی کو سدھارنا پڑتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کے معلمین و مصلحین کو اکثر یہ منازل طے کرنا پڑے ہیں۔ اگلوں سے قطع نظر سرسید، شبلی، اقبال، مودودی سب نے یہی کیا آیندہ بھی ایسے لوگ آتے رہیں گے اور یہ مہم جاری رہے گی۔ مذہب کی بنیادی اور فروعی باتوں میں امتیاز کرنے میں اکثر غلطی ہوئی ہے جس کی تلافی کی کوشش ہمیشہ کی جائے گی۔

---

1 سرسید (1817ء 1898ء)

قوم کی سیرت مسخ ہونے کا احتمال دو وقت خاص طور پر ہوتا ہے۔ ایک جب حکومت ہاتھ میں آتی ہے، دوسرے جب ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ ہر زمانے اور ہر ملک میں مصلح اور معلم نے ان مواقع پر سخت جدوجہد کی ہے اور ناوانوں یا خودغرضوں کے ظلم سہے ہیں، ناواقفوں یا بے وقوفوں کو مذہبی توہمات سے بچانے اور نکالنے کے لیے مذہب کی افہام وتفہیم میں سرسید یا کسی اور کا کہیں کہیں غیر محتاط ہو جانا تعجب کی بات نہیں۔ سرسید کے نکتہ چینوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ غدر مسلمانوں کے حق میں کیسا ہولناک حادثہ تھا اور مسلمان کن تاریخی حوادث سے دوچار تھے۔ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وہ انجام ہو جو اسپین میں ہوا۔ سرسید نے ہندوستان میں دوسرا اسپین اسٹیج (Stage) ہونے کا سدباب کیا۔ ذاکر صاحب نے غالباً تیسرا، دیکھیے اس بحر سے کب کیا چھلکتا رہتا ہے۔

میں نے سرسید کا عہد نہیں دیکھا۔ لیکن ذاکر صاحب کی زندگی اور ان کا زمانہ پورے طور پر نظروں کے سامنے رہا ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ سرسید پر کیا عالم گزرا ہوگا جب غدر کے بھیانک نتائج ان کے سامنے تھے اور ہر بہانے ہر طرف مسلمان برباد اور ہلاک کیے جا رہے تھے اور ذاکر صاحب پر کیا کیفیت طاری ہوئی ہوگی جب تقسیم ملک کے بھیانک نتائج ان کے سامنے آئے اور انھوں نے ہر طرف بالعموم اور دلی میں بالخصوص مسلمانوں کو کیسی بھیانک آزمائش سے گزرتے دیکھا۔ میں نے ذاکر صاحب کا عہد نہ دیکھا ہوتا تو سرسید کا اتنا قائل نہ ہوتا جتنا کہ اب ہوں۔ اس سے سرسید اور ذاکر صاحب کا اتنا موازنہ مقصود نہیں جتنا دونوں کے سامنے جیسی بے پایاں اور بے پناہ ذمے داریاں تھیں، ان کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

سرسید نے مدرستہ العلوم کو مذہبی ادارہ نہیں بننے دیا۔ اسلامی اور علمی ادارہ بنانے اور رکھنے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ ایسا علمی اور اسلامی ادارہ جو قومی رنگ وآہنگ سے استوار و آراستہ ہو۔ ذاکر صاحب نے پچاس سال بعد جامعہ ملیہ کے لیے بھی قریب قریب یہی نقشہ تجویز کیا سوا اس کے کہ انھوں نے حکومت کی امداد اور مداخلت سے جامعہ کو آزاد رکھا اور اس اعتبار سے جامعہ کو امتیاز حاصل رہا اور تعلیمی تنظیم وتشکیل کے جو نئے اور قیمتی تجربے سامنے آئے وہ مسلم ہیں۔

مدرستہ العلوم کی اس خصوصیت کو ملک کی تقسیم سے چند سال پیش تر تک بڑی قابلیت، بڑے حوصلے اور خلوص سے نباہا گیا۔ چنانچہ اس ادارے کی تاریخ میں ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی، سکھ، قادیانی، پنجابی، بنگالی، دکنی قسم کی کش مکش اور ناگواری کبھی نہیں پیدا ہوئی، باوجود اس کے کہ شروع سے آخر تک جتنے مختلف مذہب و مسلک کے طلبہ اور اساتذہ اس ادارے میں یکجا رہے ہیں، کسی اور ادارے میں خواہ وہ حکومت ہی کا کیوں نہ رہا ہو، نہیں رہے۔ چاہے وہ حکومت بدیسی رہی ہو چاہے قومی!

علی گڑھ سے باہر فرقے وارانہ جھگڑے اور صوبہ جاتی عصبیت کے جہاں تہاں اکثر مظاہرے ہوتے رہے، لیکن کالج کی فضا اس طرح کی نحوست ونجاست سے ہمیشہ پاک رہی۔ مسلمان حکومتوں کی رواداری کی روایت کو بالعموم اور اسلامی وسعت نظر کی روایت کو بالخصوص، جس خوبی اور پابندی سے علی گڑھ نے نباہا وہ ہندوستان کی تعلیم گاہوں کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ طلبہ حکومت کے جن چھوٹے بڑے مناصب پر فائز رہے یا جہاں کہیں جس حال میں رہے فرقہ وارانہ عفونت سے پاک رہے! اسلام میں فرقہ پرستی انسانیت کی توہین تصور کی گئی۔ ہندوستان میں علی گڑھ اس کا نمونہ رہا۔

سید جمال الدین احمد[1] کی پین اسلامک تحریک (Pan Islamic) عالمگیر اخوت اسلامی کی بھی سرسید نے تائید نہیں کی تھی اور اپنے اس رویے سے وہ سید موصوف کے سخت عتاب کے مورد ہوئے۔ سرسید اس حقیقت سے آشنا تھے کہ ہندوستان اتنے فرقوں کی سرزمین ہے اور رہ چکا ہے کہ اب وہ یا تو ہر فرقے کی سرزمین ہے یا کسی فرقے کی نہیں اور جب کبھی یا جہاں کہیں اس میں فرقہ بندی کی تحریک اٹھائی جائے گی ملک کے صالح مقاصد کو نقصان پہنچے گا۔ اس نکتے کی توضیح سے کوئی فائدہ نہیں اس لیے اس کو کوئی ملک یا قوم قابل اعتنا نہیں سمجھتی۔

---

[1] سید جمال الدین افغانی 39-1838ء میں سعد آباد (کابل) میں پیدا ہوئے۔ مروجہ تعلیم کے علاوہ جدید تعلیم بھی حاصل کی۔ امیر افغانستان دوست محمد خاں کی ملازمت کی۔ پین اسلامک تحریک کی تبلیغ واشاعت کے لیے مصر، ترکی اور ہندوستان کے دورے کیے۔ محمد عبدہٗ اور زغلول پاشا اسی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ مصر اور ترکی کی حکومتوں نے ان کو ملک بدر کردیا۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک کے سخت مخالف تھے۔ 1897ء میں سرطان کے مرض میں انتقال کیا۔

سرسید کا تعلیمی نیز علمی، دیانت وامانت کا تصور بلند و برگزیدہ تھا۔ ان کو یقین تھا کہ مدرستہ العلوم ایک دن یونی ورسٹی کے درجے تک پہنچے گا۔ اس لیے انھوں نے تعلیم اور علم کے اعلیٰ تصور کو کسی اور تصور حتیٰ کہ مذہبی تصور کا پابند نہیں کیا۔ خالص دینی یا مذہبی تعلیم کے وہ مخالف نہ تھے۔ سرسید کی تصانیف کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان کو اسلام سے اور داعی اسلام سے کس درجہ شغف تھا۔ رسول پاک ﷺ کی سیرت و شخصیت کی حمایت میں ''خطبات احمدیہ'' تصنیف کر کے سرسید نے ذات اقدس سے جس بے پایاں شیفتگی کا اظہار کیا ہے اس کا اندازہ سرسید کے خطوط سے کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیرت پاک پر ''خطبات احمدیہ'' سے بہتر کوئی اور تصنیف سرسید سے پہلے نہیں ملتی۔ سرسید چاہتے تھے کہ علی گڑھ کے طلبہ اسلامی تاریخ کی بہترین روایات اور مذہبی زندگی کی اعلیٰ قدروں کی پیروی کریں، مغربی علوم و فنون کے شناور ہوں اور ملک میں باعزت زندگی بسر کرنے اور مل جل کر رہنے کے طور طریق اپنائیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ انگریزوں سے لڑتے تھے، ملاؤں سے کفر کے فتوے پاتے تھے اور شاعروں سے طرح طرح کی پھبتیاں سنتے۔ ہم سے آپ سے گڑگڑاتے تھے۔ اپنی ہر پونجی لگا رہے تھے، خواہ وہ معاش و ملکیت کی ہو، خواہ عزت و ناموس کی، خواہ راحت و عافیت کی، خواہ ذہن و ضمیر کی۔ کوئی کچھ نہ کرتا تو خود سب کرنے لگتے، خواہ وہ اعلیٰ درجے کا کام ہوتا خواہ معمولی درجے کا، عقل کی روشنی میں کرنا پڑتا، خواہ جذبات کے سیل بے اماں میں وہ سب کچھ کرتے، علی الاعلان کرتے! اور دیوانہ وار کرتے! اپنے بے نظیر کارناموں کے اعتبار سے سرسید ایک فرد یا ادارے کی نہیں بلکہ ایک عہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں شاید اتنی جید اور جامع حیثیات کی شخصیت پچھلی دو صدیوں میں نظر نہ آئے!

پچھلے اوراق میں علی گڑھ اور سرسید سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ممکن ہے بعض عزیزوں اور بزرگوں کو بے ضرورت یا بے محل معلوم ہوں۔ میں ان کا تذکرہ اس لیے ضروری سمجھا کہ مدرستہ العلوم اور اس کے بانی سے متعلق میرے یہ عقائد وہ ہیں جن کا میری زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بہت گہرا اور بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ میرے ان اعترافات کا کم سے کم یہ فائدہ تو ہوگا کہ علی گڑھ یا میرے یادونوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا قارئین کرام کو آسانی سے موقع مل جائے گا!

سرسید کے انتقال سے چند سال پہلے اردو ہندی کا فتنہ شروع ہو گیا تھا۔ اس قضیے نے سرسید کو بڑی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے بعد محسن الملک اس سے دو چار ہوئے پھر مولوی عبدالحق، پھر ذاکر صاحب! میں فرسٹ ایر میں داخل ہوا تو مولانا اقبال احمد خاں سہیل [1] کے توسل سے ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جب سے اب تک زندگی کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزری لیکن اخلاص، یگانگت اور بے تکلفی کے تعلقات بڑھتے اور گہرے ہی ہوتے گئے۔ کبھی کبھی زندگی کے اوراق کو جہاں تہاں سے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یہ خیال آتا ہے کہ ذاکر صاحب کے بیچ نہ ہوتا تو کیا ان اوراق کے نقوش ایسے ہی ہوتے جیسے کہ ہیں۔

علی گڑھ میں ذاکر صاحب کی پوزیشن بڑی عجیب اور اہم رہی ہے۔ کالج پر ترک موالات کا جو حملہ ہوا اس کو موثر اور با مقصد بنانے میں ان کا بہت زیادہ دخل رہا۔ اس وقت کے طلبہ میں وہ ہر اعتبار سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ طالب علمی کے بعد جب وہ زندگی کی دوسری آزمائشوں سے دوچار ہوئے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ساتھیوں میں ہر چھوٹے بڑے پر اپنے منصب نہیں بلکہ اپنے اعلیٰ

---

[1] نومبر 1955ء میں مولانا جوار رحمت میں پہنچ گئے! کس قدر شفیق و شریف النفس، کیسا ذہین و ذی علم اور فارسی شعر و ادب کا کس پایے کا باکمال ہم سے رخصت ہو گیا۔ دوستوں کے لیے ان کے دل میں کتنی وسعت، کتنی نرمی اور نوازش تھی۔ کیسی کیسی خوش گوار یادیں، شوخ بھی شریف نہ بھی، نئی پرانی ہمیشہ تازہ رہنے والی یادیں مرحوم سے وابستہ ہیں۔

اپنے نیازمندوں میں مولانا نے جن دو چار کو تادمِ آخر، تقریباً چالیس سال تک، عزیز و محترم رکھا، ان میں ایک راقم السطور بھی تھا۔ مجھے تو جیسے وہ کسی حال میں متردد یا مایوس نہ دیکھ سکتے ہوں اور ہر طریقے سے جو اُن کے بس میں ہوتا خوش کرنے یا تسکین و تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے۔ مرحوم کے اردگرد جتنے لوگ تھے، خواہ اپنے ہوں یا پرایے، اُن سے کوئی پوچھے کہ مرحوم کی مفارقت سے اُن پر کیا گزر گئی! مرحوم تو اُٹھ گئے، ان کی یادوں کے حزیں اور رہ رہ کر اُمڈنے والے انبوہ کو کہاں لے جاؤں، کیسے بھلاؤں، یا ان کو کیا جواب دوں!

(اقبال سہیل پر رشید صاحب کا مضمون ہم نفسانِ رفتہ میں شامل ہیں) مرتبین۔

کردار اور کارکردگی کے اعتبار سے محترم مانے جاتے تھے۔ ان کے دو بڑے بھائی مظفر حسین خاں اور عابد حسین خاں (جو عین عالم شباب میں اس جہان سے اٹھ گئے) اس کالج میں اپنے عہد کے اچھے اور نامور طالب علموں میں تھے۔ انھوں نے شرافت اور قابلیت کی جو روایات کچھ دن پہلے ہی چھوڑی تھیں ان کا چرچا کالج میں عام تھا! ذاکر صاحب اور ان کے یہ دونوں بھائی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے تھے اور اس اسکول کے مشہور و محترم ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب بی اے (علیگ) کے سایہ شفقت میں تعلیم و تربیت حاصل کر چکے تھے۔ جنگ طرابلس کے دوران میں ترکوں کے لیے ذاکر صاحب اپنے اسکول میں جس جوش و انہماک سے چندہ جمع کرتے تھے اور جیسی ولولہ انگیز تقریر کرتے تھے وہ اب تک ان کے ساتھیوں کو یاد ہے!

بی۔اے کے امتحان میں ذاکر صاحب کی پوزیشن آئی تھی۔ اس زمانے میں ایم۔اے۔او کالج کا الحاق الہ آباد یونی ورسٹی سے تھا۔ ان سے قبل یہاں کے متعدد طلبہ الہ آباد یونی ورسٹی میں بی۔اے کے امتحان میں اول آ چکے تھے۔ لیکن جو بات ذاکر صاحب کو دوسرے طلبہ سے ممتاز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ یہ کورس کی کتابیں نہ خریدتے تھے، نہ پڑھتے تھے۔ زیادہ وقت ادھر ادھر گھومنے یا جہاں تہاں بیٹھ کر خوش گپی میں گزار دیا کرتے تھے۔ لیکن اس میں لٹن لائبریری اور یونین کے دارالمطالعہ کا روزانہ گشت ضرور شامل ہوتا۔ رات کو واپس آتے یا دن میں کہیں ملاقات ہو جاتی تو معلوم ہوتا کہ ہندوستان یا اس سے باہر کا کوئی علمی یا سیاسی مسئلہ اور کالج کا کوئی حادثہ، پرائیوٹ یا پبلک، یا ادبیات کا کوئی اشتہار ایسا نہ تھا جس کی ان کو خبر نہ ہو۔ پھر اردو فارسی اساتذہ کے دس پانچ منتخب اشعار ازبر نہ ہوں۔ ذاکر صاحب سے طالب علمی کے زمانے میں بھی ایسی کوئی لغزش سرزد نہ ہوئی جو طالب علموں سے اکثر ہو جایا کرتی ہے۔

ایم۔اے۔او کالج کے عہد میں طلبہ اور کالج کے منتظمین میں مخالفت کی بہت کم نوبت آئی تھی۔ کبھی اس طرح کی کوئی بات پیش آ جاتی تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ جلسے، جلوس، تار تجاویز، نعرہ اسٹرائک اور فتنہ و فساد کا طوفان بپا ہو جائے۔ اختلاف نے طوالت پکڑی تو طلبہ کے سربرآوردہ نمایندے پرنسپل یا آنریری سکریٹری سے ملے۔ گفت و شنید ہوئی اور معاملہ

رفت گذشت ہو گیا۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ ذاکر صاحب طلبہ کے وفد کے لیڈر ہوتے اور یہ اس بات کی ضمانت ہوتی کہ گفتگو اونچی سطح پر ہوگی اور بالآخر مفاہمت کی صورت پیدا ہو کر رہے گی۔ اس لیے کہ ذاکر صاحب پر جتنا بھروسا ساتھی طلبہ کو تھا اتنا ہی منتظمین کالج کو تھا۔ عجیب اتفاق کہ 30-35 سال بعد تقسیم ملک سے کچھ پہلے جب کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی مخالفت نہایت درجہ تند و تلخ ہو چکی تھی۔ صرف ذاکر صاحب ایسے شخص تھے جس پر دونوں فریق کامل اعتماد رکھتے تھے۔ مثالیں پیش کرنے میں طوالت ہے۔ اس لیے نظر انداز کرتا ہوں۔ ایسے عہد اور ایسی فضا میں اتنا اعتماد شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو۔ آج بھی جب ملک دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے ذاکر صاحب کی شرافت، قابلیت، ایثار اور ایمان داری کے دونوں ملکوں کے عوام و خواص قائل ہیں!

تقسیم ملک کے بعد علی گڑھ کی آبادکاری میں ذاکر صاحب کو جن دقتوں اور نزاکتوں کا سامنا رہا اور جن پر انھوں نے جتنے کم عرصے میں خاموشی اور خوب صورتی سے قابو پالیا وہ ایک ایسی داستان ہے جو شاید کبھی لکھی نہ جا سکے، لیکن عوامی گیتوں کی طرح ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قضا و قدر نے علی گڑھ کی نجات کے لیے ذاکر صاحب کا انتخاب کر لیا ہو اور اسی مقصد کے لیے شروع سے آخر تک ان کی تربیت کی ہو۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ یہاں کے حالات سے آشنا ہو چکے تھے اور ان کے دل میں علی گڑھ نے گھر کر لیا تھا۔ یہاں سے جدا ہو کر جامعہ ملیہ کا کام سنبھالا، مجھے کچھ زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تحریک ترک موالات کے بطن سے جتنی یا جیسی قومی تعلیم گاہیں وجود میں آئیں، ان میں جامعہ کو جو اعتبار و امتیاز حاصل ہوا وہ شاید کسی اور ایسے ادارے کے حصے میں نہ آیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی اور ادارے کو ذاکر صاحب کی شخصیت کا سردار نہ ملا جس نے پچیس سال تک دنیا کے تمام دوسرے حوصلے یا ہوس سے منہ موڑ کر اور اس عمر میں منہ موڑ کر جب حوصلے یا ہوس یا دونوں کا خاص غلبہ رہتا ہے ہر طرح کی مصیبت جھیل کر جامعہ کی خدمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دیں!

علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے جو خدمات انجام دیں، ان کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انھوں نے ایک درس گاہ کو نہیں

بلکہ ایک تہذیب کو تباہ ہونے اور ایک روایت کو رسوا ہونے سے بچا لیا۔ یہ کام آسان نہ تھا بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ انھوں نے سیاسی اور مذہبی محرکات کو جن کے طفیل دشوار گزار مراحل بہت جلد اور بڑی آسانی سے طے ہو جایا کرتے ہیں بر سر کار لانے سے قطعاً اجتناب کیا۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ تہذیب اور اعلیٰ روایات سیاسی محرکات کا نہیں، ریاضت، خدمت اور انتظار کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ جس شخص نے جامعہ کے لیے ایک نئی روایت قائم کی اسی نے علی گڑھ کی دیرینہ روایت کی حفاظت کی۔

سر سید نے اپنے عہد میں مسلمانوں کی آبادکاری بحیثیت مجموعی مدرسۃ العلوم کے وسیلے سے کی۔ حالات کو دیکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادکاری علی گڑھ ہی کے وسیلے سے کرنا پڑے گی۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب کا حسب ذیل بیان ملاحظہ ہو:

"مجھے دکھائی دیتا ہے کہ ہندوستانی قومی زندگی کی تعمیر میں اس ادارے کا ایک بہت اہم مقام ہے۔ مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں جامعہ ملیہ کے کام کو چھوڑ کر جس کے ساتھ میری ساری ذہنی اور روحانی نشو و نما وابستہ تھی علی گڑھ نہ آتا۔ میں آنے پر اور یہاں ٹھہرنے پر صرف اس لیے اپنے آپ کو راضی کر سکا کہ مجھے صاف محسوس ہوا کہ یہاں اہم قومی کام کا ایک نادر موقع ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست[1]

---

[1] مکمل شعر یہ ہے:

زفرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست
(نظیری)

(میں سر سے پیر تک جس جگہ بھی دیکھتا ہوں کرشمہ دل کے دامن کو کھینچ کر کہتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس کی تم کو تلاش ہے)

وہ کام ہندوستانی تدبیر اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے یعنی ایک سیکولر[1] (Secular) جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کتنا دل کش کام۔ یہ مختلف تمدن اور تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے۔''

ہمارے ملک کے سامنے ایک عظیم الشان کام ہے۔ ایک اچھی قومی زندگی کی تعمیر کا کام۔ اس میں ضرورت ہے کہ قوت کا ایک ایک شمہ خوشی خوشی اس کام میں لگا دیا جائے۔ علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کی خدمت کے لیے جو پیش کش دے گا، اس سے متعین ہوگا ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام، ہندوستان علی گڑھ کے ساتھ جو سلوک کرے گا اس پر، ہاں بری حد تک اس پر منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔[2]

لکھنے کے میرے جو اسالیب ہیں (طنز و ظرافت وغیرہ) ان میں علی گڑھ کس طرح اور کس حد تک دخیل ہے۔ یہ سوال جتنا دل چسپ ہے اتنا ہی اہم اور مشکل بھی ہے۔ علی گڑھ ہو یا کوئی اور خطہ محض اپنے نام اور جغرافیے کی بنا پر قابل اعتنا حد تک کسی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ہر ادارے کے قیام کے اسباب اس کی روایات اس کی سرگرمیاں اس کی فتح و شکست اس کے چھوٹے بڑے اشخاص سبھی بحیثیت مجموعی اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں علی گڑھ آیا تو میرا سابقہ جہاں اور بہت سی باتوں سے ہوا وہاں ایسے شخص سے بھی ہوا جو علی گڑھ کا ساختہ پرداختہ تھا اور اپنی قابلیت اپنی خدمات

---

[1] سیکولر (Secular) غیر مذہبی، جس میں مذہب کا لحاظ نہ رکھا جائے۔

[2] اقتباس تقریر ذاکر صاحب جو 8/دسمبر 1951ء کو یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد کی موجودگی میں یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کی تھی۔

(بحوالہ مسلم یونیورسٹی گزٹ۔ 24/دسمبر 1951ء)

اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے بیسویں صدی کے نصف ثانی کے ہندوستانی مسلمانوں کا ویسا ہی نجات دہندہ ثابت ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا جتنا انیسویں صدی کے نصف ثانی کے سرسید ثابت ہوئے۔ البتہ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ذاکر صاحب کو اتنے اور ایسے رفقائے کار بھی مل جائیں گے یا نہیں جتنے اور جیسے سرسید کو مل گئے تھے یا ان کو کام کرنے کی اتنی مدت بھی ملے گی یا نہیں جتنی سرسید کو ملی تھی۔[1]

مسلم یونیورسٹی ایم۔ اے۔ او۔ کالج سے برآمد ہوئی لیکن بوجوہ وہ اتنی ہونہار اور شاندار ثابت نہیں ہوئی جتنا کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج تھا۔ اس لیے وہ ان توقعات کو تو کیا پورا کرتی جو اس سے کبھی کی جاتی تھیں لیکن حکومت یا کسی اور نے پوری نہ ہونے دیں۔ وہ ان روایات کو بھی برقرار نہ رکھ سکی جو کالج کی ناموری کا باعث تھیں۔ بایں ہمہ یہ ادارہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہماری علمی و تہذیبی حوصلہ مندی کی علامت یا بشارت تھا اور یہ بشارت پوری ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی! چنانچہ میرا خیال ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جب سے یونیورسٹی ذاکر صاحب کی قیادت میں آئی اس پر وہ نقش و نگار ابھرنے لگے ہیں جو مدرسۃ العلوم اور اس کے بانی کے نصب العین کی یاد تازہ کرتے ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ تقریباً ایک تہائی صدی تک ایک گونہ بے ثمر رہ کر اس ادارے میں برگ و بار کے آثار تیزی سے پیدا ہونے لگے ہیں!

ذاکر صاحب کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ گذشتہ 30-35 سال میں ان کے بارے میں جتنا اور جو کچھ وقتاً فوقتاً متفرق طور پر میں نے لکھا ہے شاید کسی اور نے نہیں لکھا۔ میرا ان کا جتنا قریب کا اور جتنا طویل ساتھ رہا ہے کم لوگوں کا رہا ہوگا اور مجھ سے زیادہ ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع بھی شاید کسی اور کو ملا ہو۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے صحیح ہے یا غلط! ذاکر صاحب کے بارے میں میں نے بہت سی ایسی باتیں اس انداز سے لکھیں کہ بعض بزرگوں نے میری چشم نمائی بھی فرمائی۔ میں متنبہ ہوا لیکن اس پر ہنسی بھی آئی کہ دنیا میں ایسے لوگ

---

[1] 1956ء میں علالت کی بنا پر ذاکر صاحب دفعتاً یونی ورسٹی سے علاحدہ ہو گئے اور وہی پیش آیا جس کا اندیشہ تھا یعنی ان کو کافی فرصت اور وقت علی گڑھ کی خدمت کا نہ مل سکا! یہاں سے علاحدہ ہو کر بہار کے گورنر ہوئے۔ ہندوستانی جمہوریہ کے نائب صدر اور صدر ہوئے۔

بھی ہیں جو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کہا گیا، یہ نہیں دیکھتے کہ کون کس کے بارے میں کہہ رہا ہے!
تکلف برطرف!!

میں ذاکر صاحب کو نہ ولی سمجھتا ہوں، نہ فرشتہ، نہ امامِ شریعت، نہ پیرِ طریقت۔ لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی وہ فرزندانِ علی گڑھ میں بہت اونچے درجے پر فائز ہیں، بہت اونچے درجے پر!

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالتِ دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اُس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھار ڈبل روٹی بھی کھا لیتا، لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔[2] کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا، کیا دیکھا، کیا گزری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا، بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی۔ لیکن اس کو چھیڑے کون، اس لیے کہ پھر اس کا سمیٹنا بہت ہی مشکل ہوگا۔ تمام زندگی میں یہی ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دی اور میرا عشق[3] بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا۔ گو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری عقل بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ محوِ تماشائے لبِ بام ہونے میں بھی اس کو کافی خطرہ نظر آتا تھا۔ بہر حال پھر میں نے تمام عمر نہ کبھی عشق کو مُنہ لگایا نہ آتشِ نمرود کے مُنہ لگا۔

---

[1] ذاکر صاحب 20 رنومبر 1948ء سے 15 رستمبر 1956ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔
ذاکر صاحب نے کن حالات کی وجہ سے استعفیٰ دیا نیز ان کی حیات وخدمات کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ کیجیے
شہیدِ جستجو مصنفہ ضیاء الحسن فاروقی مکتبہ جامعہ، دہلی۔ 1988ء   مرتبین

[2] اکبر کا مشہور مصرع ہے:

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا!

[3] اقبال کا شعر ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق   عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

میں بڑے تردّد اور ناکسی کے عالم میں بریلی لائن(Line)[1] سے دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا تھا۔ کالج کے ہم سفر طلبا نے حال پوچھے بغیر صرف ہیئت وحالت دیکھ کر میری دلداری نہ کی ہوتی اور اپنے ساتھ لاکر اپنا ناشتہ کھلا کر اپنے کمرے پر، اپنی چارپائی اور بستر پر جگہ دے کر، خود کہیں اور جا کر ساتھیوں کے جمگھٹے میں ہؤحق میں بسر نہ کردی ہوتی تو شہر جا کر معلوم نہیں کہاں قیام کرتا اور میرا کیا انجام ہوتا! ایک درماندہ اجنبی طالب علم کے ساتھ علی گڑھ کے ہم سفر طالب علموں کی یہ بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج بیالیس سال بعد بھی میرے دل کو اس طرح شاداب اور شادماں کرتی ہے جیسے کل کا واقعہ ہو!

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک[2] میں جگہ ملی۔ اس زمانے میں جون میں داخلہ ہو جاتا۔ تعطیل کلاں، برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا۔ نئے پُرانے طلبہ کے ملنے پر جتنی تفریحیں ہونے والی ہوتیں وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہو جاتیں۔ موسم کے اعتبار سے جون جولائی کا مہینہ علی گڑھ میں جس آزمائش کا ہوتا تھا اُس سے کچھ اسی عہد کے طلبہ واقف ہیں، بالخصوص کچی بارک کے طلبہ۔ یہ فطرت اور اربابِ کالج کی ستم ظریفی تھی یا سازش، کہ داخلے اسی زمانے میں ہوتے تھے اور ہر نیا لڑکا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لیے موسم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہو جاتا۔ ابتدا کے دو تین ہفتے بڑی تکلیف و تذبذب میں گزرے۔ کیسی کیسی مصیبتیں اُس زمانے میں جھیلیں! خیال آتا ہے تو اپنے آپ پر

---

[1] یہ گاڑی آج بھی اسی حلیہ و رفتار سے انھیں اوقات میں بریلی اور علی گڑھ کے درمیان سرگرم سیر رہتی ہے جیسی کبھی رہی ہوگی۔ وہی ڈبے یا ویسے ہی ڈبے، وہی سیٹی، وہی گھبراہٹ جو آج سے چالیس بیالیس سال قبل تھی۔ جب میں پہلے پہل علی گڑھ آیا تھا! جیسے پوری گاڑی کسی آسیب کی زد میں ہو اور تا حشر اسی طرح آتی جاتی رہے گی۔ روحانیت کے کسی ماہر سے تحقیق کرائی جائے تو کچھ تعجب نہیں، اسی زمانے کے ڈرائیور، گارڈ اور کوئلہ جھونکنے والوں کی ارواح اسی ٹرین میں اسیر سفر مل جائیں!

[2] کچی بارک:۔ رشید صاحب نے ''خصوصیاتِ کالج گل منزل'' کے عنوان سے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں علی گڑھ منتھلی کے 1916، 1917ء، 1918ء اور 1919ء کے شماروں پر کچی بارک اور اس کے مکینوں کا حال بیان کیا ہے۔

ترس بھی آتا ہے، ہنسی بھی آتی ہے اور فخر بھی ہوتا ہے! اگر اس سے پہلے کا ایک سال اُس سے بھی زیادہ کوفت وکلفت کا نہ گزرا ہوتا تو شاید علی گڑھ سے جوں کا توں واپس چلا جاتا۔

اُس زمانے میں (1915ء میں) کالج کی شوکت و شہرت پورے عروج پر تھی۔ کھیل میں، لکھنے پڑھنے میں، یونین کی سرگرمیوں میں، یورپین وضع قطع، رئیسانہ طور طریقوں اور شریفانہ رکھ رکھاؤ میں، چھوٹے بڑوں کے آپس کے سلوک میں، غرض اُس وقت کے معیار سے زندگی کا ہر پہلو بابرکت اور بارونق نظر آتا تھا اور ایک طرح کی آسودگی، احترام اور آرزومندی کی فضا چپّے چپّے پر چھائی ہوئی تھی۔

جس کسی نے کچّی بارک (سیّد محمود کورٹ) دیکھا نہ ہو وہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ کچّی بارک کیا چیز تھی! کوئی عمارت تھی، عبارت تھی، علامت یا حادثہ یہ سب تھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبے میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیوار و در، نہایت درجہ نیچا، بودا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور کھسک بھی رہی تھیں، جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم دوری دھول اور دھند میں جھول رہی ہو۔ کانپتی، کوستی، کراہتی، کھانستی!

شام کو موسم کی سختی کم ہوجاتی تو لڑکے غسل کرکے صاف سفید کپڑے پہن کر باہر نکلتے اور ایک دوسرے کو (چاہے وہ کتنے ہی فاصلے پر کیوں نہ ہوتا) پکار کر کوئی تفریحی جملہ کہتے یا فقرہ کستے، جیسے مبارک باد دے رہے ہوں کہ موسم کو زیر کرلیا ہے، یا جیسے دوسری جنگِ عظیم میں لندن والوں کو سائرن (Siren) سے مطلع کیا جاتا کہ دشمن کے ہوائی جہاز سے فضا صاف تھی! رات گئے دیر تک طرح طرح کی چہل پہل اور دھوم دھام رہتی۔ ایک طرف اس زمانے کے علی گڑھ کا وہ طنطنہ، دوسری طرف یہ کچّی بارک! ہر حیثیت اور ہر درجے کے گھرانوں کے لڑکے ان میں آباد تھے۔ لیکن باوجود طرح طرح کی تکالیف اٹھانے کے ایک متنفس نے بھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچّی بارک میں رہنا صحت، عافیت، حیثیت، شان یا شرافت کے خلاف تھا۔ یہی نہیں بلکہ کتنے اس کی آرزو کرتے کہ کچّی بارک میں جگہ مل جائے!

اُس زمانے کی کچّی بارک کی صبح وشام اور زمین و آسمان کا خیال کرتا ہوں تو تصوّر میں ریگستان کا وہ منظر آجاتا ہے جہاں ''خضرِ راہ'' میں اقبال نے کہا ہے:

ریگ کے تودے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ وساماں، وہ سفر بے سنگ ومیل!

پھر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے ملّتِ مصطفوی کا اس جہان میں یہی نقشا اور یہی نوید ہے! وہی بدویوں کا سا حال جو ریگستان کی ہر طرح کی سختی جھیلیں گے، لیکن منزل پر اُتریں گے تو ہر چھوٹی بڑی نعمت کا حق اور ہر چھوٹے بڑے کا حق ادا کیے بغیر نہ رہیں گے۔

ایک سال بارش کی شدّت ہوئی اور کئی دن تک بند نہ ہوئی۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کچّی بارک کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کبھی معلوم ہونے لگتا کہ:

ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

اور کبھی محسوس ہوتا کہ:

ہو گئے میرے دیوار و در، در و دیوار!

ہم سب کمروں سے نکل کر برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ سیّد محمود کورٹ مشرقی سے نعرہ بلند ہوا، اس کا جواب فوراً مغرب سے دیا گیا۔ طے کیا گیا کہ محصور ہو کر برسات کا مقابلہ کرنا ناکام رہا، اب میدان میں دادِ شجاعت دینی چاہیے۔ سب موسلا دھار بارش میں جا کر کھڑے ہوئے کچّی بارک کے وسیع صحن میں ڈنڈ اور دھوم مچی، تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ٹول صاحب (کالج کے پرنسپل) گھوڑے پر سوار بھیگتے چلے آرہے ہیں۔ موصوف ایسے ہی کبھی سال چھے مہینے میں کسی بورڈنگ ہاؤس کے آس پاس سے گزر جایا کرتے۔ ان کا اس طرح کا گزرنا بھی ایک حادثہ قرار دیا جاتا۔ پوچھا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ہم میں ایک بڑا ہی بے فکر اور بے جھپک تھا آگے بڑھ کر بولا:

''جناب والا، طوفان آزمائی ہے!'' ٹول صاحب مسکرائے اور ''مبارک ہو'' کہہ کر فوراً ہی گھر واپس چلے گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں رہا تھا!

میں نے کچّی بارک پر ''گل منزل'' کے عنوان سے کئی نمبروں میں اُس زمانے کے

کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی[1]) میں مضامین لکھے تھے۔ طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح چند مضامین کچھ عرصے بعد "سیاحتِ برما" کے عنوان سے لکھے جو "میگزین" میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ یہ اس سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈیپوٹیشن (Duty Deputation) کے سلسلے میں کلکتہ، چٹاگانگ، میمیو کے دورے میں پیش آئے تھے۔ جو اصحاب اس عہد کے علی گڑھ سے واقف نہیں وہ اندازہ نہیں کرسکتے کہ ادب، زندگی، تنقید اور آرٹ کے کیسے کیسے فرعون اور موسیٰ اس وقت کالج میں موجود تھے۔ ان کا فرسٹ ایئر (First Year) کے ایک شکستہ حال طالب علم کی ہمت افزائی کرنا کتنا عجیب واقعہ تھا۔ اس کا اب تک تعجب ہے کہ اُس زمانے میں میں نے تفریحی انداز کا مضمون کیوں لکھا اس لیے کہ یہ دور مجھ پر بڑی سختی کا گزر رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا کیا ہونے والا تھا اور کیا کرنا ہوگا!

اب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھ سے یہ مضمون لکھوایا، جس نے مجھے زندگی اور ادب کے اس ڈھرّے پر ڈال دیا، وہی میری تقدیر تھی جو کچی بارک

---

[1] کالج کے اس مشہور علمی رسالے کا نام "منتھلی" کے بجائے "میگزین" میری درخواست پر قرار پایا۔ اُردو ہی نہیں انگریزی حصے کی ادارت بھی طالب علمی کے زمانے میں میرے سپرد کی گئی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے دونوں سکشنوں کے علاحدہ علاحدہ ممبران اسٹاف (Staff) سے مقرر ہوتے تھے۔ کالج آیا تو پروفیسر اکٹرٹونی، اُن کے بعد پروفیسر اے، ایف رحمٰن حصہ انگریزی کے اور قاضی جلال الدین صاحب اُردو کے نگراں اور ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ میرے بعد طلبہ کی جماعت سے انگریزی اور اُردو علاحدہ علاحدہ اڈیٹر اور اسٹاف کے نگراں مقرر ہونے لگے۔ یہ قاعدہ آج تک جاری ہے۔ میں نے اُردو کے انداز کے انگریزی مضامین بھی "بوہی مین" (Bohemian) نام سے لکھے اس طرح کے لیکن ان سے بہت بہتر مضامین ذاکر صاحب نے "رپ" (Rip) کے نام سے تحریر فرمائے تھے جو بہت مقبول ہوئے۔ لکھنے کا حوصلہ، لکھنے کی مشق اور بھلا برا کہنے کی شہرت، یہ سب مجھے "علی گڑھ میگزین" کے طفیل نصیب ہوئیں۔ اتنا اور اس طرح کا نفع "میگزین" نے میرے علاوہ شاید ہی کسی اور کو پہنچایا ہو!

(رشید صاحب جنوری 1920ء سے جولائی 1922ء تک علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے) مرتبین۔

کی صورت و معنی میں مجھ پر منکشف ہوئی۔ جو میری تحریر اور طور و طریقوں میں جب، جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ نہ وہ مجھ سے جدا ہوتی ہے، نہ میں اُسے جدا کر سکتا ہوں! دراصل میں تمام عمر کچی بارک ہی میں رہا اور اب بھی ہوں!

پہلے پہل مجھے کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا جو طرح طرح کی اُرڈو، طرح طرح کے تلفظ اور لہجے سے بولتے تھے! اس زمانے میں میرا کچھ ایسا خیال تھا کہ ہر جگہ اسی قسم کی اُردو بولی جاتی ہوگی جیسی جون پور کے ثقات بولتے تھے۔ علی گڑھ میں ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے ساتھیوں کی اُرڈو سننے میں آئی تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے دیار کے اشخاص کے علاوہ دوسرے لوگ غیر متمدّن سے تھے۔ ظاہر ہے یہ تأثرات کلیتاً احمقانہ تھے، لیکن بہت دنوں بعد جب میں خاصا کم احمق رہ گیا تھا، سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل شرفِ نیاز حاصل کرنے لاہور گیا، تو مرحوم کا اُردو کا لہجہ اور تلفظ سُن کر ایک لمحے کے لیے دم بخود ہو گیا۔ تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے۔

اُردو کا ذکر یہاں یقیناً بے محل ہے۔ لیکن اس سے مقصود اپنی ایک نفسیاتی افتاد کا اظہار ہے۔ لیکن صحیح یا غلط، اور معلوم نہیں کیوں اور کب سے یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ زبان کے علاوہ اُردو بہت کچھ اور بھی ہے! جیسے ایک قیمتی ورثہ، ایک قابلِ قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا یا اس طرح کی کتنی اور باتیں جو محسوس ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو پاتیں۔ چنانچہ کسی کو غلط اُردو بولتے سنتا تو سمجھتا کہ بولنے والا قابلِ اعتنا نہ تھا یا کسی معذوری میں مبتلا ہے، تو ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔ رفتہ رفتہ جب یہ دیکھنے میں آیا کہ اُرڈو پر طرح طرح کے الزام لگائے جا رہے ہیں اور اس کو زک پہنچانے اور ختم کر دینے کے اہتمام ہو رہے ہیں تو معلوم نہیں کتنے حجابات آنکھوں کے سامنے سے دور ہو گئے اور اُرڈو کا جو اب حال ہوا ہے اس سے یقین آ چلا ہے کہ اس کے بارے میں ابھی ابھی جس حُسنِ ظن کا اظہار کر چکا ہوں وہ غلط نہ تھا!

دوسری بات جو عجیب معلوم ہوئی یہ تھی کہ لوگ آپس میں مل بیٹھتے تو اکثر اس پر فخر یا رشک کرتے کہ فلاں صاحب شاعر ہیں یا فلاں شخص بڑی اچھی اُردو بولتا ہے! میں نے جون پور

میں اس کثرت سے شاعر دیکھے تھے کہ سمجھنے لگا تھا کہ ہر اُردو داں شاعر ہوتا ہے اور جو نہیں ہوتا وہ میرا ہی جیسا گیا گزرا ہوتا ہے! شاعر ہونا ایسی کوئی بات نہیں۔ آخر اس پر تعجب کیوں کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص اچھی اُردو بولتا ہے!

ایک دن مولانا سہیل سے جو ابتدا سے میرے ''نگہبان فرشتہ'' کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے اپنے یہ وسوسے بیان کیے۔ مولانا کمرے میں کھڑے تھے، اتفاق سے کمرہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ وہیں اُکڑوں بیٹھ گئے۔ بولے: ''ارے بھائی، ٹکسالی اُردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اُردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جون پور ہی پر موقوف نہیں، ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ ہندوستان کے دور اُفتادہ خطوں میں اُردو کا شاعر ہونا پڑھے لکھے اور مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اُردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اُردو بھی بول سکتا ہے!'' اچھا دیکھو، کسی دن تم کو ٹکسالی اُردو سنواؤں گا۔'' پھر کچھ تھک سے گئے اور اپنی چارپائی کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ کر دونوں پاؤں پھیلا دیے۔ بولے: ''فارسی لے رکھی ہے؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں۔'' کہنے لگے: ''دیکھو کلاس وغیرہ میں وقت ضائع نہ کرنا، میں پڑھا دوں گا۔ کون کون سے مصنّف ہیں؟'' میں نے دو ایک نام لیے تو بولے: ''لاحول ولاقوۃ، میں نہ پڑھاؤں گا کلاس ہی میں پڑھ لینا۔''

کم لوگوں کو فارسی کے کلاسیکی (Classical) ادب پر اتنا عبور ہوگا جتنا مولانا سہیل کو تھا۔ جن لوگوں نے فارسی میں ایم۔ اے لے رکھا تھا اور مولانا کے دوست یا عقیدت مند تھے، اُن کو خاقانی اور عرفی کے قصائد مولانا پڑھایا کرتے۔ وہ بھی اس طور پر کہ جاڑے کا موسم اور رات کا وقت ہوتا۔ مولانا سردی سے گھبراتے تھے، اس لیے سر سے پانو تک اون اور روئی میں ملفوف لیٹے رہتے اور لحاف کے اندر سے بلا کسی تامل کے یاد دوبارہ شعر پڑھائے بغیر مطلب بیان کرتے جاتے۔ یہی نہیں، بلکہ جہاں کہیں کتابت یا طباعت کی غلطی ہوتی اس کی تصحیح بھی کرتے جاتے۔ کوئی بات خواہ مخواہ یا بے تکی کہی گئی ہوتی تو مطلب بیان کرکے لاحول بھی پڑھ دیتے۔ غالب، عرفی اور نظیری کی شاعری کے نکات اور نزاکتیں واضح کرنے میں مولانا کو کمال تھا۔ جہاں تہاں مماثل اشعار علامہ شبلی کے سُناتے جاتے!

ذہن کی دراکی میں سہیل صاحب کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے سوا ذاکر صاحب کے، گو دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا کرتے کہ یہ مولانا کی مسلسل خرابیِ صحت کے باعث تھا۔ شاعری میں علامہ شبلی کا اور تفہیم قرآن میں مولانا حمید الدین فراہی [1] کا نام بڑے احترام سے لیتے۔ ذاکر صاحب اور میں مولانا کے ساتھ کالج میں کم و بیش چار سال رہے۔ دن رات کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت، سیر سفر، رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ گفتگو یا مباحثے میں فارسی اور اردو کے سربرآوردہ شعرا کے چیدہ اشعار مولانا کی زبان پر اتنے برمحل آتے کہ اکثر شعر ہی سن کر محفل کا رنگ بدل جاتا!

یونین کے ایک موضوع پر دیر تک جوشیلی تقریریں ہوتی رہیں۔ مولانا سہیل بغیر درخواست اور اصرار کے تقریر نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کا بھی یہی دستور تھا۔ اصرار بڑھا تو مولانا آمادہ ہو گئے۔ تقریر اس شعر سے شروع ہوئی:

قمریاں پاس غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سر وِ دریں باغ باندام تو نیست!

اردو کا کیا ذکر طلبہ میں فارسی کے ایسے اور اتنے سخن فہم موجود تھے کہ شعر سنتے ہی واہ، واہ سے مجلس گونج اٹھی کیوں کہ بحث میں حصہ لینے والوں پر یہ شعر بڑی خوبی سے چسپاں ہوتا تھا۔ اس پر تقریباً آدھے گھنٹے تک مولانا کی کبھی حکیمانہ، کبھی شاعرانہ تقریر، یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آج جیسی پُر لطف اور پُر مغز تقریر یونین میں کبھی نہ ہوئی ہو!

---

[1] مولانا حمید الدین فراہی 1862ء میں اعظم گڑھ کے ایک دیہات فریہا میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر تک مولانا نے علوم مشرقی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ سرسید ان کی ذہانت کے قائل تھے۔ علی گڑھ کی علمی و تحقیقاتی فضا میں فراہی کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ 1906ء تا 1908ء جرمن مستشرق پروفیسر ہارووڈ جو مدرسۃ العلوم میں عربی کے پروفیسر تھے، مددگار پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیں اور پروفیسر ہارووڈ سے جرمن اور عبرانی زبان سیکھی۔ مولانا فراہی، ایک شاعر، عالم، ماہر قرآنیات اور مفسر قرآن اور کثیر التصانیف مصنف بھی تھے۔ 1930ء میں انتقال کیا۔

تفصیل کے لیے دیکھیے۔ مضمون مولانا حمید الدین فراہی از عبید اللہ فہد، فکر و نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ تیسرا کارواں۔ 1988ء

اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک موضوع کی مخالفت میں بڑے مزے کی تقریریں ہوئیں۔ محرک کالج کے "سروقداں، سیم تناں" میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی تائید میں غالباً کوئی تقریر نہیں ہوئی یا ہوئی بھی تو بہت معمولی درجے کی۔ لوگ تفریحاً طرح طرح کے آوازے کسنے لگے۔ خلاف معمول مولانا نے تقریر کی اجازت مانگی اور محرک کی تائید کرنے ڈائس (Dias) پر آئے اور شروع اس شعر سے کیا:

دلم بہ پاکیٔ دامانِ غنچہ می لرزد
کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا!

حاضرین سے نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ دیر تک یہ عالم رہا۔ رائے شماری ہوئی تو قریب قریب سب کے ہاتھ محرک کی تائید میں اُٹھے!

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے غالب، عرفی اور نظیری کے مولانا بڑے قائل تھے۔ اُن کے اور دوسرے اساتذہ کے اتنے اچھے اشعار ہم سب کو سُناتے اور اُن کی خوبیوں کو اس مبصرانہ اور دل نشیں انداز سے واضح کرتے کہ محسوس ہونے لگتا جیسے شعر و ادب کا ذوق رکھنا بہت بڑی نعمت تھی! ظہوری کی نثر اور ذوق کی شاعری پسند نہ تھی۔ اس زمانے میں ذوق اور غالب کے حلقے قائم ہو گئے تھے، جہاں ایک کی خامی اور دوسرے کی خوبی پر بڑے شدّ و مد سے بحث ہوا کرتی۔ مولانا نے وقتاً فوقتاً ذوق کی ایسی کڑی اور کبھی کبھی استہزائی اور تفریحی تنقید کی اور غالب کی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھایا کہ کالج میں ذوق کا کوئی حمایتی نہ رہا اور جو کبھی تھا بھی وہ مُنہ چھپاتا پھرتا!

شعر و ادب کے معاملے میں ذرا بھی بدمذاقی[1] دیکھی یا ساتھیوں کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس میں زبان کی غلطی یا ذوق کی پستی پائی جاتی تو فوراً ٹوک دیتے۔ خفا بھی نہ ہوتے اور جو باتیں سکھانے بتانے کی ہوتیں ان کو طرح طرح سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ ان کی ذہانت کی بے اختیار داد اس وقت دینی پڑتی تھی جب وہ کسی دقیق مسئلے کو

---

[1] مولانا نے ایک بار فرمایا: سجاد انصاری (1894ء-1924ء) کہا کرتے تھے کہ اگر پڑھے لکھے شخص سے شعر و ادب کے بارے میں کوئی زیادتی وقوع میں آئے تو اُسے نالائقی کہنا چاہیے۔ مُلا مولویوں سے ہو تو بدتوفیقی، اور عالم لوگوں سے ہو تو بدمذاقی!!

کسی بڑی ہی معمولی یا مضحک مثال سے واضح کر دیتے تھے۔ عرفی کی طرح مولانا کی بھی افتادِ طبع ''سینیر (Senior) شکنی'' تھی اسی سبب سے وہ علم و ادب کے ''منصب داروں'' یا ''سجادہ نشینوں'' میں مقبول نہ تھے!

کچھ لوگ مولانا سے غزل لکھوا کر مشاعرے میں پڑھتے تھے۔ یہ ہمیشہ ہر جگہ ہوتا آیا ہے۔ ایسے حضرات مولانا سے وعدہ لے لیتے تھے کہ جس مشاعرے میں وہ غزل پڑھی جائے گی، مولانا اس میں شرکت نہ فرمائیں گے۔ اس لیے کہ اکثر مولانا اس غزل کے متعلق کچھ ایسے فقرے بے خبری یا بے اختیاری میں فرما جاتے کہ پڑھنے والے کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اس سلسلے میں ایک صاحب نے جو مولانا کے دوست بھی تھے، مولانا سے اچھا مذاق کیا۔ انجمن حدیقۃ الشعر کی طرف سے یونین میں مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا۔ یہ صاحب مولانا سے ایک غزل اپنے لیے لکھوا کر لے گئے۔ باری آئی تو پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر نیچے اوپر دیکھنے لگے، جیسے کسی کی تلاش مقصود تھی۔ صدر نے دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے؛ تو بولے ''حضور والا دیکھ رہا ہوں مولانا سہیل تو نہیں موجود ہیں!'' سب سمجھ گئے اور یکبارگی بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی کا تسلط ہونے لگا، تو صدر نے فرمایا! ''آج کا مشاعرہ...... صاحب کے ہاتھ رہا!'' اس پر پہلے سے بھی زیادہ زور کا قہقہہ بلند ہوا!

مولانا نیز ہم سب کو ذاکر صاحب مغرب کے جدید علوم اور نظریوں سے آشنا رکھتے تھے۔ لٹن لائبریری، یونین اور معلوم نہیں اور کہاں کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے اشعار یاد کر لاتے اور ہم سب کو سناتے۔ ان پر مولانا تبصرہ کرتے اور صلے میں ہم سب کے لیے بہ طیب خاطر اور کبھی بہ دلِ ناخواستہ خوانچے والوں سے پھل، فیرینی یا کباب خریدتے! شعر و ادب کا صحیح و صالح ذوق پیدا کرنے، تنقید کا علمی انداز عام کرنے نیز گفتگو اور روز مرّہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کر دی تھی!

انگریزی حکومت، انگریزی طور طریقوں اور خود انگریزوں سے ہمیشہ بیزار رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بیزاری ان کی فطرت میں داخل ہو گئی ہو۔ سبب یہ تھا کہ غدر کے بعد مسلمان علما اور شرفا پر انگریزی حکومت نے جو ستم ڈھائے اس کا ان پر بہت اثر تھا۔ اس طرح

کے واقعات کبھی کبھی بڑی حسرت والم سے سناتے۔ اردو شاعری کو سیاسی نظمیں شبلی اور ظفر علی خاں نے دیں، لیکن غزل میں سیاسی طنز کے نوک و نشتر سہیل کا عطیہ ہے۔ مولانا محمد علی کی غزلوں میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔ سہیل میں یہ بات شبلی سے آئی۔ لیکن نشتریت کا التزام ارادی اور شعوری طور پر جتنا سہیل کی غزلوں میں ہے اتنا نہ شبلی کے یہاں ہے، نہ محمد علی یا حسرت کے یہاں!

حسرت سیاست میں اتنے عملی، غزل میں اتنے مجازی اور شخص کے اعتبار سے اتنے مخلص، بے تکلف اور بے محابا واقع ہوئے تھے کہ غزل میں سیاسی طنز کا رچا ہوا رنگ جو شبلی اور سہیل کا تھا، دیر تک وہ اسے نباہ نہ سکتے تھے۔ طنزیوں بھی مشکل فن ہے پھر سیاسی طنز کو غزل میں سمونا ہو تو دشواری کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے، اس لیے کہ ادب اور شاعری میں سیاست کا رنگ و آہنگ دینے میں احتیاط نہ برتی جائے تو وہ وقتی ہو کر کلام کو بے کیف اور آگے چل کر بے وقعت بنا دیتی ہے۔ غزل گوئی کو رسمی اور روایتی طنز سے نکال کر سیاسی طرز سے اس طرح آشنا کرانا کہ غزل اور طنز دونوں کا حق ادا ہو جائے، سہیل کا بڑا اہم اور قابلِ قدر کارنامہ ہے! اس رنگ میں ان کا ہم سر اب تک نظر نہ آیا۔ بعض ترقی پسند شعرا کی غزلوں میں یہ انداز جھلکنے لگا ہے، لیکن فیض کے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہے جس کی غزلوں کے بارے میں کہہ سکیں کہ وہ سیاسی طنز کے اہم مطالبات کو پورا کرتی ہیں۔

وطن، خاندان، ماحول، معتقدات، تعلیم و تربیت، رہن سہن کے اعتبار سے مولانا قطعاً مشرقی اور مذہبی واقع ہوئے تھے۔ بایں ہمہ علمی مسائل کو علمی نقطۂ نظر سے دیکھنے، پرکھنے یا شعر و ادب میں اصلاح و ترقی کے رجحانات کو پہچاننے اور اس کی تائید کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ہر مسئلے پر اظہار خیال کرنے میں اس کا لحاظ رکھتے کہ نقطۂ نظر وہ ہو جس کا مسئلہ مطالبہ کرتا ہو نہ یہ کہ ہم آپ کیا چاہتے ہیں! سجاد انصاری مرحوم کے ذوقِ ذہانت اور اسلوبِ نگارش کے بڑے معترف تھے۔ میں علی گڑھ آیا تو انصاری علی گڑھ سے جا چکے تھے۔ خط و کتابت اکثر رہی، ملاقات کبھی نہ ہوئی۔ مرحوم کی تحریریں مجھے بہت پسند تھیں اور اب بھی ہیں۔ ان کے مضامین کی طباعت و اشاعت کا انصرام میں نے بڑے شوق سے کیا تھا۔ مرحوم کا مشہور ڈراما ''روز جزا''

وفات کے مدتوں بعد تمام وکمال سہیل [1] میں اور بقیہ مضامین اس سے قبل ''علی گڑھ میگزین'' میں شائع کر چکا تھا۔ مرحوم کے سارے مضامین بعض بزرگوں کے نزدیک مذہبی نقطۂ نظر سے قابلِ گرفت تھے، اس لیے مسلم یونی ورسٹی کے نصاب سے خارج کر دیے گئے۔ یہ کوئی ایسا غیر معمولی حادثہ نہ تھا۔ اکثر مصنفین اوران کی تصانیف کو ہر دور میں اس طرح کے دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں، بلکہ اس سے بھی برے دن۔ [2]

پھر علی گڑھ پر ایک ایسا وقت آیا جب سیاست نے مذہب سے یا مذہب نے سیاست سے رشتہ جوڑ کر یہاں کی فضا کو اس قابل نہ رکھا کہ علم وادب کی تحصیل وتحقیق اور سچائی کی جستجو کے ساتھ نوجوانوں کو صالح وصحت مند اقدار کو اپنانے اور پھیلانے کی تلقین کی جاسکتی یا تربیت دی جاسکتی اور اس ادارے کی تاریخی بیش بہا روایات کو زیروزبر ہونے سے بچایا جاسکتا۔ یہ حکایت بالکل صحیح نہیں ہے، اس لیے اس کو پھیلا کر بیان کرنے کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

---

1. یہ ایک سہ ماہی * ادبی رسالہ تھا جو میں نے انجمن اردوے معلّی کی طرف سے 1926ء میں نکالا تھا جو 1927ء تک باقاعدہ شائع ہوا۔ علمی طبقے میں اسے بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ کہا جاتا تھا کہ اس وقت تک اردو میں اس پایہ کا کوئی دوسرا رسالہ شائع نہیں ہوا تھا۔ کتابت، طباعت، مضامین، تصاویر، ہر اعتبار سے۔ علامہ اقبال کا تازہ کلام اور عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کا، نیز یورپین باکمالوں کی بنائی ہوئی مشہور تصاویر اس میں شائع ہوتی رہیں۔ مستند روسی ادیبوں کے افسانوں کے اردو تراجم غالباً سب سے پہلے خواجہ منظور حسین صاحب نے اور ان کے بعد جلیل احمد قدوائی صاحب نے کیے تھے، ترکی ادب کے متعدد شاہکاروں کا اردو ترجمہ جو سید سجاد حیدر یلدرم نے ''سہیل'' ہی کے لیے کیے تھے، اس رسالے میں شائع ہوئے۔

* (رسالہ سہیل کے صرف سات شمارے ہوئے۔ 1936ء میں اس کا آخری شمارہ رشید صاحب اور سرور صاحب کی مشترکہ ادارت میں شائع ہوا۔ سہیل کے شذرات کا مجموعہ سید الطاف بریلوی نے ''سہیل کی سرگذشت'' کے عنوان سے نفیس اکیڈمی حیدرآباد سے 1947ء میں شائع کیا تھا۔) مرتبین۔

2. (سجاد انصاری (1894ء-1924ء) کے مضامین کا مجموعہ ''محشرِ خیال'' ایم۔اے اردو کے نصاب میں شامل تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے سخت اعتراضات کی بنا پر اسے نصاب سے نکال دیا گیا تھا۔ سجاد انصاری نے محشرِ خیال میں اپنے مخصوص انداز میں خدا، انسانی، صوفی اور عورت پر پُرلطف انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔) (مرتبین)

بات دراصل یہ ہے کہ میرے جگر میں سارے جہاں کا درد کبھی نہیں رہا۔ میرے حوصلہ وہوس کی دنیا بہت محدود رہی۔ میں تو کھیل کود کر، ہنس بول کر، آس پاس کے اپنے پرائے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر زندگی گزار دینا چاہتا تھا اور یقین سا آ چلا تھا کہ اس طرح کی زندگی علی گڑھ میں رہ کر یا علی گڑھ کے لیے بسر کر سکوں گا۔ لیکن ایک ایسا وقت آیا جب ناعاقبت اندیشی اور بے راہ روی کے ایسے مظاہرے دیکھے کہ غم وغیرت سے بے قرار ہو گیا اور اس کا ذکر ضروری تھا اس لیے کہ اس حادثے نے میرے ذہن اور اسلوبِ تحریر کو بھی اس طرح متاثر کیا ہے کہ میں اس پر فخر نہیں کر سکتا۔

اقبال کا مشہور مصرع مجھے اکثر یاد آیا ہے ع

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی[1]

سوچتا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے پر جس چنگیزی کا سامنا ہوگا وہ قابل قبول ہے یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی کا سابقہ ہوگا وہ قابلِ ترجیح ہے!

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا۔ فرمایا ''چلو تم کو دلی کی زبان سنواؤں'' چنانچہ ساتھ ہولیا، کچھ دیر تک کچی پکی بارکوں کے غلط کمروں میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے رہے جیسے وہ کمرے اور اس میں رہنے والے مدت سے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ مولانا کو دیکھ کر کمرے کا رہنے والا تعظیماً کھڑا ہو جاتا تو مولانا لاحول پڑھتے ہوئے فوراً باہر آ جاتے۔ یہ بتانا دشوار ہے مولانا ارادتاً اپنی غلطی پر لاحول بھیجتے یا اضطراراً کمرے والے پر! بالآخر فضل الرحمٰن قدوائی (فجی مرحوم) کے کمرے پر پکی بارک پہنچے۔ پوچھا۔ ''آغا حیدر حسن[2] نہیں آئے؟'' مرحوم نے ملازم بھیج کر کہیں سے آغا صاحب کو بلوایا۔

---

[1] مکمل شعر:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی! (اقبال)

[2] آغا حیدر حسن دہلوی (1892ء-1976ء) کے مضامین کا مجموعہ ''پس پردہ'' مرتبہ پروفیسر عبدالباسط، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1926ء (مرتبین)

موصوف دلّی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی، اب حیدرآباد میں رہ بس گئے۔ خوش اطوار، خوش گفتار، خوش لباس، سب سے الفت و احترام سے پیش آنے والے، شریفانہ رکھ رکھاؤ، نفاست اور نزاکت جیسے ان پر ختم ہوگئی ہو۔ دلی کی زبان بالخصوص بیگمات کی۔ دلی کے کوچے، دلی والوں کی سیر و تفریح، شادی غمی، طور تہذیب، رسم و رواج، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی ہو۔ اس زمانے میں دلی کے میر باقر علی داستان گو سے ہم سب نے کئی داستانیں سنی تھیں اور آغا حیدر حسن کی زبان سے دلی کے شریف گھرانوں کے معمولات زندگی کی روداد بھی۔ خوش گفتاری اور داستان گوئی کا موازنہ کیا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جتنا لطف میر باقر علی کی داستان گوئی میں آیا اس سے کہیں زیادہ آغا حیدر حسن کی گفتگو میں آتا تھا۔ آغا صاحب کا تفصیلی تعارف کرانا آسان نہیں ہے، گو دل بہت چاہتا ہے اس لیے کہ اب شاید نہ دلی کی تہذیب دیکھنے میں آئے، نہ وہاں کی زبان سننے میں اور ان ہستیوں اور ان سرگرمیوں کے بارے میں کیا کہیے جن سے دلّی عبارت تھی۔!!

مولانا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا: ''بھئی آغا حیدر، ان کو دلّی کی زبان سنوانے لایا ہوں۔'' فجی صاحب نے کہا: ''آغا دہلی کے شرفا اور خواتین کی زبان، کرخندانوں کی نہیں!'' اس زمانے میں مولانا سہیل کا کسی سے فرمائش کردینا کہ ''عرض ہنر کرو'' مخاطب کی بڑی عزت افزائی تھی، یوں بھی آغا حیدر حسن مولانا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ پھر تو آغا صاحب نے ''گل افشانی گفتار'' ہی نہیں، ''انداز'' گل افشانی گفتار کا وہ رنگ دکھایا کہ میں دنگ رہ گیا اور یہ سب اس طور پر نہیں جیسے کوئی رٹی ہوئی تقریر سنا رہا ہو، بلکہ جیسے ہم آپ روزمرہ کے واقعے پر بے تکلف بات چیت کررہے ہوں! گفتگو میں عربی فارسی کا مشکل یا غیر مانوس لفظ نہیں، تلفظ میں کوئی تکلف یا نمائش نہیں، انگریزی کا لفظ یا فقرہ جیسے حاشیۂ خیال میں نہ آتا ہو، پھر زبان میں کس درجہ نرمی اور روانی، لہجے میں کتنی حلاوت، باتوں میں کبھی شایستہ شوخی کبھی شوخ شایستگی جیسے حسرت کی غزل! انگریزی کے جو الفاظ عام ہوگئے ہیں ان کے بھی اتنے خوبصورت اور ہلکے پھلکے مترادفات جو شاید بیگمات دہلی ہی گھڑ سکتی تھیں، اس نرمی، سہولت اور شایستگی سے آغا صاحب کی زبان پر رواں ہوتے تھے جیسے ریشم پر موتی غلطاں ہوں!

کچھ دنوں بعد سید آلِ عبا قادری مارہروی[1] سے ملاقات ہوئی۔ یہ کالج میں عجوبۂ روزگار تھے۔ طاقت لسانی اور علم مجلس میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے بڑوں کی کوردبتی تھی۔ کالج ڈرامیٹک سوسائٹی کے بے نظیر اداکاروں میں شمار ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کی زبان پر اتنا عبور تھا کہ خود حضرات لکھنؤ ان کے اس کمال کا اعتراف کرتے تھے، یہ سارے اوصاف ان پر اس درجہ غالب آگئے تھے کہ اکثر یہ اندازہ لگانا دشوار ہوجاتا کہ سنجیدہ گفتگو کررہے ہیں یا تفریحاً ایکٹنگ، مدتوں حیدرآباد میں بسلسلۂ ملازمت رہے۔ پھر دہلی آل انڈیا ریڈیو کے عملے میں آگئے۔ اب بھی وہی انداز ہیں۔ ملاقات ہوجاتی ہے تو کالج کا زمانہ بے اختیار روبے طرح یاد آنے لگتا ہے۔ سید صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے، جن صاحبوں کو مطالعے کا اتفاق ہوا ہے وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ آغا صاحب اور سید صاحب نے اس زمانے کے دہلی اور لکھنؤ کے ماحول و معاشرت کی کیسی دلکش عکاسی کی ہے۔ آغا صاحب کے مضامین ''بے پرکی'' کے عنوان سے آج سے تقریباً 35-36 سال قبل میں نے علی گڑھ ''میگزین'' کی طرف سے شائع کیے جو بہت پسند کیے گئے تھے!

غالباً 1916ء کا زمانہ تھا۔ ایک دوست کو خط لکھا تھا کہ علی گڑھ کی دو باتوں سے میں بہت متأثر ہوا۔ ایک یہاں کا کرکٹ میچ دوسرا جنازے کا قبرستان لے جانا۔ ایک کا ہمہمہ، دوسرے کا حزن، کالج میں ایک طالب علم کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کی میت کو جس محبت اور احترام کے ساتھ کالج کے قبرستان تک لے گئے وہ سماں اب تک حافظے میں تازہ ہے۔ جب سے آج تک ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی بہت سی رسم و روایات میں تبدیلی راہ پاچکی ہے لیکن میت کو گورستان تک پہنچانے اور سپرد خاک کرنے میں جو رکھ رکھاؤ پہلے دیکھنے میں آتا تھا آج بھی وہ قائم ہے۔ نمازوں میں بھی پہلی سی رونق نظر آتی ہے۔ جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے

---

1. (سید آلِ عبا بشیر حیدر قادری مارہروی (1890ء-1987ء) کا قلمی نام آوارہ تھا۔ مارہرہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ برکت اللہ قادری کے خاندان کے فرد تھے۔ علی گڑھ میگزین میں کئی مزاحیہ مضامین شائع ہوئے۔ حضرت آوارہ کے تین مزاحیہ مضامین کے مجموعے یہ ہیں:

1۔ بے پرکی، 2۔ میرا فرمایا ہوا، 3۔ اپنی موج میں ''بے پرکی'' پر رشید صاحب کا دیباچہ ہے۔ (مرتبین)

نوجوانوں میں مذہب واخلاق کی دی ہوئی پہلی سی طمانیت قلب چاہے باقی نہ رہی ہو لیکن مذہب واخلاق سے ایسی بیگانگی بھی نہیں آئی۔ آج کل وہ حالات وحوادث سے دوچار ہیں اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں مذہب واخلاق کا احترام اور زیادہ جاگزیں ہو گیا ہے۔

مذہب کا دخل سیاسی اغراض کی بنا پر بھی ہوسکتا ہے جس کا دھندا کہیں اور نہیں تو ایشیائی ممالک میں کافی ہے لیکن بالعموم یہ شیوہ لیڈروں کا ہوتا ہے نوجوانوں کا نہیں جو بالطبع مخلص اور معصوم ہوتے ہیں اور ''اغراض'' سے زیادہ ''اقدار'' سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن اس ستم ظریفی کا کیا علاج کہ سیاسی لیڈروں کی گرفت میں نوجوان سب سے پہلے اور سب سے موثر طور پر آتے ہیں۔ مسلمان یوں بھی مذہب کی گرفت سے بڑی مشکل سے باہر ہو پاتا ہے اس لیے کہ اس کی دنیا اور دین ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں رکھے گئے ہیں اور یہ بات اس درجہ اس میں رس بس گئی ہے کہ وہ اکثر مذہب واخلاق کی پیروی بے ارادہ بھی کرنے لگتا ہے۔ صحت مند نفسیاتی پرداخت میں اس بے ارادہ پیروی کو بھی دخل ہوتا ہے۔

1915ء میں طلبا اور اساتذہ کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی۔ ان سے دور اور نزدیک کا رشتہ رکھنے والے مسلمان خاندان بھی آس پاس اس کثرت سے آباد نہ تھے جتنے تقسیم ملک سے چند سال پہلے تک تھے۔ اس لیے وفات کے سانحے بھی نسبتاً کم ہوتے تھے لیکن ہوتے تو چرچا زیادہ ہوتا تھا۔ جس طالب علم کی وفات کا ذکر اس وقت کر رہا ہوں اس کا جنازہ بڑی وقعت اور محبت کے ساتھ قبرستان لے گئے تھے۔ کم وبیش دو ہزار طلبہ کا مجمع، ان کے ساتھ اساتذہ اور دوسرے بہت سے لوگ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور سپید پاجامے میں ملبوس، سر جھکائے خاموش، ہموار قدموں سے مجمع قبرستان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے اس سے زیادہ عقیدت واحترام، حسرت وحرماں اور راضی برضا رہنے کا کوئی اور موقع نہیں ہوسکتا تھا۔ جیسے میت کا احترام علی گڑھ کے طالب علم جتنا جانتے تھے کوئی اور نہ جانتا تھا۔ جیسے یہ احترام ایک فریضہ تھا جس کے ادا کرنے میں ہر شخص اپنی نظر میں اپنے آپ کو گرامی محسوس کرتا تھا۔

میری طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ (Match) ہوئے۔ ہندوستان کی تقریباً ساری مشہور ٹیمیں آئیں اور دونوں طرف نامور

کھلاڑی اور بولر (Bowler) برسرکار دیکھے گئے۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کی فیلڈ (Field) پر علی گڑھ کی جیت ہوئی۔ 1915ء سے پہلے کا کرکٹ کا ریکارڈ (Record) اس سے بھی زیادہ شاندار رہا تھا۔ اس طرح کرکٹ کے کارناموں کی ایک قابل قدر روایت چلی آرہی تھی اور علی گڑھ کرکٹ فتوحات نے ایک حد تک ٹریڈیشن[1] (Tradition) کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

یہ آرزو بہت دنوں تک رہی اور اب بھی کچھ کم نہیں ہے کہ علی گڑھ کرکٹ کی پوری داستان ان لوگوں کی مدد سے مرتب کر لی جاتی تو بڑا اچھا ہوتا جنھوں نے معرکے کے کھیلوں میں خود حصہ لیا تھا یا اپنے پیش روؤں سے مشہور میچوں کے حال سنے تھے۔ ابھی ایسے لوگ زندہ ہیں جو اس کام میں مدد دے سکتے ہیں۔ اسی طرح کرکٹ کا ایک میوزیم (Museum) ہونا چاہیے جس میں ہر سال کی ٹیموں کے نام، ان کے گروپ فوٹوز، ٹروفیز (Trophies) مل سکیں تو مشہور کھلاڑیوں کے بلے لیگ گارڈ (Leg-guard) دستانے، ٹوپی، بلیرز، ان کی تصاویر، ان کی کھیل کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات یا لمحات۔ اس عہد کے اسکورنگ بک (Scoring book) اس طرح کی دوسری چیزیں میوزیم کی زینت بنائی جاسکتی ہیں۔ کس کو معلوم اس طرح کے کتنے نوادر کن گوشوں سے برآمد ہوں۔ اس کتاب اور اس میوزیم کا ہمارے طلبہ پر نسلاً بعد نسل اچھا اثر پڑے گا۔

1915ء میں ہز ہائی نس بھوپال (پرنس حمید اللہ خاں صاحب[2] کی کپتانی کا دور ختم ہو چکا تھا اور کالج کے کرکٹ فیلڈ (Field) یا کرکٹ نیٹ (Net) پر جس طرح کے آداب محفوظ رکھے جاتے تھے وہ صرف علی گڑھ کا حصہ تھا۔ کرکٹ میچ ہو رہا ہو یا نیٹ پریکٹس (Net Practice)

1. ٹریڈیشن (Tradition) روایت کا ایک پشت سے دوسری پشت کی طرف منتقل ہونا۔ نقل روایت

2. پرنس حمید اللہ خاں 1894ء۔1960ء بھوپال میں پیدا ہوئے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی 1911ء میں ہائی اسکول 1913ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1915ء میں بی۔اے۔ کیا۔ کرکٹ کے بہترین کھلاڑی تھے۔ 1926ء میں وہ بھوپال کے حکمراں ہوئے۔ اپنی والدہ سلطان جہاں بیگم 1930ء کی وفات کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر ہوئے۔ 1960ء میں بھوپال میں انتقال کیا۔ مرتبین

ناممکن تھا کہ سوا کیپٹن کے جو ضرورت کے احکام یا ہدایات نافذ کرتا تھا، کسی اور کو مجال دم زدن" ہو اور یہ کچھ کھیل کے میدانوں ہی پر موقوف نہ تھے بلکہ یونین (Union) ڈائننگ ہال، مشاعرے وغیرہ میں بھی کم وبیش اسی طرح کا نظم ملتا تھا۔

یہاں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ اس زمانے میں لڑکے فرشتے ہوتے تھے یا غلام اور آقا کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ حریفانہ چشمک، سازش اور صف آرائی کبھی کبھی ڈھول دھپا یہ سب تھا۔ ٹیموں میں پارٹی بندی بھی رہتی تھی جو اپنا رنگ دکھا جاتی تو جہاں تہاں زک بھی اٹھانی پڑتی، لیکن بحیثیت مجموعی ناروا باتیں حدود سے تجاوز نہ کرنے پاتیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنیے کرکٹ ٹیم ٹور (Tour) پر جانے والی تھی۔ ایک کھلاڑی اور کپتان سے کسی بات پر اختلاف آرا ہوا۔ کھلاڑی نے ٹور (Tour) پر جانے سے انکار کر دیا جس سے ٹیم (Team) کی طاقت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ معاملہ کسی طرح رو براہ ہوتا نظر نہ آیا تو انگریز پرنسپل سے رجوع کیا گیا۔ موصوف نے کیپٹن کو ایک حکم نامہ بھیجا کہ اس کھلاڑی کو ٹیم کے ساتھ لے جاؤ کسی میچ میں کھیلنے نہ پائے اور ہر میچ میں آخر تک اسکورر (Scorer) کے پاس بیٹھ کر کھیل دیکھنے سے "لطف اندوز" ہو۔ اس فیصلے کی حرف بحرف تعمیل کی گئی۔

کرکٹ میچ کا اجتماع کتنا ستھرا اور شاندار ہوتا تھا۔ ہر طالب علم یونی فارم (Uniform) میں ملبوس ہوتا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کلاس میں کسی تقریب میں یا ہوسٹل سے باہر، کسی طالب علم کا بغیر یونی فارم کے پایا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات علی گڑھ میں اس درجہ عام تھی اور اس سختی سے اس کی پابندی کی جاتی کہ اگر کسی موقع پر اپنے ہی کسی ساتھی کو کسی دوسرے لباس میں اچانک دیکھ لیتے تو جھجک جاتے تھے کہ وہی تھا یا کوئی اور۔ عیدین کے موقع پر جب یونی فارم کی قید اٹھا دی جاتی تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے طلبا اپنے اپنے مخصوص لباس میں نظر آتے۔ یہ ایک عجیب دلکش نظارہ ہوتا۔ ایسا نظارہ جو علی گڑھ کے سوا شاید کہیں اور دیکھنے کو نہ ملے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کالج کی مسجد، بورڈنگ ہاؤس اور سڑکیں غالب کے اس شعر کی مصوری کر رہی ہوں:

ہیں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

نز کے کرکٹ لان (Lawn) کے تین سمت کھڑے، بیٹھے یا ٹہلتے ہوئے میچ دیکھتے تھے۔
کالج یونی فارم میں لڑکوں کا یہ اجتماع ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک نیچی اونچی، آڑی ترچھی دیوار چلی گئی ہو۔ جس کے نچلے حصے پر سپیدی کر دی گئی تھی، وسط سیاہ تھا اور بالائی حصہ سرخ۔ نوجوانوں کا ایسا شایستہ شریفانہ زندگی کی صالح توانائیوں سے بھرپور اجتماع کم لوگوں نے کہیں اور دیکھا ہوگا۔ پھر اپنے کھلاڑی کرکٹ کے اعلیٰ درجے کے یونی فارم زیب تن کیے ہوئے فیلڈ (Field) میں اطمینان اور وقار سے اترتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے آج کا دن صرف ہمارے کارناموں کا دن ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ علی گڑھ کی ٹینس ٹیم (Tennis Team) میچ کھیلنے باہر گئی۔ میچ ایک مشہور کالج کی ٹیم سے تھا۔ اتفاق یہ کہ جن کھلاڑیوں کے ساتھ میچ ہونے والا تھا وہ ٹینس کے یونی فارم میں نہ تھے، جو اس زمانے میں سپید فلالین یا زین کا پتلون اور سپید ہی فلالین یا ٹوئل کی قمیص پر مشتمل تھا۔ علی گڑھ کی ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اس بنا پر کھیلنے سے انکار کر دیا کہ مقابل کے کھلاڑی مناسب یونی فارم میں نہ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ کسی جگہ اور ایسی ٹیم کے ساتھ ٹینس کھیلے جہاں ٹینس کا احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا ہو۔ بڑی مشکلوں سے اس نزاکت پر قابو پایا گیا۔

اسی طرح کا ایک اور لطیفہ ہے، پکی بارک کے ایک سینئر (Senior) طالب علم میرے وطن سے آئے جہاں ان کے والد گورنمنٹ کے ایک ذمے دار عہدے پر مامور تھے۔ گھر والوں نے میرے لیے یونی فارم کا کپڑا بھیجا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے کمرے پر تشریف لائے، گھر والوں کی خیریت تفصیل سے سنائی اور بتایا کہ یونی فارم کا کپڑا لائے ہیں۔ میں نے بے اختیار پوچھا ''کہاں ہے؟'' مسکرائے اور بڑے اطمینان اور شفقت سے فرمایا: ''کمرے پر ہے'' معاً مجھے اس کا احساس ہوا کہ میری یہ حرکت ریفریشر (Refresher) نو واردکی تھی۔ بولے ''4 بجے کمرے پر آؤ میرے ساتھ چائے پیو، کپڑا ابھی مل جائے گا!'' یہ توقف مجھے بڑا شاق ہوا۔ اس زمانے میں کم سے کم میرا یہ حال تھا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی ساتھی یا شخص گھر والوں سے مل کر آیا ہے یا وہاں سے میرے لیے کچھ لایا ہے تو طبیعت بے قابو ہو جاتی اور جب تک وہ آدمی یا چیز نہ مل جائے چین نہ آتا تھا۔

بارے وہ وقت آیا اور میں ان کے کمرے پر پہنچا۔ دروازے پر آکر پذیرائی کی، دوسروں سے تعارف کرایا، کھیلنے اور پڑھنے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا "کپڑا مرحمت ہو۔ میں جانا چاہتا ہوں۔" بولے۔ "ضرور ضرور۔" نوکر کو آواز دی آیا تو بکس کی کنجی اس کے حوالے کی اور کپڑا نکلوایا۔ میں چاہا لے کر کمرے سے بھاگ کھڑا ہوں بولے۔ ذرا ٹھہرو۔ نوکر چائے کے برتن ہٹا دے۔ وہ کپڑے (صرف 2 گز سرج!) لے کر تمھارے ساتھ جائے گا! میں چاروں خانے چت تھا! لیکن شاید چت ہونے میں ایک آدھ خانہ باقی تھا۔ اس لیے کہ اپنے کمرے پر پہنچا تو ایک اور سینئر (Senior) رونق افروز تھے۔ میں نے نوکر سے جھپٹ کر کپڑے لے اور بکس کھول کر رکھنے لگا! نوکر واپس جانے لگا تو سینئر صاحب نے مجھے مخاطب فرما کر بآواز بلند فرمایا "مولانا 2 نوکر کو دے دیتا ہوں۔ روپے بعد میں تڑاتے رہیے گا! اب میں بے شمار خانوں چت تھا!

اس زمانے میں اس واقعے کو سن کر کون نہ ہنسے گا۔ مگر کروں کیا کہ اس طرح کی باتوں سے میں نے کچھ سیکھا بھی جیسے یہی کہ تمام عمر کیسا ہی کوئی موقع و محل کیوں نہ خود اعتماد سا رہا۔ اپنے سے بھی، دوسروں سے بھی!

کرکٹ یونی فارم کے بارے میں جو بات میں نے بیان کی ہے وہی کرکٹ کے ساز و سامان پر بھی صادق آتی تھی۔ اس سے امارت کا اظہار یا تعلّی مقصود نہیں۔ بتانا یہ ہے کہ کرکٹ کا حال چائے اور شراب کا سا ہے دونوں شروع سے آخر تک:

زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

ہر منزل پر پوری احتیاط اور احترام چاہتے ہیں۔ ذرا بھی چوک ہو جائے تو "محرم راز دردن میخانہ" فوراً بتا دے گا کہ کہاں بے حرمتی ہوئی۔ چائے اور شراب کی مانند کرکٹ بھی بڑی سخت گیر محبوبہ ہے۔ دیوی اپنے پجاریوں کی کسی لغزش کو ممکن ہے معاف کر دیتی ہو، چائے شراب اور کرکٹ بھی نہیں معاف کرتے!

میچوں میں ہارنے کا بھی خدشہ ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں کم سے کم مجھے کبھی اس کا اندیشہ نہیں ہوا کہ میچ میں علی گڑھ ہار جائے گا۔ کیسے مشاق اور منجھے ہوئے کھلاڑی تھے جو بغیر تذبذب

کے پورے اعتماد کے ساتھ کتنا خوبصورت اور توانا کھیل کھیلتے تھے۔ ہر اسٹروک (Stroke) جیسے جنتر سے نکلا ہوا تار یا کڑی کمان کا تیر۔ کبھی نہ چوکنے والے فیلڈرس (Fielders) پنجاب کے ایک معمر اولڈ بوائے (Old-boy) تھے اور اپنے زمانے کے غالباً کرکٹ کیپٹن کالج آئے ہوئے تھے۔ ایک شام ڈنڈا ٹیکتے ہوئے نیٹ پریکٹس (Practice) دیکھنے آگئے۔ ایک صاحب کے کھیلنے کا انداز دیکھتے ہوئے گرجے "یا مکھی ہانکتا ہے۔ تگڑا کھیل۔ کرکٹ ہے" پریکٹس ختم ہوئی تو لڑکے کو پاس بلایا بولے "کیوں، ماں کا دودھ پینے کے بعد پھر دودھ میسر نہ آیا؟" دیر تک بڑی شفقت سے مختلف اسٹروکس (Strokes) کے انداز بتاتے رہے لیکن دودھ پینے پر بھی زور دیتے رہے!

ان میچوں میں تماشائی جتنی برمحل داد دیتے تھے اتنے ہی چبھتے ہوئے فقرے کستے تھے۔ لیکن سب سے بڑی بات، جو اس وقت ایک فریضے کے طور پر ملحوظ رکھی جاتی اور فطرت ثانیہ کے طور پر وقوع میں آتی، یہ تھی کہ مجمع اچھے اسٹروک (Stroke) اچھی بولنگ (Bowling) اور اچھی فیلڈنگ (Fielding) کی فی الفور داد دیتا تھا۔ بغیر کسی تخصیص کے کہ کھلاڑی اپنا ہے یا غیر۔ مقابل کا اچھا کھلاڑی آوٹ (Out) ہو جاتا تو اظہار افسوس بھی خلوص کے ساتھ کرتے۔ یہ بات اب بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اکثر و بیشتر اپنوں کی تعریف کرتے ہیں اور مخالف پر بے محل اور بے جا آوازے کستے ہیں۔ چاہتے یہ ہیں کہ ادنیٰ قیمت پر اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز حاصل کر لی جائے اور وہ لوگ جو اعلیٰ نتائج کے لیے اعلیٰ صفات کام میں لاتے ہیں، ان کو زک پہنچائی جائے۔

یہ اسپرٹ (Spirit) اب عام ہے، گو بحیثیت مجموعی دوسرے مقامات سے علی گڑھ میں اب بھی کم ہے۔ اب تو بعض مقامات پر یہ حادثہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ ریفری (Referee) کے فیصلے سے اختلاف کرکے غریب کو زدوکوب کر دیتے ہیں۔ پہلے کھیل، کھلاڑی تماشائی سبھی ریفری (Referee) کی حفاظت میں ہوتے تھے۔ اب ریفری پولیس کی حفاظت میں ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کہنا مجھے بہت پسند آیا کہ اسپورٹس مین شپ (Sportmanship) کا تقاضا یہ ہے کہ جس ٹیم (Team) کے خلاف تماشائیوں کی طرف سے ناروا باتیں سرزد ہونے لگیں اس کی مقابل ٹیم کو چاہیے کہ کھیلنے سے انکار کر دے اور اس وقت تک راضی نہ ہو جب تک مجمع اس بات کی ضمانت نہ لے کہ وہ دونوں ٹیموں کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا۔

ایم۔اے۔او۔کالج کی ہاکی ٹیم (Hocky Team) بھی اپنے زمانے میں ہندوستان کی سب سے اچھی ٹیموں میں شمار ہوتی تھی۔میرا خیال ہے کہ ہندوستان کا مشہور سے مشہور کوئی ٹورنامنٹ (Tournament) ایسا نہ تھا جسے یہاں کی ہاکی ٹیم نے مسلسل نہ جیتا ہو۔کرکٹ اور ہاکی کی جتنی مشہور ٹروفیز[1] (Trophies) کا ذخیرہ علی گڑھ میں ہے شاید ہندوستان کی کسی دوسری یونی ورسٹی میں نہ ہو۔علی گڑھ کرکٹ کی طرح یہاں کی ہاکی ٹیم بھی مدتوں ہندستان میں ناقابل تسخیر سمجھی گئی۔مسلم یونیورسٹی کے عہد میں ٹینس (Tennis) کو ترقی ہوئی۔فرداً فرداً یہاں کے کھلاڑیوں نے اچھا خاصا نام پیدا کیا۔جن میں غوث محمد خاں سالہا سال ''انڈیا نمبر ایک'' رہے۔

اور باتوں سے قطع نظر کھیل میں شہرت حاصل کرنے کے اعتبار سے مسلم یونی ورسٹی کا ریکارڈ، ایم اے۔او۔کالج کے ریکارڈ کے مقابلے میں تقریباً ناقابل التفات ہے۔گو یہ بات مسرت سے خالی نہیں کہ ذاکر صاحب کی وائس چانسلرشپ (Vice-chancellor ship) میں جہاں اور بہت سی ترقیاں عمل میں آئیں وہاں ہاکی اورفٹ بال کو بھی یہ امتیاز نصیب ہوا کہ وہ ہندوستان کی تمام دوسری یونی ورسیٹوں کے مقابلے میں اوّل آئیں۔مسلم یونی ورسٹی کے پورے عہد میں ہاکی اور فٹ بال کا یہ ریکارڈ (Record) قابل لحاظ ہے۔

ایم۔اے۔او۔کالج اور اس کے کچھ دنوں بعد تک عام طور سے کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور ٹینس کو دوسرے کھیلوں کے مقابلوں میں ممتاز سمجھا گیا اور ایک طور پر اسپورٹ مین شپ (Sportmanship) کا تصور انھیں کھیلوں سے وابستہ رہا۔آج کل معلوم نہیں کتنے کھیل، کُل ہند، ہی نہیں بلکہ عالمی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔لیکن یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ کھیلوں کی تعداد اور دھوم دھام جتنی بڑھتی جارہی ہے اتنی ہی اسپورٹ مین شپ گرتی جارہی ہے اور ٹھیک بھی ہے ''کثرت اور وسعت'' سے معیار بالعموم گرتا ہے، اونچا نہیں ہوتا۔یہی بات شعر وادب میں بھی دیکھی جاتی ہے جو مدتوں سے ''عوامی بنو اور بناؤ'' کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔کھیل ہو یا تعلیم یا ڈسپلن یہ سب اندورنی ضبط ونظم سے ترقی کرتے ہیں بیرونی امداد یا استبداد سے ان میں تنزل آتا ہے ترقی نہیں!

---

[1] ٹروفیز (Trophies) یادگار فتح مجسمہ وغیرہ یا اور کوئی مستقل چیز

کھیل کے بعد کالج کی زندگی میں یونین (Union) کو بڑا دخل تھا۔ یونین کے وائس پریسیڈنٹ (اب پریسیڈنٹ) کا درجہ کرکٹ کیپٹن اور انگریزی کے اچھے مقرر کی حیثیت فرسٹ الیون (First.eleven) کے اچھے کھلاڑیوں کے برابر تھا۔ اردو کے اچھے مقرر کا درجہ انگریزی کے اچھے مقرر سے کم سمجھا جاتا تھا۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی رہا ہو کہ اس زمانے میں اور مدتوں بعد تک انگریزی کی منزلت زیادہ رہی۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اردو میں ٹھکانے کی تقریر کرنے والوں کی تعداد انگریزی میں تقریر کرنے والوں سے بہت زیادہ تھی۔ اس لیے جب تک کوئی شخص غیر معمولی طور پر اردو کا اچھا مقرر نہ ہوتا اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اس میں انگریزی کے سب سے اچھے مقرر ذاکر صاحب اور اردو کے مولانا سہیل تھے اور دونوں زبانوں میں ذاکر صاحب۔ عام خیال یہ تھا اور صحیح تھا کہ انگریزی یا اردو کا کیسا ہی زبردست مقرر کیوں نہ آجائے ذاکر صاحب اور سہیل صاحب علی گڑھ کی نمایندگی بہتر سے بہتر طور پر کریں گے۔ تقریر کے کیسے کیسے معرکے ان دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سر کیے جب اچھی تقریر کرنا قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا، اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔

1915ء یا 1916ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کا سالانہ اجلاس اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ مسلم اسکولوں کی طرف سے تقریری مقابلے میں حصہ لینے کے لیے پانی پت سے طلبہ کی جو ٹیم آئی تھی اس میں خواجہ غلام السیدین صاحب (موجودہ مشیر تعلیم حکومت جموں کشمیر) بھی تھے۔ شکل و شباہت پر امتداد زمانہ کا اثر پڑا بھی ہے تو صرف اتنا جتنا کسی کیمرے کی مدد سے بڑی تصور کو چھوٹی یا چھوٹی کو بڑی کر دینے سے پڑسکتا ہے۔ آواز البتہ ان کے اسکول ہی کے کسی ماسٹر کی آواز سے جب لڑکوں کو پڑھا نہیں دھمکا رہا ہو، لگا کھاتی تھی۔ سیدین صاحب کا بیان ہے کہ عربی حروف کو صحیح مخارج اور درشتی انداز سے ادا کرنے کی جو مشق اس وقت چڑھی ہوئی تھی انقلاب روس و روزگار سے باقی نہ رہی!

سیدین صاحب کی تقریر کا وہ سماں یاد ہے۔ اسٹریچی ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا کہیں کہیں سے چھلک بھی گیا تھا۔ اسکول کے ایک بچے کا اس خوبی، روانی اور دلیری سے علی گڑھ میں

تقریر کرنا عجیب سی بات معلوم ہوتی تھی۔ ہر شخص تعریف کر رہا تھا۔ سامعین میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی تھی جو ان کے والد خواجہ غلام الثقلین[1] مغفور سابق طالب علم کالج سے واقف تھے اور اکثر کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ باپ کا نام اور کام بیٹے کے حصے میں آئے گا۔ ایک صاحب جو حلیے سے خاصے مردم بیزار معلوم ہوتے تھے بولے "کچھ سمجھ میں نہیں آتا نامور اور نیک نام مسلمانوں کی اولاد اچھی خاصی نالائق پیدا ہونے لگی ہے۔ یہ لڑکا کیوں اور کیسے!"

ایک صاحب تقریر سنتے سنتے ساتھی سے کہنے لگے "بھئی واللہ کتنا چھوٹا لڑکا کتنی اچھی تقریر کر رہا ہے۔ اس ہال میں ایک سے ایک زبردست بولنے والا موجود ہے لیکن اس پر کسی طرح کا ہراس طاری نہیں۔ میں ہوتا تو منہ سے ٹھکانے کا ایک فقرہ نہ نکل سکتا۔" ساتھی نے کہا: "چپ ہو جاؤ۔ اب بھی ٹھکانے کا کون سا فقرہ زبان فیض ترجمان سے نکل رہا ہے۔ لڑکے کو کیا معلوم کہ ہال میں اچھی تقریر کرنے والے موجود ہیں اس کو تو صرف تمھاری موجودگی کا علم ہے!"

اسی زمانے کے آس پاس اسٹریچی ہال میں مسز سروجنی نائیڈو کی تقریر ہوئی۔ بجلی کی روشنی کا انتظام بھی انھی دنوں ہال میں پہلے پہل ہوا تھا۔ رات کے وقت تقریر ہوئی تھی۔ طلبہ اور اسٹاف (Staff) کے علاوہ علی گڑھ اور گردونواح کے اضلاع کے اشراف و اکابر شریک ہوئے تھے۔ کتنا جگمگاتا پر رونق شایستہ مجمع تھا۔ مسز نائیڈو تقریر کرنے کھڑی ہوئیں ذرا دیر مجمع اور ماحول کا جائزہ لیا، ان تمام "شیوہ ہائے بتاں" کے ساتھ جن کو کوئی نام نہیں دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ بھی جن کا نام دیا گیا ہے تھوڑی ہی دیر میں تقریر کا یہ عالم تھا کہ جس طرف موصوفہ کی نگاہ اٹھ جاتی تھی یا رخ پھر جاتا واقعی کچھ اس طرح کا رنگ نظر آنے لگتا جس کے بارے میں کہا گیا:

الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے [2]

---

1. خواجہ غلام السیدین 1904ء۔1976ء خواجہ غلام الثقلین کے بیٹے اور حالی کے پوتے۔

2. مکمل شعر:

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

مولانا سہیل نے اس موقع کی تصویر جس نظم میں کھینچی ہے وہ علی گڑھ والوں میں سے بہتوں کو اب تک یاد ہوگی۔

اتنی مختصر لیکن ہر اعتبار سے مکمل اور دلکش [1] نظم یا نغمہ مولانا سہیل بھی پھر کبھی نہ لکھ پائے۔ مسز نائیڈو نے بھی اس نظم اور مولانا سہیل کو تادم آخر ہر موقع پر یاد رکھا۔

---

[1] وہ نظم یہ ہے:

بہ شب چو مہر خاوری بروئے خود نقاب زد	زمانہ تاج سروری بہ فرق ماہتاب زد
شب از نشاط خرمی بکندرخت ماتمی	زمانہ فال بے غمی بہ عیش کامیاب زد
یکے خرد بہ سنگ زور حیق لالہ رنگ زد	یکے بہ چنگ چنگ زد یکے دم از رباب زد
یکے چو لالہ جام زد یکے چو سرو گام زد	طرف صلائے عام زد کہ فتنہ سر بخواب زد
یکے بہ چنگ وارغنوں بہ سیر باغ شد بروں	یکے بخانہ اندروں بہ باب زن کباب زد
یکے چوں سرو بوستاں بہ صحن باغ شد چماں	یکے بیاد دوستاں پیالۂ شراب زد
کنوں بہ چشم روشنی جو جلوہ زد سروجنی	فلک بہ سطح سوسنی بساط ماہتاب زد
تبسمش تکلمے، تکلمش ترنمے	سزد اگر تلاطمے بہ جان شیخ وشاب زد

شکست رنگ ساحری چو زد نوائے شاعری
نمودہ سحر سامری اگر در خطاب زد

ترجمہ: خوشی و مسرت کے وفور میں رات نے (اپنے جسم سے) ماتمی لباس اُتار پھینکا۔ زمانے نے بامراد خوشی و شادمانی سے طرب و بے غمی کی فال نکالی۔ کسی نے عقل کو پتھر پر دے مارا (یعنی خرد کو خیر باد کہا) (اور کسی نے) لالہ گوں شراب ناب سے جرعہ کشی کی۔ کسی نے ہاتھوں میں چنگ تھاما (اور) کسی نے رباب کی رفاقت اختیار کی۔ کسی نے لالہ کی طرح پیالہ کھینچا (اور) کوئی سرو کی طرح خراماں ہوا۔ ہر طرف صلائے عام ہوا کہ فتنہ فرو ہوا۔ کوئی چنگ و آرگن کے ساتھ باغ کی سیر کو باہر نکلا (اور) کسی نے گھر کے اندر (ہی) سیخ پر کباب لگایا۔ کوئی سرو چمن کی طرح صحن باغ میں لہرایا (اور) کسی نے دوستوں کی یاد میں جام و سبو کی محفل سجائی۔ جب سروجنی نے جلوہ دکھایا (تو) (ایسی خوشی و سرمستی کی فضا میں) مبارک باد پیش کرنے کے لیے آسمان نے بنفشی زمین پر چاندنی کا فرش بچھایا۔ ان کا (یعنی سروجنی کا) تبسم سراپا ایک تکلم ہے (اور) ان کی گفتار گویا ترنم کا آبشار ہے۔ اگر وہ کسی تلاطم کا درخور و سزاوار ہے (تو وہ ہے) جس نے پیر و برنا کی روح میں ہیجان برپا کر دیا ہے۔ جب اس نے شاعری کا ساز چھیڑا تو ساحری کا رنگ ماند پڑ گیا اور جب اس نے خطابت کے دروازے پر دستک دی تو سامری کا طلسم نمودار ہو گیا۔

تقریر ختم ہوئی تو کالج کے پرنسپل ٹول صاحب جو صدارت فرما رہے تھے، بڑے اعتماد واخلاص کے ساتھ اٹھے اور Thank you very much indeed Mrs. Naido کہہ کر بیٹھ گئے۔ مجلس برخاست ہوگئی! ہم سمجھتے تھے کہ تقریر کے جواب میں موصوف کچھ کہیں گے اور کچھ دیر تک کہتے رہیں گے، لیکن ان کی اس مختصر کلامی سے ہم سب متحیر رہ گئے! چنانچہ ایم۔اے۔او۔کالج میں جب کسی بات کو اکتا کر یا بغیر کسی التفات کے طنزاً یا مزاحاً ختم کر دینا ہوتا تھا تو ٹول صاحب کا یہ فقرہ دہرایا جاتا، جو مدتوں کالج میں زباں زد رہا۔ صاحبان ذوق اس کا استعمال اس لطف اور برجستگی سے کرتے کہ جس پر یہ سر کیا اس کے خفیف اور خاموش ہو جانے کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ بڑے سے بڑے بور (Bore) وبال جان کو اس فقرے سے پسپا کر دیتے تھے۔

شاید اسی سال یا اس کے بعد سید حسین مرحوم اولڈ بوائز (Old Boys) کے سالانہ [1] اجتماع کے موقع پر علی گڑھ تشریف لائے اور تقریر فرمائی۔ مسز نائیڈو بھی تشریف لائی تھیں۔ سید حسین صاحب کی تقریر کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ خود مسز نائیڈو کا وہ عالم ہوا جو ہم سب کا موصوفہ کی تقریر سن کر ہوا تھا۔ تا بہ دیگراں چہ رسد! اس وقت تک یہ کہا جاتا تھا کہ اولڈ بوائز میں مولانا محمد علی اور سید حسین انگریزی کے سب سے ممتاز مقرر تھے۔

---

[1] سید حسین (1948) علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے۔ ان کا شمار علی گڑھ کے بہترین مقررین میں ہوتا ہے ان کا تعلق بنگال سے تھا، نواب محمد آزاد کے بیٹے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو کے اخبار (Independent India) کے ایڈیٹر تھے ممبئی کرانیکل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔ ہوم رول لیگ کے نائب صدر رہے۔ محمد علی جناح کی سربراہی میں 1919ء میں خلافت کمیٹی کا وفد لندن گیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے۔ 1937ء میں جلا وطن رہے۔ امریکہ میں کسی یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب اور فلسفے کے پروفیسر رہے۔ 1945ء میں واپس ہندوستان آئے۔ 1945ء میں مصر میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے، جہاں 1948ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سید حسین کا بیسویں صدی کے پہلے نصف میں مسز وجے لکشمی پنڈت سے دوستانہ روابط کا بہت چرچا رہا۔ وجے لکشمی پنڈت نے اپنی خودنوشت میں اس ذہنیت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے دو محبت کرنے والوں پر زندگی تلخ کر دی جاتی ہے۔

کالج اور یونی ورسٹیوں میں طلبہ کی یونین (Union) کو جو حیثیت آج کل حاصل ہے وہ پہلے نہ تھی۔ نیز طلبہ نے جو مسائل اب اپنا لیے ہیں اور کون سے ایسے مسائل ہیں جو اپنانے سے رہ گئے ہیں، ان کی طرف پہلے کبھی وہ اس درجہ مائل نہ تھے۔ اس پر نہ ماتم کرنے کی ضرورت ہے نہ فخر، اور جس بات پر نہ ماتم کرنا لازم آتا ہو نہ فخر، اس پر غور کرنا بھی کچھ اتنا ضروری نہیں رہ جاتا۔ یہ زمانے کے نشیب و فراز ہیں جن سے:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے 1

سبھی ساز و ستیز کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ کہنا یہ تھا کہ اس زمانے کی یونین سے کس طرح کے کردار نمو پاتے تھے اور زندگی اور شعر و ادب میں ان کا کیا مقام ہوتا اور اب کس طرح کے کردار ابھرتے ہیں اور زندگی میں کیا مرتبہ حاصل کرتے ہیں!

پہلے زمانے میں طلبہ سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے ہاتھ میں اتنے نہ تھے جتنے اب ہیں۔ گو اس بارے میں خود لیڈر کچھ اس طرح کی فریاد کرتے پائے گئے ہیں:

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا 2

اور اکثر دیکھنے میں بھی یہ آیا ہے کہ جس بار نے لیڈر پر بھی گرانی کی اس کو یہ ناتواں (طالب علم) اٹھا لیتے ہیں۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں نعروں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اب نعرے کی طاقت مسلّم ہے۔ ظاہر ہے پہلے ہم محکوم و منکوب تھے، اب قومی اور انفرادی آزادی کا شعور پیدا ہو گیا ہے۔ شاید اسی لیے یہ نعرہ و نفرین! لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج سے پہلے ہمارے نوجوان خاندان کی اعلیٰ روایات کو ایک قیمتی ترکہ سمجھ کر اس کی پیروی یا اس کا

---

1 مکمل شعر اس طرح ہے:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

2 مکمل شعر اس طرح ہے:

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

احترام کرتے تھے اور معمولی سے معمولی خاندان بھی ایسا نہ تھا جو کسی صالح وصحت مند روایت کا کسی نہ کسی حد تک حامل نہ ہو۔ رفتہ رفتہ یہ بات ختم ہو گئی۔ چنانچہ اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ایسی قیمتی متاع باقی نہ رہ گئی ہو جس کے تحفظ یا ترقی کے لیے کسی کو اپنی بہتر صلاحیتیں بروئے کار لانے کی فکر ہو۔ چاہے وہ طالب علم ہو چاہے ممبر اسٹاف!

دوسری بات یہ ہے کہ گذشتہ زمانے میں نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجے کا انتظار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس سے ان میں بے صبری، بے اعتمادی یا غیر ذمے داری کے جذبات پیدا نہیں ہونے پاتے تھے۔ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچنے کا سب سے آسان اور زود اثر نسخہ یہ ہے کہ ان کو جارحانہ بلکہ مجرمانہ اقدام کی دعوت دی جائے۔ گذشتہ بیس پچیس سال سے ان کو یہی راستہ دکھایا گیا ہے۔ اس میں اشتراکیت، مذہبیت، قومیت سب نے حسب توفیق حصہ لیا ہے۔ ظاہر ہے جہاں انقلاب کو دعوت دینے اور بغاوت کرنے کا اذن عام ہو وہاں ریاضت اور انتظار کو کون قابل التفات سمجھے گا! جہاں محاسبہ ختم ہوا مجادلہ شروع ہو جائے گا!

یہاں ایک اور مسئلہ قابل توجہ ہے۔ انسان کی صالح وصحت مند زندگی کا مدار اس پر ہے کہ اس کے یہاں اقدار کی اہمیت کیا ہے اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیروزبر نہ ہوں۔ یا اقدار نتیجہ ہوتے ہیں، مدتوں کے تجربے اور ریاضت کا۔ زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدار وہی کام کرتے ہیں جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں۔ آج سے پہلے زندگی میں "وہ مرکز گریز" سرعت اور شدت نہیں تھی جو اب ہے اور یہ آئی ہے عقل چکرا دینے والی اس صدی کی ان ایجادات سے جنھوں نے زندگی کی آنے والی صدیوں کو مہینوں اور ہفتوں میں سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ مستقبل کو حال میں کھینچ لانے کی مدت جتنی مختصر کرتے جائیں گے اتنی ہی جلد جلد حال ماضی میں منتقل ہوتا رہے گا اور ماضی کی قدروقیمت کم ہوتی جائے گی۔ جہاں اور جب یہ صورت حال ہوگی، وہاں زندگی میں اختلال راہ پائے گا اور غیر یقینی بڑھے گی۔ آج کل ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔

میرا کچھ ایسا بھی خیال ہے کہ سرمایہ و مزدور، زمین دار اور کسان ظالم و مظلوم اور متعلقہ مسائل کی اتنی مذمت کی گئی ہے کہ اب ہر کس و ناکس خواہ وہ مستحق ہو یا نہیں، غیر شعوری طور پر سمجھنے لگا ہے اور اسی پر یقین رکھتا ہے کہ وہ مدد کا مستحق (ناجائز مدد کا خاص طور پر) ہے اس میں امیر، غریب، مقتدر، غیر مقتدر، مرد و عورت، نوجوان بوڑھے، کسی کی قید نہیں۔ چنانچہ اپنی دشواریوں کو محنت اور ایمانداری سے دور کرنے کے بجائے تقریباً ہر شخص یہ ماتم یا شکایت کرتا نظر آتا ہے کہ دوسرے اس کا حق غصب کر رہے ہیں۔ جیسے کسی خواہش کا پیدا ہو جانا اس کے پورا کیے جانے کے لیے سند جواز ہو اور جس شخص کی اس طرح کی خواہش پوری نہ کی جا سکے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ سوسائٹی پر لعنت بھیجے اور قانون اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔ اس طرح سے ہمارے ہر سوچنے کے انداز سے ہمارے ہر چھوٹے بڑے میں ذمے داری کا احساس کم اور ناحق کوشی کا بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کا اثر ہماری قومی سیرت اور ہمارے شعر و ادب میں بھی نمایاں ہے۔ جس سوسائٹی کا یہ حال ہو وہاں خیر و برکت کی توقع کون کر سکتا ہے!

اس زمانے میں یونین کا احترام ان مسائل اور افراد سے زیادہ اہم خیال کیا جاتا تھا جو یونین میں زیر بحث آتے یا اس میں حصہ لیتے۔ محض موضوع بحث یا مقرر کی شخصیت یا پارٹی کی طاقت فیصلہ کن نہ ہوتی زندہ باد اور مردہ باد کے نعروں سے کام نہیں چلتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ یونین میں بحث مباحثے کی حیثیت محض ''آرٹ برائے آرٹ'' تھی اور اب اس کی سرگرمیاں زندگی کے ٹھوس یا تلخ حقائق کی ترجمان ہیں۔ پارٹیوں کی کشاکش اس عہد میں بھی تھی اور کہاں نہیں ہوتی، لیکن پہلے یہ کالج کے اعلیٰ مقاصد کے تابع ہوتی تھیں اور ان کی تگ و تاز بالعموم کالج کے اندر محدود ہوتی۔ یونین یا کالج کو کسی ذاتی یا بیرونی مقاصد کے حصول کا آلہ نہیں بنایا جاتا تھا۔

ایک واقعہ کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ کی سیرت و شخصیت کا اثر یونین اور یونین کا طلبہ پر کتنا گہرا تھا۔ یونین کے الیکشن (Election) میں اس شخص کا ناکام رہنا یقینی تھا جو اپنی ذاتی قابلیت یا اچھی سیرت کے سوا کسی اور سہارے کا متلاشی ہوتا۔ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ کوئی شخص محض اس بنا پر منتخب ہو جائے کہ وہ ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی،

سندھی، پنجابی یا کسی ذی اقتدار طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ کالج میں داخل ہوا تو ایک الیکشن کا بڑا چرچا تھا جو کسی رئیس کے روپے، اثر و اقتدار سے جیتا گیا تھا۔ اس کا ردِ عمل ایسا ہوا کہ پھر امرا کے طبقے سے کوئی امیدوار کابینہ تک کے لیے منتخب نہ ہو سکا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس طبقے کا کوئی فرد یونین کے عہدے کے لیے کھڑا ہوتا سب سے پہلے اسے ''ترکِ نسب'' کا اعلان کرنا پڑتا۔

ان باتوں کے اظہار سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ اس زمانے میں یونین کا الیکشن بے عنوانیوں سے پاک ہوتا تھا۔ زندگی کی کوئی خوبی یا خرابی ایسی نہیں ہے جو تمدنی زندگی کے پہلے دن سے آج تک کسی شکل میں کسی نہ کسی حد تک چھپی یا کھلی ہر جگہ موجود نہ ہو، البتہ یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں ان بے عنوانیوں کی نوعیت ایسے فتنے اور فضیحتے سے پاک ہوتی جن سے ادارہ یا قوم کی نیک نامی پر حرف آتا ہو۔ بحیثیت مجموعی میں اس درس گاہ کی صحت مند یا غیر صحت مند فضا کی نشانی اس میں تلاش کرتا ہوں کہ یونین کے الیکشن میں امیدوار کس چیز کا سہارا پکڑتے اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اپنی ذہنی اور اخلاقی برتری اور ادارے کی علمی اور اخلاقی منزلت کا، یا مذہب و مسلک کے اختلافات اور ذاتی یا بیرونی اغراض و مقاصد کی حمایت کا۔ ظاہر ہے ان دونوں میں بہتر صورت کون سی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے یونین کا الیکشن زور پر تھا۔ ایک پارٹی کمزور پڑ رہی تھی جس کا ''جنرل اسٹاف'' (General Staff) بڑے تردد میں مبتلا تھا کہ صورتِ حال پر کس طرح قابو پایا جائے۔ آخر میں ایک صاحب جن کی حیثیت پارٹی کے ذہن و دماغ کی تھی اس مہم کو سر کرنے نکلے۔ انھوں نے فریقِ مخالف کے ایسے لوگوں کو تاکا جو بڑے جوشیلے کارکنوں میں تھے اور اپنے امیدوار کی حمایت میں سب کچھ جس میں عقلِ سلیم بھی شامل تھی داؤ پر لگا دینے کے لیے آمادہ تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے ہیرو کا قصیدہ پڑھنا شروع کیا اور حریف کے امیدوار کی شان میں کچھ اشتعال انگیز کلمات کہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فریقِ مخالف کے ایک کارکن نے ان کے ایک چانٹا رسید کر دیا۔ اس کی خبر چشم زدن میں سارے کالج میں پھیل گئی اور اس ''نازیبا حرکت'' پر نفرت و نفریں کا ایسا طوفان برپا ہوا کہ فریقِ مخالف الیکشن ہار گیا۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اس عہد میں تقریر کے فن کو بڑا ممتاز درجہ دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں جتنے اچھے بولنے والے تھے ان میں سے بیشتر کی تقریر سننے کا علی گڑھ میں اتفاق ہوا۔ لیکن آج شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ یونین کے وائس پریسیڈنٹ، سکریٹری یا کالج کے بعض طالب علم مقرروں کی جو تقریریں ان مواقع پر کسی نہ کسی حیثیت سے ہوتی وہ ایسی اچھی ہوتی کہ مہمان بے اختیار داد دیتا اور یقیناً اس لیے نہیں کہ ایک طالب نے تقریر کا اچھا نمونہ پیش کیا تھا بلکہ جو تقریر کی گئی تھی وہ فنی اعتبار سے مکمل ہونے کے علاوہ سنجیدہ اور پرمغز تھی۔ کالج کے زمانے میں ممبران اسٹاف (staff) سے کہیں زیادہ تعداد میں طلبہ اچھے مقرر تھے۔

کالج میں طلبہ کے علاوہ اسٹاف میں دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے کی شہرت حاصل تھی۔ ایک تاریخ کے پروفیسر اے۔ ایف رحمٰن بی۔ اے (آکسن) ممبر لیجسلیٹو کونسل اور ممبر پبلک سروس کمیشن جن کا نام ''میگزین'' کے سلسلے میں آچکا ہے۔ جلپائی گوڑی (بنگال) کے بڑے اونچے اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ گورنمنٹ نے ''سر'' کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ دوسرے پروفیسر انعام اللہ خاں جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ اولڈ بوائے کی حیثیت سے عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ علی گڑھ سے شیفتگی پیدا کرنے میں صدیقی صاحب کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ کچھ دنوں کے لیے غالباً آنریری سکریٹری کے پرسنل سکریٹری ہو گئے تھے۔ بڑے قابل، دلیر، ذہین، طباع اور نرم و نازک نقشے کے خوش رو نوجوان تھے۔ انگریزی میں لاجواب تقریر کرتے تھے۔ اس عہد کی جماعت احرار سے تعلق رکھتے تھے اس لیے کالج کا یورپین اسٹاف ان سے بدگمان رہتا۔ بہ ایں ہمہ ان کی عزت بھی کرتا تھا۔ گھومتے پھرتے کبھی بورڈنگ ہاؤس میں آنکلتے تو طلبہ ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ صدیقی صاحب ہر ایک سے لطف و محبت کا کوئی فقرہ ضرور کہتے اور واقعی بڑے بھائی کی طرح شفقت فرماتے۔

وہ علی گڑھ پر نکتہ چینی کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان جیسا علی گڑھ کا شیدائی بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان میں ایک بات جو میں نے بڑی عجیب اور دل نواز پائی وہ یہ تھی کہ علی گڑھ کے اعلیٰ اور اوسط طبقے سے قطع نظر جن کی وہ اکثر خبر بھی لے لیا کرتے تھے۔ یہاں کے

دھوبی، باورچی، بھنگی، بیرر، حجام، چپراسی، ڈاکیہ، خوانچہ فروش سے وہ جتنی محبت کرتے تھے اور ان کو یاد کرتے تھے شاید کسی علی گڑھ والے نے کبھی کیا ہو۔ جہاں کہیں ہوتے اور علی گڑھ کا کوئی مل جاتا تو وہ اپنے زمانے کے چھوٹے بڑے لوگوں کا نام بہ نام حال پوچھتے اور ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی لطیفہ ضرور سناتے۔

انعام اللہ خاں صاحب بہار کے رہنے والے تھے، بڑے شریف النفس، سادہ مزاج لیکن اتنے ہی جذباتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس بات پر کس سے کب بے حد خفا یا بے حد خوش ہو جائیں گے۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے کھانا کھلانے یا یوں کہیے کہ انڈے کا خاگینہ کھلانے کا بڑا شوق تھا۔ جو تلا ہوا کم جھلسا ہوا زیادہ ہوتا تھا۔ دسترخوان کا کام اسٹیٹسمین (Statesman) کے اوراق سے لیتے جن کو بچھاتے وقت بڑی سنجیدگی سے کہہ دیا کرتے کہ صحیح انگریزی لکھنے کی آرزو ہے تو اسٹیٹسمین ضرور پڑھا کرو۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کہہ دینے سے معذرت کا حق کس طرف سے ادا ہو جاتا تھا۔ میزبان، دسترخوان یا اسٹیٹسمین کی طرف سے۔ پان کثرت سے کھاتے تھے اور بڑے اصرار سے کھلاتے تھے، جس میں کتھے چونے کی تہمت کے علاوہ صرف چھالیے کا ایک ٹکڑا ہوتا۔ وہ بھی اتنا بڑا کہ پان اس کو ملفوف نہ کر پاتا تھا۔ اس سے پان کے سائز کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پان کاربولک صابن کے خالی ڈبے میں رکھے ہوتے۔ لباس نہایت معمولی درجے کے کپڑے کا ہوتا ضرورت سے زیادہ لمبی شیروانی سیاہ سوسی کا اٹنگا پاجامہ دائیں بائیں جھومتے چلتے اسی انداز سے ترکی ٹوپی کا پھندنا ہچکولے کھاتا۔ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنستے اور کبھی کبھی معلوم نہیں پیچ آن پڑتا کہ یکا یک بریک (Brake) لگا دیتے اور کسی دوسرے عالم میں پہنچ جاتے۔ یہ وقت مخاطب کے لیے اندیشہ ناک ہوتا۔ اکثر فضا جلد ہی نکھر جاتی لیکن ایسا نہ ہوتا تو کسی نہ کسی بہانے ورنہ آنکھ بچا کر رخصت ہو جانے ہی میں خیریت ہوتی۔

اپنے عہد کے بڑے ممتاز اور مقبول معلموں میں سے تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے کچھ دنوں اتالیق رہے۔ اپنی ٹم ٹم پر ان کو کالج لاتے تھے۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ٹم ٹم کم تھی ٹم ٹم کا فریم زیادہ تھی ہر طرح کے گدے پوشش سے قطعاً بے نیاز جیسے تیاری سے پہلے ہی پروفیسر صاحب نے بنانے والے کی دکان سے منگالی ہو، یہ گاڑی ٹھیک وقت پر مغربی پکی

بارک کی پشت پر سے بے تحاشا گرد اڑاتی گزرتی تھی۔ باگ اور کوڑا پروفیسر صاحب کے قبضے میں ہوتے تھے اور گھوڑا اپنے قبضے میں۔ واقعہ یہ ہے کہ کوڑا اور باگ دونوں بے ضرورت تھے اس لیے کہ گھوڑے کی رفتار، سمت، رکنا، روانہ ہونا سب بجلی کی ٹرینوں کے مانند تھا۔ یعنی کھڑے کھڑے بھاگنے لگیں، ورنہ رک گئیں۔

بھاگتی ہوئی ٹم ٹم اور اس پر بیٹھی ہوئی سواریاں دور سے ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے دیسی آتش بازی کا ایک بہت بڑا چکر سا ہوتا ہے۔ جس میں طرح طرح کے انار چرخیاں پٹاخے، گولے جہاں تہاں لگے بندھے رہتے ہیں۔ فلیتہ داغ دینے پر اس چکر اور اس کے متعلقین و متوسلین کا جو حال ہوتا ہے وہی اس ٹم ٹم کا نظر آتا۔ کوچوان کے نام سے 5-6 سال کا ایک لڑکا بھی گاڑی میں ایک طرف لٹکا نظر آتا تھا جیسے سفر میں لوگ بستر سے ٹین کا لوٹا لٹکا لیتے ہیں۔ لاغر اندام، سیاہ فام، جسم پر ایک ناتمام لنگوٹی، اتر کر گھوڑے کی لگام پکڑ لیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے گھوڑے کے منہ پر دانے کا توبڑا چڑھا دیا گیا ہو۔

انعام اللہ خاں صاحب انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ پرانے انداز کی مرصع و مقفیٰ انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے تھے۔ منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے۔ ایک دفعہ مجھ سے منطق کے کلاس میں برہم ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سبق سنانے کی میری باری آئی۔ منطق مجھے پسند نہیں اس لیے کہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جدا ہوتی ہے۔ رٹنے سے یوں گھبراتا ہوں کہ اس میں مجھے متشابہ بہت لگتا ہے یعنی غزل پڑھتے پڑھتے اللہ رسول کا ذکر آ جائے تو مناجات شروع کر دیتا ہوں۔ حال ہوا یہ کہ میں نے لکھائے ہوئے نوٹ میں اپنی طرف سے پیوند لگانے شروع کر دیے۔ وہ بھی اس طرح کہ اکثر پیوند کا سائز (Size) اصل سے بڑھ جاتا اور پیوند بھی جگہ جگہ سے خستہ و خوار۔ اس پر ایک لخت کتاب بند کر دی اور بڑی سنگلاخ انگریزی اور خشم ناک لہجے میں فرمایا۔ ''دیکھو جی یا تو انعام اللہ خاں سے اچھی انگریزی لکھو اور بولو یا پھر انعام اللہ خاں کی انگریزی رٹو۔ بیچ کا کوئی راستہ نہیں''۔ یہ تنبیہ اپنی کلاس کے طالب علموں کو وقتاً فوقتاً دیتے رہے۔ پروفیسر صاحب کے لیے اردو ترجمے کا کام میں نے جس قدر کیا اور موصوف سے جتنی تحسین حاصل کی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ کہا کرتے تھے

تمھاری اردو میں مجھے اپنی انگریزی کا مزہ آجاتا ہے میں دم بخود ہوجاتا تو انڈے کھلانے کی دعوت دے دیتے۔ طالب علمی اور ڈائننگ ہال کے زمانے میں یہ سودا میرے لیے بڑی کشش رکھتا تھا۔

پروفیسر اے۔ ایف رحمٰن بڑے شرمیلے شایستہ اور شریف انسان تھے۔ متانت اور تہذیب جیسے ان پر ختم ہوگئی ہو۔ نظر نیچی رکھتے۔ گفتگو کرتے اور کلاس میں لکچر دیتے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے۔ قیمتی اور اچھے سلے ہوئے سوٹ پہنتے تھے۔ تقریر لباس اور دوسرے طور طریقوں میں اکثر طلبہ ان کی ریس کرتے تھے۔ جس طرح اپنے کو لیے دیے رہتے تھے ویسے ہی دوسروں کے مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ بے تکلف اور بے محابا اپنے ہم چشموں سے بھی نہ ہوتے تھے۔ انگریزی شیریں اور شائستہ لہجے میں بولتے تھے اور کبھی کوئی ایسا لفظ یا فقرہ منہ سے نہ نکالتے جس کے ثقہ یا معیاری ہونے میں شبہ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انگلستان میں انھوں نے میل جول صرف طبقۂ اشراف ہی سے رکھا تھا۔ رہن سہن، وضع قطع، رکھ رکھاؤ کی جو سطح اپنے لیے پہلے دن مقرر کر لی تھی آخر دن تک قائم رکھی۔ لڑکوں کے اصرار پر یونین کے مباحثوں میں شریک ہونے کے لیے اکثر آجاتے۔ ایسے موقع پر طلبہ پروفیسر انعام اللہ خاں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے یونین لاتے اور مباحثے کو ترتیب اس طرح دیتے کہ دونوں ایک دوسرے کی مخالفت میں تقریر کریں۔

ایسے مواقع پر بحث میں حصہ لینے کے لیے کالج کے تمام اچھی تقریر کرنے والے طلبا موجود ہوتے اور پوری تیاری کے بعد تقریر کرتے۔ اس لیے کہ اس تقریر کا اثر بڑا پائیدار اور دوررس ہوتا اور کالج کے تمام طلبہ اس شوق سے اور کثرت سے یونین میں جمع ہوتے تھے جیسے آج کل کسی مشہور فلم دیکھنے کے لیے سنیما ہاؤس (Cinema House) پہنچتے ہیں۔ بحث کی ابتدا بالعموم انعام اللہ خاں صاحب کرتے۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ آخر میں ان کی جوابی تقریر سننے میں آئے جب موصوف اصلی ''موڈ'' (Mood) اور پورے ''فارم'' پر ہوتے پروفیسر رحمٰن اپنی تقریر میں کسی پر نکتہ چینی نہ کرتے لیکن امور تنقیح طلب کی وضاحت اس طرح کرتے کہ فریق مخالف کے تمام اعتراضات کا جواب آجاتا۔ انعام اللہ خاں صاحب کی انگریزی تو ادق ہوتی ہی۔

اس سے زیادہ جر نقیل میتھالوجی (علم الاصنام) کے وہ حوالے ہوتے جو وہ اپنی طنز وظرافت کو موثر بنانے کے لیے ملٹن اور دانتے وغیرہ سے بے تکلف پے چنے جاتے تھے۔

مسٹر رنیل انگریزی کے بڑے قابل پروفیسر تھے۔ دوسرے انگریز پروفیسر بھی ان کی زبان دانی کے معترف تھے۔ اس زمانے میں انگریزی میں ممتاز ہونے کا شوق اس درجہ عام تھا کہ جو طالب علم رنیل صاحب کے کلاس یا ٹیوٹوریل گروپ میں ہوتا اس کے بارے میں یہ حسن ظن عام ہوتا کہ اس کی انگریزی اچھی ہے۔ قاعدے قانون کے خود بڑے پابند تھے اور دوسروں سے پابندی کرانے میں کسی طرح کی رورعایت گوارا نہ کرتے۔ اس کے صلے یا پاداش میں وہ ایک دفعہ کچھ ناخوش گواریاں بھی پیش آئیں۔ لیکن بحثیت مجموعی رنیل صاحب کا وقار طلبہ میں جوں کا توں رہا۔ ڈائننگ ہال کی نگرانی کا کام بھی کبھی کبھی سپرد ہو جاتا اور جس دن اس کی بھنک مل جاتی کہ رنیل صاحب کھانے کے وقت ڈائننگ ہال آئیں گے اس دن ڈائننگ ہال سروس روم (Service Room) باورچی خانہ، مانیٹر طلبہ سب ہی ''اٹینشن'' (Attention) ہو جاتے اور اس قاعدے کا ڈائننگ ہال ہوتا کہ ہم سب یہ محسوس کرتے کہ کسی انگریزی لنچ یا ڈنر میں شریک ہیں۔

اتفاق سے ایک دن کلاس دیر سے پہنچے۔ لڑکے جا چکے تھے۔ دوسرے دن آئے تو کہا جب تک تم کو یہ نہ معلوم ہو جایا کرے کہ میں رخصت پر ہوں یا مر گیا اس وقت تک میری کلاس نہ چھوڑا کرو اور یہ انھوں نے صحیح کہا۔ کلاس وہ اسی پابندی سے لیا کرتے۔ یورپین اسٹاف نے متفق ہو کر استعفا دے دیا تھا۔ رنیل صاحب شام کی گاڑی سے علی گڑھ چھوڑنے والے تھے، اس دن بھی انھوں نے حسب معمول کلاس لی اور پوری توجہ سے آخری منٹ تک پڑھاتے رہے۔ گھنٹہ بجا اور کلاس سے جانے لگے تو کتاب بند کی اور بولے ''حضرات خدا حافظ'' اور یہ پہلا موقع تھا جب ہم سب نے محسوس کیا کہ رنیل صاحب کی آواز کسی قدر گلوگیر تھی۔

ہم سب کے اصرار پر ایک دن مباحثے میں شریک ہونے آئے تقریبا آدھ گھنٹہ بولے۔ اس درجہ رک رک کر اور فقروں کو تول تول کر کہ یہی تقریر اوسط درجے کا مقرر زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں کر ڈالتا۔ سامعین سے قطع نظر خود مقرر کے بشرے سے اس کا اظہار نہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے نہیں تو اپنے ہی اکتانے کا احساس رکھتے ہیں۔ تقریر ختم کی تو معذرت کا کوئی فقرہ تک

نہیں کہا۔ کچھ دنوں بعد اپنی تقریر کا تذکرہ خود کیا اور فرمایا "اس رات سوا میرے تم سب میرے تقریر سے اکتانے لگے تھے۔ میں اس لیے نہیں اکتایا کہ مجھے اپنی ذمے داری کا احساس تھا۔ میں جانتا ہوں کہ طلبہ میرے کہنے کو صحیح مانتے ہیں اس لیے میں احتیاط رکھتا ہوں کہ جو بات کہوں یا لکھوں وہ ہر اعتبار سے صحیح اور مناسب حال ہو۔ استاد کی بتائی باتیں ہر طالب علم نہیں تو کسی نہ کسی طالب علم کے دل میں بغیر اس کے ارادے کے گھر کر لیتی ہیں۔ اس لیے استاد کو بڑا محتاط رہنا چاہیے۔

تین چار گھنٹے تک اچھی تقریروں، برجستہ پوائنٹس آف آرڈر (Points of Order) اور شوخ شائستہ نوک جھونک کا سلسلہ قائم رہتا۔ جلسہ ختم ہو جاتا اور لڑکے جائے قیام کی طرف مراجعت کرتے تو ہر بولنے والے کی تقریر کے نقص و ہنر پر اس خوبی سے رائے زنی کرتے کہ آپ جلسے میں نہ بھی شریک ہوئے ہوں تو اس کے ریمارکس (Remarks) سن کر یونین کی پوری کارروائی سے واقف ہو سکتے تھے۔ اس طرح یونین نے اپنی خدمات کی ایک قیمتی روایت قائم کر دی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یونین میں کبھی کوئی ایسی بات گوارا نہیں کی گئی جو کالج کے مفاد و مقاصد کے منافی ہوتی!

بعض دوسرے اساتذہ کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ عربی کے مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر ہارونز (Dr.Horwitz) میرے علی گڑھ آنے سے قبل یورپ واپس جا چکے تھے۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے پروفیسر اسٹوری (Prof.Storey) ڈاکٹر ٹرٹین (Dr.Ttritton) اور ڈاکٹر اسپیز (Dr.Ottspies) آئے موخر الذکر دونوں اصحاب یونی ورسٹی پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ ان سب نے عربی کے ہندستانی ہم عصر اساتذہ سے بڑی محنت و عقیدت سے استفادہ کیا اور اب یورپ کی بعض بلند پایہ یونی ورسٹیوں اور کتب خانوں کے جید مستشرق مانے جاتے ہیں۔ آج کون اسے سنے یا مانے گا کہ یورپ کے یہ مشہور عالم فضلاء علی گڑھ ہی کے فیض یافتہ ہیں!

مولانا عبدالحق حقی بغدادی[1] عربی کا درس غالباً برکت علی خاں لکچر روم میں دیا کرتے۔ وہی وقت اسٹریچی ہال میں ٹول صاحب کے اکنامکس کے لکچر کا ہوتا۔ مولانا حقی کی

---

[1] مولانا عبدالحق حقی بغدادی۔ م 1925ء

کلاس میں چار پانچ ہی طلبہ ہوتے جو بہت قریب بیٹھے ہوتے لیکن مولانا پڑھاتے اس بلند آواز سے تھے کہ وکٹوریہ گیٹ تک آواز صاف سنائی دیتی۔ ٹول صاحب پرنسپل تھے مگر انھوں نے کبھی کوئی تعرض نہ کیا۔ کلاس میں ہم کو بسا اوقات گھبراتے دیکھ کر کبھی کبھی تھوڑی دیر لیکچر دینا بند کر دیتے پھر شروع کر دیتے بالآخر موصوف نے اپنے ہی لیکچر کا وقت بدل دیا۔ ایک دفعہ البتہ فرمایا: "میں مولانا کے طاقتور پھیپھڑوں پر رشک کرتا ہوں۔" ایک طالب علم نے کہا: جناب والا ہم بھی یہی کرتے ہیں۔ لیکن اپنے ان ساتھیوں کے کان کے پردوں پر بھی جو مولانا کے درس میں ہوتے ہیں۔" ٹول صاحب نے زہر خند فرمایا ہم سب دم بخود رہ گئے اس لیے کہ ٹول صاحب کے سامنے لب کشائی ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی تاوقتیکہ وہ کوئی مہا مسخرا نہ ہوتا یا غیر معمولی کھلاڑی یا یونین کا مقرر۔

اسٹوری صاحب عربی کے استاد ہونے کے علاوہ غالباً لٹن لائبریری کے چیئرمین بھی تھے۔ موصوف ہر سہ پہر کو گھوڑے پر سوار لائبریری کا کام دیکھنے آتے اور سائیس ساتھ ہوتا۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ گھوڑا لائبریری کے برآمدے کے زینے سے نیچے نہیں اترتا۔ اسٹوری صاحب ہر طرح کی کوشش کر رہے تھے لیکن گھوڑا زینے کے پاس آکر رک جاتا اور پھر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ایسا تماشا کب دیکھنے کو ملتا تھا۔ طلبہ کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ عجب دھاچوکڑی مچی ہوئی تھی۔ کسی نے صاحب سے فرمائش کی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جائیے، ہم لوگ نیچے سے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہیں۔ چنانچہ یہی کیا گیا گھوڑے نے زور لگایا تو سب کے سب لگام تھامے برآمدے میں کھنچتے چلے آئے۔ اس پر پورے مجمع نے قہقہہ لگایا تو گھوڑا بدکا اور اسٹوری صاحب اور زیادہ شرمندہ اور پریشان ہوئے۔ بالآخر ایک صاحب نے سب کو ڈانٹا اور ایک طالب علم کو دوڑایا کہ صاحب کے سائیس کو فوراً بلا کر لاؤ۔ سائیس آیا تو نہایت اطمینان سے اپنے کندھے پر سے جھاڑن اٹھا کر گھوڑے کی دونوں آنکھوں پر رکھی اور بڑی آسانی سے برآمدے سے اتار لایا۔ ایک شوخ لڑکے نے اسٹوری صاحب کو مخاطب کر کے کہا جناب والا "سینسی علم دریاؤ ہے" موصوف کو اس کہاوت کا مفہوم طرح طرح سے سمجھایا گیا لیکن نہ سمجھے نہ پھر کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر لائبریری تشریف لائے!

مسٹر ڈیوڈ آکٹرٹونی (Mr.David Auchtertonie) فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ہمارے گروپ نے شیکسپیر کے ڈرامے بی۔ اے میں تین انگریز پروفیسروں سے

پڑھے اور ان کی ٹیوٹوریل کلاس میں رہے یعنی پروفیسر ڈی۔ رینل (Prof.D.Reynell) پروفیسر آکسٹرٹونی اور پروفیسر پرویس (Prof.S.O.Purvis) جن کی ہیئت عمر اور ڈیل ڈول دیکھ کر سارا کالج پروفیسر پرویس کے بجائے پاپا پرویز کہتا تھا۔ پروفیسر آکسٹرٹونی کے بارے میں کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا موڈ انگلستان کے موسم کی مانند کب کیا ہو جائے گا۔ ہماری سائڈ کے ٹیوٹر تھے۔ ٹیوٹر کو اس زمانے میں کم و بیش وہی اختیارات حاصل تھے جو آج کل پرووسٹوں کو ہیں۔ فرق اگر ہے تو غالباً اتنا کہ اس عہد کے طلبہ بورڈنگ ہاؤس کے معاملات میں شاذ و نادر اپنے ٹیوٹر کا سامنا کرتے۔ بہت کچھ رفت و گذشت تو مانیٹر کر دیتا۔ کبھی کبھی اس سے آگے اسسٹنٹ ٹیوٹر تک پیشی ہو جاتی۔ ٹیوٹر کا سامنا طالب علمی کی زندگی کے ''سانحات'' میں ہوتا۔ اس کا ایک سبب ٹیوٹر کا بالعموم یورپین ہونا تھا۔ دوسرے یہ کہ آج کل کی طرح طلبہ کو خارجی اثرات اور سیاسی لیڈروں کی تائید حاصل نہ تھی۔ دوسری طرف اپنے طرز عمل کی سخت جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔

اس زمانے میں رات میں تھیٹر دیکھنے کے لیے شہر کا علاحدہ پاس ملتا تھا اور اجازت ایک دن پہلے لینی پڑتی تھی۔ ایک صاحب کے کوئی عزیز آگئے۔ انھوں نے تھیٹر چلنے کی فرمائش کی۔ طالب علم آکسٹرٹونی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورت حال بتا کر پاس کا طالب ہوا۔ موصوف نے فرمایا کہ ایک دن پہلے کیوں نہیں درخواست کی۔ طالب علم نے وجہ بتائی اور مجبوری کا اظہار کیا اس لیے اور کہ وہ عزیز دوسرے دن چلے جانے والے تھے ردّ و قدح ہوتی رہی۔ بالآخر آکسٹرٹونی صاحب نے بڑے شریفانہ انداز سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور یہاں تک فرمایا کہ تم کو کل آنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی میں پاس لے کر خود تمھارے کمرے آؤں گا قصہ مختصر پاس نہ ملا۔ اور یہ خبر ساری سائڈ میں پھیل گئی۔ طلبہ نے اس ڈسپلن آموزی کا ایک لطیفے سے جواب دیا۔

قصہ یہ ہوا کہ ایک دن سائڈ ہی کے ایک صاحب آکسٹرٹونی کے یہاں پہنچے اور بڑے روہانسے لہجے میں بولے جناب والا ہم کو دوسرے سائڈ کے ساتھی طعنہ دیتے ہیں کہ آکسٹرٹونی صاحب تمھارے ساتھ ٹینس نہیں کھیلتے حالاں کہ دوسری سائڈ کے ٹیوٹر برابر ایسا کرتے ہیں۔ آکسٹرٹونی صاحب نے ٹینس کھیلنا تو در کنار شاید کبھی ٹینس دیکھی بھی نہ تھی۔ لیکن بغیر کسی تامل کے فوراً تیار ہو گئے۔ فرمایا کچھ مہلت دو تا کہ میں ایک ریکٹ خرید لوں اور ٹینس کا یونی فارم بھی

تیار کرائوں۔ ایک ہفتے کی مہلت طے ہوئی۔ یہ زمانہ ختم ہوتے ہی عمدہ ٹینس یونی فارم میں ملبوس ایک قیمتی انگلش ریکٹ لیے ہوئے ٹھیک وقت پر موصوف ٹینس کورٹ پر پہنچ گئے۔ سائڈ بھر کو پہلے سے خبر کردی گئی تھی کہ آکٹر ٹونی صاحب اپنے کھیل کا مظاہرہ کریں گے۔ اس لیے سارے طلبہ کورٹ کے چاروں طرف موجود تھے۔ آکٹر ٹونی صاحب کا سب نے چیرز کے ساتھ خیر مقدم کیا، موصوف بھی بہت خوش ہوئے اور فوراً کھیلنے پر آمادہ ہو گئے۔

جس طرح کوئی اناڑی نمازی عید بقرعید کی نمازوں میں تکبیروں کی تعداد و ترتیب نہ سمجھتا ہے نہ یاد رکھتا ہے اس لیے ہاتھ باندھنے چھوڑنے اسی طرح رکوع میں جانے یا نہ جانے کے لیے کن انکھیوں سے ساتھی نمازیوں کی نقل و حرکت دیکھتا رہتا ہے اور ویسا ہی کرتا ہے۔ آکٹر ٹونی صاحب بھی کورٹ میں ایسا ہی کرتے رہے۔ گیند سامنے یا آس پاس سے نکل جاتی تو ان کا ریکٹ چلتا۔ سروس (service) ایک بھی صحیح نہ کر سکے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے میں کچھ ایسا بل پڑ جاتا کہ گیند کا سابقہ ریکٹ کی تانت کی بجائے تمام تر اس کے فریم یا دستے سے ہوتا۔ تماشائیوں کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ تقریباً تین چوتھائی ہنسی سے بے قابو ہو کر اپنے اپنے کمروں کی طرف بھاگ گئے۔

کئی دن یہی حال رہا آکٹر ٹونی صاحب بڑی پابندی سے آتے اور دلچسپی و تندہی سے کھیلتے۔ اب تمام کھلاڑی گھبرائے اور مصیبت سے نجات پانے کی تدبیر سوچنے لگے۔ ایک دن کھیل ہونے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے خوش گپی کا موقع ملا تو ایک صاحب نے آکٹر ٹونی کے کھیل کی تعریف کرتے ہوئے کہا جناب والا یہ ٹینس بڑی سخت گیر محبوبہ ہے! آکٹر ٹونی صاحب مسکرائے اور فوراً جواب دیا جب ہی تو میں نے تمام عمر اس کو منہ نہیں لگایا۔ بات ختم ہو گئی۔ آکٹر ٹونی صاحب پھر تشریف نہ لائے اور سب کی جان میں جان آئی۔ لیکن یہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کھیل میں جیت کس کی ہوئی، طلبہ یا آکٹر ٹونی صاحب کی؟

آکٹر ٹونی صاحب کی پنسل اکثر لاپتا ہو جاتی۔ اس کے لیے ترکیب یہ نکالی تھی کہ پنسل کے ایک مختصر ٹکڑے کو بڑے لمبے دھاگے سے باندھ دیا تھا۔ اس پنسل کو لیے ہوئے ہر کمرے یا برآمدے میں آتے جاتے رہتے اور جو کچھ نوٹ کرنا ہوتا کر لیا کرتے۔ اگر پنسل کہیں چھوٹ جاتی

تو اس کی تلاش میں سرگرداں نہ ہوتے بلکہ میز تک جس کے پایے سے دھاگے کا دوسرا حصہ بندھا ہوتا واپس آتے دھاگے کو کھینچنا شروع کر دیتے اور پنسل آ موجود ہوتی! یہ کبھی نہ کرتے کہ دھاگے کے سہارے پنسل تک پہنچ جاتے اور اسے اٹھا لیتے۔ کھینچنے میں پنسل کہیں اٹک جاتی تو اسے چھڑا آتے اور واپس آ کر پھر دھاگا کھینچنے لگتے۔ یہاں تک کہ پنسل میز تک واپس آ جاتی اور اپنی جگہ پر رکھ دی جاتی۔ اپنے کتے سے جو بالکل معمولی دیسی قسم کا تھا۔ بڑی محبت کرتے تھے، وہ مر گیا تو باغ کے ایک گوشے میں دفن کرا دیا۔ قبر پختہ بنوا دی اور یہ کتبہ اردو میں لکھوا کر نصب کرا دیا" بھائی تجھ سا کبھو نہ ہوا" غالباً انگریزی فقرے کا ترجمہ ہے:

("A brother like thee was never born")

باہر گھومتے پھرتے کبھی نظر نہ آئے۔ اپنی کوٹھی ہی کے اندر رہتے یا کلاس لینے آ جاتے۔ بڑی محبت اور کھلے دل کے آدمی تھے۔ داؤ پیچ جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔ لیکن جہاں ڈسپلن کا معاملہ آ جائے آکسٹر ٹونی صاحب کو ان کے راستے سے کوئی بھی ادھر اُدھر نہیں کر سکتا تھا۔ گھنٹہ بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے اور ختم ہوتے ہی کتاب بند کر دیتے۔ کمی بیشی کی ان کے ہاں گنجائش ہی نہ تھی۔ پڑھانے کے سوا کلاس میں ایک لمحہ بھی ادھر اُدھر کی بات نہ کرتے نہ کسی کو کرنے دیتے۔ یہ وتیرہ اس زمانے کے ہر انگریز پروفیسر کا تھا۔ طالب علموں کی بڑی عزت و محبت کرتے تھے لیکن نہ ان کو اپنا آلہ کار بناتے نہ ان کے آلہ کار خود بنتے۔ یہ صفت اب تعلیم گاہوں میں عنقا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کا کسی کو غم بھی نہیں!

پاپا پرویز سب سے نرالے تھے۔ چوڑی چکلی ہڈی لمبا تڑنگا قد پاٹ دار آواز تقریباً سن رسیدہ۔ ہمہ وقت شراب میں سرشار رہتے۔ کلاس میں بغدادی صاحب کے بعد سب سے زیادہ بلند آواز میں اس جوش و خروش سے پڑھاتے جیسے شراب کا نشہ زائل نہ ہوا ہو بلکہ بڑھتا جا رہا ہو۔ لیکن آفریں ہے اس شخص پر کہ معذوری کے باوجود شیکسپیئر کے نکات جس خوبی سے واضح کرتے کوئی دوسرا یا تو کر نہیں سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سب سے پہلے لفظی ترجمہ کرتے یہاں تک کہ If (اگر) اور but (مگر) تک کا ترجمہ کر ڈالتے پھر ہر فقرے کے محل اور موقع کی توضیح کرتے اس شد و مد سے جیسے شراب ہی نہیں کسی آسیب کی زد میں ہوں! نظر برابر کتاب پر جمی

رہتی، کلاس کی طرف کبھی نہ دیکھتے مسلسل بولتے چلے جاتے، جیسے کبھی پھر بولنے کا موقع نہ آئے گا۔ شراب اور اوقاتِ درس دونوں کے یکساں سختی سے پابند تھے۔ ساتھی یورپین اور دوسرے اساتذہ سے ربط ضبط نہ تھا۔ معمولاً کسی سے بات چیت کرتے یا ادھر اُدھر دیکھتے بہت کم پایا گیا۔ اپنے شراب ہی کی قربان گاہ کا انتخاب کیا اور بالآخر اسی کی نذر ہو گئے!

انٹرمیڈیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مرادآبادی تھے۔ موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگراں بھی رہے تھے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آ گیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظریف، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ اساتذہ اور طلبہ میں یکساں مقبول و محبوب تھے۔ قاضی صاحب کے بغیر ہر تقریب سونی معلوم ہوتی۔ خوب سوجھتی تھی۔ تفریحی اور ہجویہ نظموں میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بعض شاعری اور شاعروں کی ایسی نقل کرتے کہ ہنستے ہنستے براحال ہو جاتا۔ موصوف کو جتنے چٹکلے، لطیفے اور کہاوتیں یاد تھیں شاید ہی کسی اور کو ہوں، جن کو وہ ایسے موقع پر سناتے کہ کیسا ہی افسردہ دل ہوتا پھڑک اٹھتا۔ دعوت کے موقع پر بہت جلد اور بڑے مزے کی نظم لکھ ڈالتے۔ ان کی ظرافت و طنز دونوں کے ہدف میزبان اور اشیائے خورد ونوش خاص طور پر ہوتیں!

جغرافیہ پڑھانے میں ملکوں، شہروں، دریاؤں، پہاڑوں، جھیلوں کے ٹیڑھے میڑھے طویل الذیل ناموں کو ایسے دلچسپ فقروں، مصرعوں اور مکالموں میں کھپا دیتے کہ ان ناموں کو بھول جانا ناممکن تھا۔ تمام دنیا کے نقشوں کو بھی اسی طرح قابو میں لائے تھے۔ مقررہ کشش اور شوشوں کو گھٹا بڑھا کر اس طرح لکھتے کہ مخصوص نام یا فقرے سے مخصوص نقشہ تیار ہو جاتا۔ مثلاً بابر بڑا شریر لڑکا ہے۔ اس کو اس طرح لکھتے یا اس کا طغرہ بناتے کہ وہ ہندوستان کا خاکہ بن جاتا۔ نقشہ کھینچنے میں ایسا باکمال مشکل ہی سے کہیں نظر آئے گا۔ آنکھ پر پٹی کیوں نہ باندھ دی جائے جس ملک، دریا، جھیل یا پہاڑ کا نام لے دیجیے اس کا نہایت صحیح خاکہ بے تکلف اور بہت جلد کاغذ یا تختہ سیاہ پر کھینچ دیتے! اس زمانے میں ہندوستانی لکچرر کو بڑی معمولی تنخواہ ملا کرتی تھی۔ ایک موقع پر

کسی ناواقف نے وطن میں سوال کر دیا، قاضی صاحب آپ کو علی گڑھ میں تنخواہ کیا ملتی ہے؟
بڑے بے استغنا لیکن تھوڑی سی تمہید کے بعد جواب دیا، بھئی اللہ کا شکر ہے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد اور
میری تنخواہ مل کر ایک ہزار روپے ماہوار ہو جاتے ہیں البتہ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کا نام آہستہ سے
بہت ہی روا روی میں لیا اور اللہ کا شکر اور ہزار روپے بلند آواز سے کہے تھے!

اس طرح کی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر
دیا۔ الفاظ کی الٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو
زیروزبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے اور بقیہ نے اپنے سر پکڑ لیے! اس مہم میں راقم السطور
ان کا دست راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لیے اصول وضع کرنے یا معنی پہنانے کی
ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجیہ و تلبیس کے ایسے
نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا عطائی بھی امراض یا مذہب کی نہیں کر سکتا تھا۔
میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لیے ایک نیا کھاتا کھول دیا گیا جس کا نام "گھپلا کھاتا" تھا۔
میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کے نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا اس وقت تک کوئی
موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت ہی کا نام گھپلا کوش یا کڈھپ کوش رکھ دیا جائے گا۔ ہندی
میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آیا ہے، در عمل کوش ہر چہ خواہی پوش،
چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دیے جاتے جس کی تعبیر و توجیہ پر نہ قاضی صاحب کا
ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشایش کی امید باقی رہ جاتی! ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے امتداد
زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں!

قاضی صاحب کا انقلاب آفریں انکشاف یہ تھا کہ انگریزی الفاظ کی بیشتر تعداد اردو
سے سرقہ کی گئی ہے۔ اردو ہی نہیں بلکہ ان تمام زبانوں سے جن سے اردو کا لگاؤ ہے۔ ہندوستان ہی
کی زبانوں سے نہیں جن سے قاضی صاحب اور میں واقف تھے۔ بلکہ فارسی و عربی سے بھی۔
فرماتے تھے کہ انگریز پہلے پہل ہندوستان میں داخل ہوئے تو نیم متمدن اور انگریزی ایک کم مایہ
زبان تھی۔ چنانچہ اردو کے جو لفظ جہاں سنتے اس کو فوراً اپنے تلفظ میں کسی نہ کسی طرح ڈھال کر
اپنا لیتے۔ جیسے آج کل تاریخیں اور تہذیبیں ڈھال اور اپنالی جایا کرتی ہیں۔ جن لوگوں نے قاضی

صاحب کو دیکھا ہے وہ موصوف کی طرفہ طرازیوں سے بھی آشنا ہوں گے۔ان کی ڈکشنری سے مثالیں پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔یوں بھی اس کے بہت سے الفاظ زبان زد ہیں۔آپ کے تحمل ودرگزر کے پایاں ذخیرے پر بھروسا کرتے ہوئے دو ایک مثالیں لسانیاتی عبرت کے لیے پیش کرتا ہوں۔مثلاً ٹرشیرر (Treasurer) خازن کی تاویل اسی طرح کی تھی کہ یہ عموماً تنخواہوں اور بلوں میں کاٹ چھانٹ کیا کرتے ہیں۔اس لیے ٹرشیرر کا یہ عہدہ ترے ضرر کے لیے! پراکٹر (Proctor) چوں کہ ڈسپلن کے معاملے میں کسی کی رورعایت نہیں کرتا اس لیے یہ ماخوذ ہے بڑا کٹر سے (Deputy) ڈپٹی وہ جو ڈپٹتا ہے، سپرنٹنڈنٹ (Superintendent) سوپرڈانٹ رکھنے والا۔ان کے زمانے میں زبانی امتحان واوا اووسی (Decoration) کا مسلم یونی ورسٹی ممتحن کو معاضہ نہیں دیتی تھی۔اس لیے اس کی تاویل یوں کی گئی تھی، ''واہ واویسے ہی'' (Viva Voce) ڈیکوریشن نکلا تھا دیکھورے شان سے پروفیسر ماخوذ تھا۔بزد (پڑا) صفر سے (بصنعت مغلوب) وغیرہ!

اس تفنن کا المیہ یہ ہوا کہ جب یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن واپس تشریف لے گئے تو اسی لغت کو شائع کرنے کے لیے اپنا ایک پریس کھولا اور جلالی ڈکشنری کے نام سے اسے چھاپنا شروع کیا۔ہم سب نے اپنے آپ پر نفریں کرنے کے بعد موصوف سے درخواست کی کہ یہ سب بے فکری اور تفریح وتفنن کا ایک مشغلہ تھا اس کو چھاپنے اور شائع کرنے سے محنت وزیرباری کے علاوہ جگ ہنسائی کا بھی سامنا ہوگا۔لیکن موصوف نہ مانے کچھ اجزا چھاپ بھی ڈالے۔بالآخر قضا وقدر کو بیچ میں پڑنا یعنی قاضی صاحب کو ہم سب سے اوران کے ورثا نے پریس کو اپنے سے جدا کردیا ورنہ ....

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا[1]

کے کیسے کیسے عجوبے ہمارے سامنے آتے۔

---

[1] پورا شعر یوں ہے:

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

آتش

یونی ورسٹی کے بروے کار آنے کے بعد چند سال تک کالج کی روایات کا تھوڑا بہت عمل دخل رہا۔ لیکن اس میں کسی شعوری کوشش کا دخل نہ تھا، اس لیے کہ اس کے قیام کے ساتھ ہی اثر واقتدار کے لیے اعیان واکابر میں کچھ اس طرح کی آویزش شروع ہوئی کہ کسی کو یونی ورسٹی کی بہتری و نام وری کا دھیان تک نہ رہا۔ طرح طرح کی خرابیاں پھیلیں، یونی ورسٹی پر تحقیقاتی و کمیشن بٹھایا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ یونی ورسٹی کے علمی، فنی اور تہذیبی رجحانات اور سرگرمیوں نے مذہبی سیاسی جدل وجدال کے لیے جگہ خالی کر دی۔ اس سے یونین بھی متاثر ہوئی اور اس کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جہاں علمی سطح پر ہر مکتب خیال کے افراد آزادی کے ساتھ مباحثے میں شرکت کرتے، بلکہ یک طرفہ فیصلوں کا مرکز بن گئی اور اعلیٰ علمی مباحثوں کی جگہ سیاسی اور وقتی مسائل ومناقشے پر ریزولیوشن پاس کرنا اس کا کام رہ گیا۔ یونین کے اراکین اچھے مباحثے ترتیب دینے اور یونین کے صحت مند تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے سیاسی لیڈروں کو تشریف آوری کی دعوت دینے، ان کو لائف ممبر (Life Member) بنانے اور ان کی ''آنکھ کا تارہ'' بننے کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں سرگرداں رہنے لگے۔

ضمناً یہاں ایک تبدیلی کا ذکر کروں گا۔ کالج کے زمانے میں اور اس کے کچھ دنوں بعد تک یونین میں کسی مہمان کا خیر مقدم کیا جاتا تو تلطف وتکریم کے اچھے سے اچھے اور زیادہ سے زیادہ کلمات مہمان کے لیے کہے جاتے۔ ان باتوں کا ذکر لطف واحترام سے کیا جاتا جس سے مہمان کا تعلق خاص ہوتا۔ مہمان کی پذیرائی کا مفہوم یہ ہوتا کہ اس کی عزت اپنی عزت، اس کی خوشی اپنی خوشی، اس کی خفت اپنی خفت تھی۔ اپنے بارے میں جو کچھ کہتے اس میں انکسار اور وقار ہوتا اور تقریر بہت مختصر ہوتی۔ شریف گھرانوں میں کوئی مہمان آتا ہے تو ہم سب جانتے ہیں کہ مہمان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یونین کا یہ رنگ نظر آنے لگا کہ مہمان کوئی ہو، موقع کچھ ہو، مہمان کا خیر مقدم 'در مدح خود می گوید' کے رزمیہ اور رجزیہ سے کیا جانے لگا وہ بھی اس غرہ اور غریو سے جیسے زمانہ قدیم کے میدان جنگ میں ایک طرف کا پہلوان دوسری

طرف کے پہلوان کو دعوت حرب وضرب دے رہا ہو[1] دوسرا پہلوان غریب مہمان ہوتا چنانچہ یونین میں مہمان پذیرائی، خودستائی اور خودنمائی کا حیلہ بن گئی۔ اکثر یہاں تک دیکھنے میں آیا کہ سامعین مہمان سے زیادہ میزبان یا میزبانوں کی گرمی گفتار سے مستفید ہوتے رہے۔ ظاہر ہے خودستائی اور خودنمائی اس شخص یا جماعت کا شیوہ ہوتا ہے۔ جسے اس عیب کے سوا کسی دوسرے ہنر کا سہارا نصیب نہیں ہوتا۔ تقسیم ملک کے بعد شکر ہے کہ یونین کی زبونی کا یہ دور جلد ہی ختم ہوگیا اور وہ اپنی دیرینہ قابل قدر روایات کی پیروی پر مائل ہوگئی ہے۔

یونین کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر کڑھنا بے سود ہے۔ کڑھنا یوں بھی اچھا نہیں۔ زندگی اور زمانے کے طور طریقے ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض امور اور ادارے ایسے ہوتے ہیں جن میں تبدیلی آتی تو ہے لیکن بہت دیر میں اور آہستہ آہستہ۔ ان کی خوبی اور قدر و قیمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ بہت دیر میں تبدیلی قبول کرتے ہیں۔ اسی ذیل میں یونی ورسٹی اور یونین آتے ہیں جہاں ان روایات اور اقدار کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے جو ہماری قومی سیرت کا سنگ بنیاد ہوتے ہیں یہ روایات اور اقدار بہت دنوں میں ظہور پاتی ہیں اس لیے بہت دیر تک قائم رہتی ہیں اور قائم رکھی جاتی ہیں، دوسری طرف سیاست کا کاروبار ہے جہاں ہر طرح کی تبدیلی ہر آن رونما ہوتی ہے۔ اس طور پر یونی ورسٹی اور سیاست کا اتحاد بے جوڑ اور ناواجب مانا گیا ہے۔ لیکن آج کل کوئی ایسی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی جس کا دور یا نزدیک کا رشتہ سیاست سے نہ ہو بالخصوص ادنیٰ سیاست سے۔

آج سے پہلے یونین کا اصل مقصد تعلیمی تفریحی اور تہذیبی تھا اور وہ ایک طور پر یونی ورسٹی یا کالج میں تعلیم پانے والوں کی تربیت گاہ بھی تھی اور تفریح گاہ بھی۔ ملک کی سیاسی فضا کے ساتھ یونین کی فضا بھی بدلی اور جلد ہی یونی ورسٹی اور یونین دونوں سیاسی تہلکوں میں جا پڑے،

---

[1] مثلاً یونین کے تعارف میں اکثر یہ توصیفی کلمے استعمال کیے جاتے This Mighty union (یہ توانا اور قادر مطلق یونین!) ضمناً یہاں یہ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ غالب علم تو پھر غالب علم ہیں۔ ہم آپ جیسے ''حق بخشوائے'' لوگ بھی معمولی سی یہ بات نہیں مانتے کہ ''مستند تعریف وہ ہے جو دوسرے ہماری کریں نہ یہ کہ ہم خود اس بارے میں زحمت گوارا فرمایا کریں۔'' لیکن کون ہے جو اس عیب یا ''عیاشی'' میں مبتلا نہیں!

یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آیا جب یہ بتانا دشوار ہوگیا کہ تعلیم گاہوں اور بازاروں میں کون کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔ یونین میں طلبہ یہ سیکھتے ہیں کہ اپنی بات کس صفائی اور صداقت سے کہی جائے اور دوسرے کی بات کس تحمل اور کشادہ جبینی سے سنی جائے۔ نیز تقریر کے فنی آداب کیا ہیں اور کس طرح برتے جاتے ہیں۔ یونین کا موازنہ کھیل کے میدان سے کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کھیل کے میدان میں کھلاڑیوں کو اپنے اپنے ہنر دکھانے کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں ٹھیک اسی طور پر یونین میں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے یکساں مواقع ~~ملنے چاہئیں۔~~ بحث ومباحثے کا یہی اندازاور روایات پارلیمنٹری (Parliamentary) کہلاتی ہے۔ اچھی تقریر کرنا میں فن بھی سمجھتا ہوں اور فضیلت بھی۔ فن کو فضائل سے مستحکم اور مزین رکھنا تعلیم گاہوں کے اعلیٰ مقاصد میں ہونا چاہیے۔

گذشتہ اوراق میں آدم جی پیر بھائی منزل کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ اس منزل کے نچلے ایک حصے میں جو ماریسن روڈ کی سمت کھلتا تھا مولانا سید سلیمان اشرف[1] صاحب مرحوم (متوطن بہار) استاد دینیات تا زیست مقیم رہے، اس وجہ سے یہ مقام تقریباً 30-35 سال تک مرجع فاضل واکابر رہا۔ سید محمود کورٹ مغربی کے اسسٹنٹ ٹیوٹر وارڈن (Assistant Tutor Warden) کی حیثیت سے اس عمارت کے بقیہ نچلے حصے میں جس کا رخ دکھن کی طرف تھا میرا کئی سال تک قیام رہا۔ اس طرح مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مرحوم مجھے نہایت عزیز رکھتے تھے۔ میں نے مرحوم کی وفات پر ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں شامل ہے۔ مرحوم نے یونین کے مباحثے میں کبھی حصہ نہ لیا لیکن مرحوم کی تقریر کا والہانہ اور خطیبانہ انداز اس زمانے میں بہت مقبول تھا۔

مرحوم کی بعض خوبیوں کا میں بڑا معترف ہوں بڑے طنطنے کی شخصیت تھی۔ کسی کا ''رعب نہیں مانتے تھے'' چاہے اس میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑتا۔ لیکن اپنے ساتھیوں، طلبہ نیز غریب اور کم حیثیت لوگوں سے بڑے خلوص اور شفقت سے پیش آتے۔ اپنی تقریروں اور تصانیف سے اس درس گاہ کی شہرت میں بڑا اضافہ کیا۔ یونی ورسٹی کی مسجد میں عصر

---

[1] مولانا سید سلیمان اشرف (1878ء۔1939ء) پر رشید صاحب کا مضمون ''گنجہائے گراں مایہ'' میں شامل ہے۔

اور مغرب کے درمیان اپنے طور پر یعنی بغیر کسی معاوضے کے تفسیر کا درس دیتے۔ اس میں شرکت کے لیے کوئی مجبور نہ تھا لیکن طلبہ، اساتذہ اور دوسرے لوگ بڑے شوق اور پابندی سے اس میں شریک ہوتے۔ بعض تو اس طرح جیسے تراویح سننے کا التزام رکھتے ہیں۔ طلبہ زیادہ ہوتے ہر شخص کلام پاک کا اپنا نسخہ ساتھ لاتا تھا۔

بغیر کسی طرح کے جبر کے، محض اپنے شوق سے کلام پاک کا درس لینے کے لیے ایسے طمانیت افزا اوقات میں جیسا کہ عصر و مغرب کے درمیان ہوتا ہے بالخصوص اس زمانے میں جب یہ ادارہ بعد کی غیر صحت مند سرگرمیوں سے محفوظ تھا۔ شریف ذہن ہونہار نوجوانوں کا صاف ستھرے لباس میں (یونی فارم کی قید سے آزاد) کلام پاک کو طرح طرح کے کپڑوں میں لپیٹے سینے سے لگائے ہر طرف سے کالج کی دلکشا مسجد کی طرف آتے دکھائی دینا کیسا پاکیزہ، آنکھوں کو تازگی اور دل کو گرمی بخشنے والا منظر ہوتا تھا۔ تفسیر کلاس میں شریک ہونے کی مجھے کبھی توفیق نہ ہوئی۔ اس اعتراف میں مجھے بڑی غیرت محسوس ہوتی ہے، لیکن کیا کروں کہ ایسا ہی ہوا۔ درس کا وہی وقت ہوتا تھا جو کھیل کا ہوتا اور یہ تقریباً تمام عمر میری کمزوری رہی کہ میں کھیل چھوڑ نہ سکتا تھا۔

مسجد سے گزرتے ہوئے تفسیر کلاس میں بیٹھنے والوں کی عقیدت واحترام اور درس دینے میں مرحوم کے ''جذبہ بے اختیار شوق'' کو دیکھ کر متاثر ہوتا اور دل میں اکثر یہ بات آتی کہ کیسی دل کشا مسجد میں کتنا شان دار شخص کس موضوع جلیل پر کتنا دل افروز درس دے رہا ہے۔ مردانہ تفریحی کھیل مثلاً کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس میں شریک ہونے کے لیے جا رہے ہوں اور راستے میں اس طرح کی تقریب نظر سے گزرے تو اعتماد واحترام، حوصلہ اور حمیت، شوق اور شرافت کے کیسے کیسے جذبات وخیالات ذہن وضمیر میں اُبھرتے ہیں۔

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ محض شعر وسخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ تہذیبی روایات کے اعتبار سے بھی۔ یہی بات کم وبیش ان مشاعروں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں کثرت سے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مشاعروں کا جتنا چرچا پہلے تھا اس سے کہیں زیادہ اب ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری

بالخصوص اردو غزل کو ہر طبقے میں کس درجہ قبول عام نصیب ہے اور مذہبی تقاریب کے بعد اردو مشاعروں کے لیے عام ہندوستانیوں کے دلوں میں بلا قید مذہب وملت کتنی وسعت ہے۔

مشاعروں کی روایت عرب سے ایران ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی۔ اس کو جتنی ترقی اور شہرت یہاں نصیب ہوئی شاید خود عرب وایران میں نہ ہوئی ہو۔ آج کل مشاعروں کا جو رنگ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے اس سے اکثر یہ بات دل میں آتی ہے کہ جس طرح شعر گوئی اور شعر خوانی عرب کے میلے اور بازاروں سے شروع ہو کر ایران اور ہندوستان کے سلاطین اور امرا کے درباروں تک پہنچی اس طرح وہ اب درباروں سے نکل کر بازاروں میں پہنچ گئی ہے۔ اس پر حسب توفیق ہم خوش یا ناخوش ہو سکتے ہیں، ہمارے خوش یا ناخوش ہونے کا بہت کچھ مدار اس پر ہے کہ پہلے زمانے کے بازار اور میلوں اور آج کل کے بازار اور میلوں میں ہم فرق کرتے ہیں یا نہیں اور ایسا کرنا بھی چاہیے یا نہیں!

شعر وسخن کی ترقی اور اشاعت کا ایک مؤثر اور معقول ذریعہ مشاعرہ سمجھا جاتا تھا۔ سلاطین اور امرا کے درباروں تک رسائی حاصل کرنے، ہم چشموں میں امتیاز پانے کا ایک بڑا وسیلہ شاعری تھا۔ اب سے چند سال پہلے تک شعر وادب کی سرپرستی تمام تر والیان ملک اور اکابر وامرا کی ذات اور ان کی ریاست سے وابستہ تھی۔ علی گڑھ شعرا کی ان معنوں میں تو کفالت نہ کر سکتا تھا لیکن ان کی قدر ومنزلت میں بیش از بیش حصہ لیتا رہا اور اس اعتبار سے شعر وسخن کی ترقی میں علی گڑھ کا بڑا قیمتی حصہ رہا ہے۔ جس کی نظیر شاید کسی دوسری درس گاہ میں نہ ملے۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں حسن قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلم ہو جاتی۔ فانی، اصغر، جگر کا کلام علی گڑھ میں بہت پسند کیا گیا اور میں جانتا ہوں کہ اس میں عصبیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایک زمانے میں لاہور کے بعض عزیز دوستوں نے منظم طور پر یہ الزام دینا شروع کر دیا تھا کہ علی گڑھ اصغر کے کلام کو بے جا طور پر شہرت دے رہا ہے اور یوپی (U.P) سی۔پی (C.P) قسم کے تعصب میں مبتلا ہے۔ حالاں کہ اس زمانے میں علی گڑھ میں حفیظ جالندھری[1] صاحب کی

---

[1] حفیظ جالندھری (ابوالاثر محمد حفیظ 1900ء-1982ء) شاہ نامہ اسلام کے مصنف اور ترانہ پاکستان کے خالق علی گڑھ میں بہت مقبول تھے اور وفات سے چند سال قبل آخری بار علی گڑھ آئے تھے۔

مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی بڑا مشاعرہ منعقد ہوتا تو اس کا اہتمام کیا جاتا کہ موصوف کو ہر قیمت پر بلایا جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مدعو کرنے کی ذمے داری میرے سپرد کی جاتی۔ خود اصغر صاحب مرحوم مجھ سے کہا کرتے تھے: ''دیکھیے حفیظ کی طرف سے غافل نہ ہو جیے گا۔ اس میں اعلیٰ شاعری کی صلاحیت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ رائیگاں جائے۔'' علی گڑھ پر عصبیت کا الزام رکھنے والوں نے اس بارے میں خود حفیظ صاحب سے شاید کبھی گفتگو نہیں کی کہ علی گڑھ میں ان کی پذیرائی کس خلوص اور خوشی سے کی جاتی تھی!

حسرت[1]، اصغر[2]، جگر[3]، فانی[4]۔ کے مولانا سہیل بڑے مداح تھے۔ حسرت سے سہیل کو یوں بھی بڑی عقیدت تھی۔ جس زمانے میں حسرت کا قیام علی گڑھ میں تھا اور سیاسی

۱۔ حسرت موہانی (فضل الحسن 1881ء۔ 1951ء) شاعر، محقق، ادیب اور مجاہد آزادی۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کے طالب علم رہے۔ علی گڑھ سے رسالہ اردوئے معلیٰ نکالا۔ جنگ آزادی کے سلسلہ میں قید و بند کی سخت صعوبتیں برداشت کیں۔ تذکرۂ شعرا، مشاہدات زنداں کے علاوہ کئی اور تصانیف ہیں۔

۲۔ اصغر حسین اصغر گونڈوی (1883ء۔ 1936ء) غزل کے مشہور شاعر، رشید صاحب سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ اصغر کے مجموعۂ کلام ''نشاط روح'' پر رشید صاحب نے مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ اصغر کے انتقال کے بعد رشید صاحب نے ان کے گھر جا کر سب سے پہلے تعزیت کے بعد اپنے تمام خطوط حاصل کر کے تلف کر دیے تھے۔ گنج ہائے گراں مایہ میں اصغر گونڈوی پر رشید صاحب کا مضمون شامل ہے۔ تصانیف: ۱۔ سرودِ زندگی ۲۔ نشاط روح۔

۳۔ جگر مراد آبادی، (سید سکندر علی 1890ء۔ 1960ء) اصغر گونڈوی کے شاگرد، رشید صاحب جگر صاحب کو اصغر گونڈوی کی طرح ہی بہت عزیز رکھتے تھے۔ جگر صاحب جب بھی علی گڑھ آتے تو رشید صاحب ہی کے یہاں ان کا قیام رہتا۔ رشید صاحب ان کا بہت خیال کرتے تھے اور جگر صاحب بھی رشید صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ رشید صاحب نے جگر کے مجموعۂ کلام ''آتشِ گل'' پر مقدمہ بھی لکھا ہے۔ تصانیف: جگر۔ آتش گل۔ شعلۂ طور

۴۔ فانی بدایونی (شوکت علی خاں 1879ء۔ 1941ء) رشید صاحب اصغر، جگر اور حسرت کے علاوہ فانی کی غزل گوئی کے بھی معترف تھے۔ فانی کی زندگی کا بڑا حصہ حیدر آباد میں گزرا۔ رشید صاحب نے فانی کے دیوان پر مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ تصانیف: باقیات فانی۔ عرفانیات فانی۔ کلیات فانی۔ وجدانیات

معتقدات کی وجہ سے حکومت کے زیر عتاب تھے، ان کے ہاں شاید کسی کا آنا جانا ہوتا، مولانا سہیلؔ دسویں پندرھویں ضرور ملنے جاتے۔ یونین میں انجمن حدیقۃ الشعراء کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ ثاقبؔ، صفیؔ اور محشرؔ صاحبان لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ ثاقبؔ صاحب کا کلام اس مشاعرے میں بہت پسند کیا گیا جن کے یہ دو اشعار کالج کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھے:

(1) باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(2) ہے روشنی قفس میں، مگر سوجھتا نہیں ابر سیاہ جانب کہسار دیکھ کر

ثاقب صاحب نے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کو کئی بار پڑھا اور ہر بار نئے انداز سے بتا کر پڑھا۔ اس کے بعد ثانی مصرع فرمایا، تو جیسے پورا مشاعرہ اُچھل پڑا۔ دیر تک اور رہ رہ کر ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ ثاقبؔ صاحب نے آنکھوں کو جس طرح گردش دے کر ان کی بے نوری کا اظہار کیا اور کپکپاتے ہاتھوں سے فضا کو ٹٹول کر بے بسی کے ساتھ گر جانے دیا، وہ اب تک نہیں بھولا ہے۔ شعر کو بتا کر پڑھنے میں کسی تصنع کے شائبہ بغیر لیکن ہر صنف سے بھر پور، اور اس امرا کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کہ کوئی انداز پایۂ ثقاہت سے گرنے نہ پائے۔ جو کمال ثاقب کو تھا میں نے آج تک کسی شاعر میں نہ دیکھا یہ کمال جیسے ان ہی پر ختم ہو گیا ہو۔

اس مشاعرے میں جناب اطہر[1] ہاپوری (متوطن ہاپوڑ) پہلی بار شریک ہوئے تھے۔ موصوف اس وقت تک علی گڑھ میں معروف نہ تھے۔ دو تین ہی شعر پڑھے ہوں گے کہ مولانا سہیلؔ چونکے اور حسب عادت فوراً کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ گھٹنوں میں دونوں مٹھی لے لی اور ان پر ٹھوڑی رکھ دی۔ پھر سر ہلا کر بولے ''یہ شخص رموز شعر سے واقف معلوم ہوتا ہے'' جلسے کے بعد مشاعرے کی اچھی غزلوں یا منتخب اشعار کے ساتھ جناب اطہرؔ کے بارے میں مولانا سہیل کا فقرہ بھی لوگوں کی زبان پر تھا۔ واقف کار جانتے ہیں کہ اتنا پہلے اور پہلی بار سہیل صاحب کا فرمانا کتنا صحیح تھا اور فن شعر میں اطہر صاحب کی استادی کس طرح چالیس سال سے اوپر تک مسلم رہی۔

---

[1] اطہر ہاپوڑی سید معشوق حسین بن سید امراو علی 1873ء میں پیدا ہوئے۔ 1957ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ مجموعہ غزلیات، قصائد فارسی، رسالہ تحقیقات الفاظ کے علاوہ کئی تصانیف ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس عہد میں علی گڑھ کے سخن ور اور سخن فہم جماعت اساتذہ سے نہیں بلکہ طلبہ میں سے ہوتے تھے اور عجیب تر یہ کہ اس زمانے میں تہذیبی روایات اور امتیازات کے نمائندے بھی طلبہ تھے!

شاعری میں استادی، شاگردی اور مذہب واخلاق میں مرشد مرید، یا گرو چیلے کا رشتہ کہیں اور نہیں تو ایشیائی ممالک میں اتنا قوی اور محترم مانا گیا ہے کہ اس کو کبھی کبھی خون کے رشتے سے زیادہ وقعت دی گئی ہے۔ اس طرح کے رشتے یا اذارے زمانۂ جہالت کے یادگار ہوں یا دور اجتہاد وانقلاب کے، اس سے بحث نہیں۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ ذوق شعروادب کی سیرابی اور صحت مندی کے لیے شاگردی، استادی، اور اعمال وافکار کے سنوارنے، سدھارنے کے لیے مرشد مرید یا گرو چیلے کا رشتہ ادارہ مشرق میں مدت الایام سے چلا آرہا ہے وہ اپنے گوناگوں فوائد کے اعتبار سے بہت اہم اور قابل قدر مانا گیا ہے اور ہندوستانی تمدن میں اس رشتے اور رابطے کا ایک خاص مقام ہے۔ آج کل نوجوانوں میں جو عام ذہنی انتشار ملتا ہے اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، وہاں ممکن ہے ایک یہ بھی ہو کہ استاد شاگرد یا مرشد مرید کا ''شخصی'' رشتہ جو مدتوں سے ''مجرب'' چلا آتا تھا اس کی طرف سے ہم نے اپنی توجہ ہٹالی ہے۔

شاعری میں استادی شاگردی کا رشتہ آج بھی قائم ہے۔ لیکن محض برائے نام۔ یہ کہنا کبھی غلط نہ ہوگا کہ اب نوجوان شعرا نہ صرف یہ کہ استاد کی ضرورت نہیں تسلیم کرتے بلکہ ''تلامیذ الرحمٰن'' ہونے کی حیثیت بھی گوارا نہیں کرتے۔ پہلے مستند ادارے دربار شعروادب کے اکابر محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے جہاں مشاعرے کے بڑے کڑے آداب برتے جاتے۔ اب اکثر مشاعرے دولت مند تاجر ٹھیکے داروں کی طرف سے منعقد ہوتے ہیں۔ یا کسی سیاسی یا نیم سیاسی مقصد کے پیش نظر اس طرح کے جلسے کیے جاتے ہیں، جس کا مقصد شعروادب کی اتنی خدمت نہیں ہوتا جتنا اپنے کاروبار کا اشتہار۔ اس طرح کے جلسوں میں جس طرح کی بدعنوانیاں دیکھنے میں آتی ہیں وہ بانیان تقریب اور شعرا میں سے کسی کے لیے قابل فخر نہیں کہی جاسکتیں۔ چنانچہ آج سے 20۔25 سال پہلے مشاعرے کا جو اصلاحی وتہذیبی اثر ہمارے شعروادب، نیز ہمارے معاشرے پر پڑتا تھا وہ تقریباً مفقود ہو گیا ہے۔

کالج کے مشاعرے اور مباحثوں میں ''ہوٹنگ'' (Hooting) ہوتی تھی، فقرے بھی کسے جاتے تھے، لیکن ایسے کہ اکثر اچھے شعر کا مزہ دے جاتے تھے۔ بدتمیزی اور بے غیرتی کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔ طالب علم ہر زمانے میں طالب علم ہی رہا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ طالب علم فرشتے ہوتے تھے اور اب فرشتے کی دوسری قسم۔ زندگی اور زندہ دلی عبارت ہی ہے نوجوانوں اور طالب علموں سے لیکن وہ طالب علم ہی نہیں ''برہما'' کیوں نہ ہوں انسانیت سے گزریں گے تو انسانوں کے نزدیک قابل مواخذہ ٹھہریں گے۔ نوجوانوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ نالائقی کا جواز نہ مذہب ہے، نہ وطنیت، نہ سیاست، نہ مزدور، نہ سرمایہ دار، نہ خود نوجوان ہونا!

اس زمانے میں شعرا دبستانوں اور استادوں میں تقسیم تھے۔ جن کو ایک مجلس میں یکجا کرنا مشکل ہوتا تھا۔ کبھی ایسا ہو جاتا تو بدمزگی کی نوبت بھی آ جاتی۔ لیکن علی گڑھ کی دعوت پر اور یہ دعوت ہمیشہ طلبہ کی طرف سے ہوتی، ہر دبستاں کے استاد اور ان کے پیرو آ جاتے اور اپنا کلام بڑے شوق اور حوصلے سے سناتے۔ سبب یہ تھا کہ علی گڑھ نے اپنے آپ کو کسی دبستان سے کبھی وابستہ نہیں کیا اور جانبداری کی بنا پر کسی شاعر کے کلام کو کبھی اچھالنے یا گرانے کا مرتکب نہیں ہوا!

شعرا کے خیر مقدم میں ایک نظم پڑھی جاتی جو اس پایے کی ہوتی کہ باہر سے آئے ہوئے شاعر ایک طور سے سنبھل جاتے کہ کالج میں اچھے سخن وروں کا سامنا ہے۔ یہ نظم حاضرین کو مشاعرے کے آداب اور کالج کے اعلیٰ روایات کو آخر تک نظر میں رکھنے کی بڑی موثر یاد دہانی ہوتی۔ مشاعرے کے بعد مہمان شعرا بڑے شوق و شفقت سے اکثر طالب علم شعرا سے ملنے ان کے کمروں پر جاتے۔ طلبہ بھی ان کی پذیرائی بڑی عقیدت سے کرتے اور ان کی تواضع و تکریم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ اپنے اشعار سناتے، ان کے سنتے اور شعر و شاعری پر تنقید و تبصرہ ہوتا۔ ان صحبتوں میں مولانا سہیل، سہا، اور فجی اور شعر و ادب کے رموز سے آشنا دوسرے سینئر (Senior) طلبہ موجود ہوتے۔ دوران گفتگو میں فارسی اور اکابر شعرا کا کلام زیر بحث آتا اور طرح طرح سے ان کی خوبیاں واضح کی جاتیں۔ ان صحبتوں میں مولانا سہیل کی نکتہ سنجی اور معنی آفرینی بڑی دلچسپ اور فکر انگیز ہوتی۔ مولانا کی پوزیشن (Position) اس زمانے میں کالج میں وہی تھی جو کبھی شبلی اور حالی کی تھی۔

علی گڑھ کی یہی روایات اور یہی رکھ رکھاؤ تھا جس نے شعر وادب کے دبستانوں (دلی، لکھنؤ، آگرہ، عظیم آباد اور رام پور وغیرہ) کی تفریق مٹادی تھی۔ آج تک علی گڑھ نے شعر وادب کے اپنے کسی دبستان کا دعویٰ نہ کیا۔ اس لیے کہ وہ شعر وادب کو خانوں میں مقید کرنے کے بجائے اس کی فنی استواری اور آراستگی، فطری سادگی اور دلکشی اور تہذیبی توانائی کو عام کرنے اور کارآمد بنانے کا حامی تھا۔ علی گڑھ کسی کی ذاتی جاگیر نہ تھا بلکہ ہماری پوری تہذیب کا مرکز تھا، جہاں تنگ نظری اور تنگ ظرفی کبھی دخل نہیں پاسکتی تھی۔ ہر وہ بات جو وزن و وقار اور خوبصورتی سے کہی یا کی جائے علی گڑھ کا حصہ تھی۔ کھیل ہو، مباحثہ ہو، شعر و شاعری ہو، مہمان داری ہو یا محفل اور معرکہ آرائی ہو، ہم کو اس کا حوصلہ ہوتا اور یقین رہتا کہ ہم سے بازی لے جانے والا کوئی نہیں اور یہیں کہیں وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حالی نے کہا ہے:

اسپ تازی کی طرح تھی قوم تازی بھی غیور

اور اقبال نے کہا:

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی

طلبہ کی طرف سے ایم۔اے۔او۔ کالج میں حسب حال ''خطابات'' دیے جاتے تھے۔ جسے فش پانڈ (Fish Pond) کہتے تھے۔ اصل مقصد تو ان کا تفریح ہوتا، لیکن لوگوں کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے یہ بڑے کارگر ہوتے تھے۔ اس کا پتا چلانا بڑا مشکل تھا کہ یہ خطابات کون تصنیف کرتا تھا اور کس طرح یہ شائع کیے جاتے تھے۔ یہ جتنے برجستہ ہوتے اتنے ہی حقیقت حال کے ترجمان بھی ہوتے۔ بعض خطابات میں پاسداری یا دل آزاری کا بھی دخل ہوتا، لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ بعض مقامات اور ممالک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں بہار کسی دن نمودار ہو جاتی ہے اور کسی کو نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کب اور کس طرح آئی۔ اسی طرح خطابات کی فہرست غیر متوقع طور پر کسی روز صبح کالج کے در و بام پر چسپاں نظر آتی اور چند گھنٹوں کے اندر وہ خطابات ہر ایک کی زبان پر ہوتے بالعموم وہ ''راز درون خانہ'' کے غماز ہوتے۔ اس لیے اکثر اصحاب ان کی طرف سے خائف رہتے۔ ایم۔اے۔او۔ کالج کے بعد ان خطابات کا معیار گرنے لگا اس لیے ان کی اہمیت بھی کم ہوتی گئی۔ بالآخر یہ ختم ہو گئے۔

یہ خطابات کافی نہ سمجھے گئے تو غالباً 1920ء میں انگریزی میں ایک پمفلٹ ''جھانپلزم ایکٹ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا مقصد بدتوفیقی اور بدمذاقی کا جس جھانپلزم اور جس کے مرتکب کو ''جھانپل'' کہتے تھے انسداد تھا۔ یہ پملفٹ (Pamphlet) علی گڑھ ''میگزین'' کے انگریزی سیکشن (Section) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مصنفین پردۂ خفا میں رہے۔ یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے کہ اس کی تصنیف میں راقم السطور کو دخل تھا۔ کوشش کی تھی کہ کہیں سے اس کا نسخہ دستیاب ہو جائے تو نظر ثانی کر کے شائع کر دیا جائے اور بعض دفعات وتشریحات قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں نقل کر دوں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے مضامین اور موضوعات بھی اچھی طرح یاد نہ رہے۔ زبان اور لہجہ وہی تھا جو تعزیرات ہند کا ہے۔

اس کی دفعات ان حماقتوں سے متعلق تھیں جو اکثر ہم سے وقتاً فوقتاً سرزد ہوا کرتیں۔ مثلاً نسل یا خاندان پر اترانا، اپنے لباس یا ورزشی جسم یا قابلیت کی نمائش کرنا، اہم شخصیتوں سے اپنے تعلقات جتانا، بڑے آدمیوں میں رہنا یا بڑا آدمی بننے کی کوشش کرنا، شعروادب یا علم وفن پر سنی سنائی رائے دینا وغیرہ۔ ان سب کے لیے مناسب سزائیں مقرر تھیں۔ ان میں سے ایک یاد رہ گئی ہے یعنی جو شخص، جھانپل، قرار دیا جائے اس کے سامنے کھڑے ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی ناک کے قریب تین چار چٹکی بجا دینا۔

اس ایکٹ (Act) کی زد میں آنے سے لوگ احتیاط کرنے لگے تھے اور اس کی ایسی شہرت ہوئی کہ ہر شخص کی زبان پر اس کا نام رواں ہو گیا اور موقع بے موقع اسے کام میں لانے لگے۔ ایک بار لطیفہ یہ ہوا کہ ایک صاحب کو ان کے ایک حریف نے ''جھانپلزم'' کا مرتکب ثابت کیے بغیر سزا وہ دے دی جو جھانپلزم کے لیے مقرر تھی۔ اس پر سرزنش کی گئی اور فیصلہ یہ دیا گیا کہ جھانپلوم کی سزا صرف جھانپلزم کے لیے مقرر ہے، کوئی غیر جھانپل نہ اس کا مستحق ہو سکتا تھا نہ مستوجب!!

سب سے دلچسپ پوزیشن (Position) ڈائننگ ہال کی تھی۔ یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی اس سے پہلے بھی وہی تھی اور آج بھی وہی ہے۔ شکایات کے اعتبار سے ایسا سدابہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو۔ میری طالب علمی ہی کے زمانے میں

20-15 سال ادھر کے ایک اُولڈ بوائے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ کھانا کھانے ڈائننگ ہال پہنچے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی مسکرائے، پھر بولے:

بوے جوئے مولیاں آید ہمی[1]

کھانے پر بیٹھے۔ پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ اچھل پڑے۔ بولے "خدا کی قسم وہی ٹھاٹھ ہیں!"

کھانے کی شکایت زیادہ ہونے لگتی تو کسی دن کالج کے آنریری سکریٹری صاحب باورچی خانے سروس روم (Service Room) ڈائننگ ہال کے ملازمین کو صلواتیں سناتے ایک آدھ بے محل شعر پڑھتے ہوئے گزر جاتے اور سارا گلہ جاتا رہتا۔

موجودہ طلبہ کو شاید یقین نہ آئے کہ 1915ء سے 1921ء تک (میرے عہد تعلیم میں جتنا اور جس طرح کا کھانا ڈائننگ ہال سے ملتا تھا اس سے بحیثیت مجموعی آج بہتر ہی ملتا ہے۔ کھانے کی طرف سے بے اطمنانی کے جو اسباب اس وقت بتائے جاتے تھے قریب آج بھی وہی قرار دیے جاتے ہیں۔ یہ خیال بھی اتنا صحیح نہیں ہے جتنا کہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زمانے میں

---

1. رشید صاحب نے فارسی کے مشہور شاعر رودکی کی غزل کے اس مصرع سے ڈائننگ ہال کے سدابہار کھانے کے ذائقہ کی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔

روایت ہے کہ بادشاہ نصر سامانی نے ایک بار ہرات کا سفر کیا اور عرصہ دراز تک وہاں کے پُر فضا مقامات اور میووں کے باغات نے اس کو ایسا مسحور کیا کہ وہ عرصہ تک واپسی کا ارادہ نہ کر سکا۔ امرا اور سپاہی تنگ ہو گئے لیکن وہ بادشاہ سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ آخر کو درباری شاعر رودکی کو پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینے کا وعدہ کیا کہ وہ کسی صورت سے بادشاہ کو بخارا واپسی پر راضی کر دے۔

رودکی نے چند اشعار ایسے سنائے کہ بادشاہ کے دل پر فوری اثر ہوا اور وہ ایسا بے خود ہوا کہ بغیر موزے پہنے گھوڑے کو بگٹٹ دوڑاتا ہوا لے گیا اور ایک منزل پر جا کر قیام کیا۔

مکمل شعر یہ ہے:

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی

یاد یار مہرباں آید ہمی

مولیاں بخارا کی ایک نہر کا نام ہے۔

کھاتے پیتے گھرانوں کے طالب علم آتے تھے جو ڈائننگ ہال سے علاحدہ یا اس کے علاوہ اپنی پسند کے کھانوں کا پرائیوٹ طور پر انتظام رکھتے تھے۔ آج کل کے طلبہ بھی اس طرح کا انتظام رکھتے ہیں۔

ڈائننگ ہال کا کھانا چاہے جیسا ہو، ڈائننگ ہال کا ادارہ یہاں کے طالب علم کی عام زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خوش طبعی کے جتنے اور جیسے محرکات علی گڑھ والوں کے لیے مدت دراز سے ڈائننگ ہال نے فراہم کیے ہیں یہاں کی عام زندگی میں شاید ہی کسی اور ادارے نے کیے ہوں۔ جو اصحاب علی گڑھ سے جا چکے ہیں ان سے گفتگو آئے تو باوجود ان شکایتوں کے جو اُن کو یہاں کے کھانے یا کسی اور بات سے رہی ہو ڈائننگ ہال اور اس کے ''متعلقین اور متعلقات'' تذکرہ لطف کا کوئی نہ کوئی فقرہ کہے بغیر نہ کریں گے۔ اپنے عہد میں میں نے اور ساتھیوں نے ڈائننگ ہال کے کھانے پر طبع آزمائی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ صاحب باغ میں جہاں صرف سینئر (Senior) طلبہ رہا کرتے تھے کبھی کبھی ڈائننگ ہال کے کھانوں پر ایک طرح کا سمینار (Seminar) منعقد ہوتا۔ طرح طرح کی تحقیقیں قائم کی جاتیں اور فیصلے صادر کیے جاتے۔ ان میں بیشتر تو سپرد قلم نہیں کیے جا سکتے، بعض قانونی اور بعض نہایت درجہ سائنٹفک اور ٹیکنیکل ہوتے۔ قارئین کے تفنن طبع کے لیے یہاں دو ایک عرض کیے جاتے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ''ان کی تحقیقات کی رو سے کالج کا کوئی طالب علم نہ تو شرعی گواہ ہو سکتا ہے نہ کسی الیکشن میں ووٹر (Voter) اس لیے کے جب تک کالج کی تعلیم حاصل کرتا اور ڈائننگ ہال کا کھانا کھاتا رہے گا نہ عاقل ہو سکتا ہے نہ بالغ''۔

ایک صاحب دائمی قبض میں مبتلا تھے۔ ان کے بارے میں تشخیص یہ ہوئی کہ ''جب تک ڈائننگ ہال کا کھانا نہ چھوڑیں گے، قبض ان کو نہ چھوڑے گا: اس لیے کہ ان کا ہاضمہ اتنا قوی اور ڈائننگ ہال کا کھانا اتنا ضعیف ہوتا ہے کہ کھانے کا فضلہ بھی ان کا جزو بدن ہو جاتا ہے۔'' اسی سے ملتی جلتی ایک تشخیص یہ بھی تھی کہ ''فضلے یا مادے کو توانائی (Energy) میں تبدیل کرنے کا انقلاب آفریں اصول اور انکشاف کچھ اسی طرح کے کرشمے کا رہین منت تھا۔''

کالج کے تمام شعبوں کی طرح ڈائننگ ہال کا ڈسپلن بھی بہت سخت تھا۔ ایک سے ایک بگڑے دل طالب علم کیسے کیسے متمدن نیم متمدن یا غیر متمدن دیار یا خاندانوں سے آتے تھے لیکن مانیٹر اور ڈائننگ ہال کے عملے سے کبھی تعرض یا غرش نہیں کر سکتے تھے۔ ڈائننگ ہال ایسی لیبوریٹری بھی شاید ہی کہیں نظر آئے۔ ہر طالب علم کو اختیار تھا کہ وہ مقررہ قیمت ادا کر کے اپنے لیے کوئی اور چیز پکوائے لیکن کھانا پڑتا تھا ڈائننگ ہال ہی میں سب کے ساتھ ایک ہی میز پر! اس لیے ساتھیوں کا لحاظ کر کے عموماً رئیسانہ ٹھاٹھ کے کھانوں کی فرمائش شاذ و نادر ہی کی جاتی۔ فرمائش چاہے مرغ مسلم کی ہو یا تنجن یا مونگ کی دال یا شوربا یا کھچڑی کی ان سب کا نام و پتا ایک ہی تھا یعنی ''پرہیزی''! طالب علم کی توجہ دلانے پر آواز یہی دی جاتی فلاں صاحب کا ''پرہیزی'' لاؤ۔

اوپر ڈائننگ ہال کی مثال لیبوریٹری سے دی گئی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ بنیادی کھانے تو چند ہی پکتے۔ لیکن سروس یا ریسرچ روم میں لیب اسسٹنٹ (Lab Assistant) یا باورچی چشم زدن میں ایک کھانے کو دوسرا کھانا بنا دیتے۔ مثلاً کسی کا پرہیزی ہے شامی کباب یا سیخ کباب یا کوفتہ یا قیمہ، لیکن باورچی خانے میں صرف ایک جز و تیار کی جاتی یعنی ابلا قیمہ۔ اسی قیمے کی قلب ماہیت اور مناسب ڈریسنگ کر کے اور شکل دے کر شامی کباب، سیخ کباب، کوفتہ یا قیمے کی شکل میں پیش کر دیتے۔ صرف ابلی ہوئی ترکاری موجود ہوتی۔ ضرورت کے وقت اس کو ترکاری قلیہ، شوربے دار ترکاری و ترکاری و گوشت یا محض ترکاری کی حیثیت دی جاتی۔ کھچڑی مانگی تو خشکہ اور دال مونگ کو اس طرح ملا کر پیش کر دیا کہ وہ کھچڑی ہو گئی۔ دال مونگ اور خشکہ الگ الگ طلب کیا گیا تو وہ پہلے سے موجود ہوتا۔ چنانچہ تمام نسخے چند مفردات سے تیار کر کے تیار کر دیے جاتے۔ آج بھی ایسا ہوتا ہو تو عجب نہیں یہ اور بات ہے کہ پہلے اس طرح کے شعبدوں کو یہاں کی زندگی یا کھیل کا ایک جز و قرار دے کر خوشی خاطر قبول کر لیتے۔ اب شاید ایسا نہ کرتے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کو اصطلاحی اسپورٹ کہتے ہیں اس کے ریکارڈ تو آج کل ٹوٹتے رہتے ہیں اور توڑنے والے دنیا میں نام پاتے ہیں لیکن جس کو حقیقی معنوں میں اسپورٹس مین شپ کہتے ہیں وہ مفقود ہے۔ حالاں کہ اسی کو میں افراد اور سوسائٹی دونوں کی سب سے اعلیٰ صفت (خلاصۂ انسانیت) سمجھتا ہوں آپ بھی سمجھتے ہوں تو بڑی خوشی ہوگی۔

طنز وظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔ یہی کچی بارک اور ڈائننگ ہال علی گڑھ سے باہر کہیں نصیب ہوئے ہوتے تو کچھ تعجب نہیں طبیعت یا تو طنز وظرافت کی طرف مائل ہی نہ ہوتی یا لکھنے کا وہ انداز میسر نہ آتا جو یہاں آیا۔ اس لیے کہ ان محرکات ہی سے جن کا بہت کچھ مدار ماحول اور مطالعے پر ہوتا ہے ان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ علی گڑھ اور متعلقہ ادارے جن میں ڈائننگ ہال بھی ہے ایک زندہ قوم کی امیدوں اور عزیمتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان اداروں میں اگر کوئی خلل راہ پائے گا تو وہ نوجوانوں میں بیزاری کا یا بداطواری پیدا کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان کی طنز وظرافت کا نشانہ بنانے اور اصلاح کرانے میں معین ہوگا۔ جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز وظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے اسی حد تک اس کی بڑائی کا درجہ متعین ہوتا ہے۔

مقررہ یونی فارم میں، مقررہ اوقات میں، مقررہ آداب کے ساتھ ڈائننگ ہال جا کر ہر طرح کے ساتھیوں کے ہمراہ سالہا سال کھانا، پینا، ہر موضوع پر آزادی کے ساتھ گفتگو کرنا، طبیعت کتنی ہی بدحظ یا افسردہ کیوں نہ ہو کھانے کی میز پر اچھے لوگوں کے طور طریقے ملحوظ رکھنا، مانیٹروں (Monitors) منشیوں، نوکروں سے طرح طرح کے مواقع پر عہدہ برآ ہونا، ایسی باتیں تھیں۔ جو سیرت میں توازن اور شخصیت میں دل آویزی پیدا کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اپنی کوتاہیوں کے باوجود ڈائننگ ہال آج بھی ہمارے طلبہ کی سیرت پر بحیثیت مجموعی صحت مند اثر ڈال رہا ہے اور یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے یہ بات مسلسل محسوس کی ہے کہ جب بھی کسی وجہ سے ڈائننگ ہال کچھ دنوں کے لیے بھی بند رہا اور کھانا کمروں پر بھیجا گیا بحیثیت مجموعی طلبہ کے عام ڈسی پلن (Discipline) میں اختلال واقع ہوا۔ جن لوگوں میں ساتھ کھانے پینے کا دستور نہیں، ان میں کبھی اتحاد خیال واتحاد عمل نہیں پیدا ہو سکتا!

ایم۔اے۔او۔کالج میں ہر مہینے ایک آدھ بار انگلش ڈنر (Dinner) ہوتا اس کی معمولی سی فیس ہوتی۔ ڈنر کی صدارت بالعموم انگریز پروفیسروں میں سے کوئی کرتا۔ کبھی کبھی یورپین خواتین بھی مدعو ہوتیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں کے طلبہ چھری کانٹے سے کھانا کھانے کے علاوہ ان کے آداب سے بھی واقف ہو جائیں جو کھانے کی میز پر ملحوظ رکھے جاتے ہیں، یہ بڑا اچھا

اور مفید طریقہ تھا۔ ہم میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو چھری کانٹے سے کھانا کھانے کے طریقے اور میز کے آداب سے پوری طرح واقف ہوں۔ یہ کوئی قابل فخر بات نہیں ہے کہ ہم کو میز پر اناڑیوں کی طرح چھری کانٹے استعمال کرتے دیکھ کر دوسرے ہم پر ہنسیں یا ترس کھائیں۔

علی گڑھ کے طلبہ کا یہ امتیاز رہا ہے کہ وہ اہم شخصیتوں سے ملنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے، بولنے اور ہر طرح کے موقعوں پر مقررہ آداب سے عہدہ برآ ہونے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ استعداد کچھ تو اس زمانے کے عام مسلمان گھرانوں کی روایات کی دین تھی۔ لیکن اس کی بہت کچھ تربیت ان یورپین پروفیسروں سے ملتی تھی جو دوسرے موقعوں کے علاوہ کھانے کی میز پر یا کھیل کے میدان میں ساتھ ہوتے اور ضروری آداب سے ہم کو آشنا کراتے رہتے۔ اس طرح ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور جھجکنا، ہچکچانا ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتا۔ یہی وہ صلاحیت تھی جس نے ''علی گڑھ بوائے'' کو اس زمانے میں خاص طور پر ممتاز کر دیا تھا اور جہاں کہیں کوئی معرکہ درپیش ہوتا، مثلاً قحط یا وبا وغیرہ وہاں گورنمنٹ کی طرف سے مدعو کیا جاتا اور اس مہم کو سر کرتا!

انگریزوں کے چلے جانے کے بعد کہا جانے لگا ہے کہ اس طرح کے کھانے پینے کے طریقوں کے سیکھنے برتنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یورپین طریقے سے کھانے کا دستور اب ہندوستان ہی میں نہیں تقریباً ساری متمدن دنیا میں عام ہو گیا ہے اور ان طریقوں سے واقف ہونا ایک طور پر شائستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اب کوئی خاص تعلق انگریزوں سے نہیں ہے۔ آج کل اہم اور اعلیٰ تقاریب میں جہاں دوسرے ممالک کے سربرآوردہ اصحاب خورد ونوش پر مدعو ہوتے ہیں ہمارے بعض اکابر کھانے، پینے، ہنسنے، بولنے اور شائستگی کے آداب ملحوظ رکھنے میں ایسی غفلت برتتے ہیں یا ان سے اس درجہ ناواقف ہوتے ہیں کہ دوسرے در پردہ ان سے متنفر ہوتے ہیں یا ان پر ہنستے ہیں۔ اس کا زیادہ تر سبب یہ ہے کہ ان اکابر نے یا تو تمیزدار لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھانے کے آداب نہیں سیکھے یا کھیل کی مناسب تربیت نہیں پائی!

آج کل جب ''ایک عالمی حکومت'' کے قیام پر زور دیا جا رہا ہے ''ایک عالمی دسترخوان'' پر بیٹھنے کے مطالبات بھی پورے کرنے ہوں گے۔ اوّل الذکر کا خواب شرمندۂ تعبیر

ہو یا نہ ہو موخرالذکر کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ عام طور سے دیکھا ہے کہ جس سوسائٹی میں لوگ الگ تھلگ رہتے ہیں، یا رکھے جاتے ہیں، وہاں کے افراد اپنے آپ پر اعتماد کرتے ہیں نہ دوسروں کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تنگ نظر اور خود پسند بھی ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر اعلیٰ کام کرنے کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں نہ ایسا کرنے کو حوصلہ کر سکتے ہیں!

علی گڑھ یونی ورسٹی کی حیثیت محض ایک درسگاہ کی نہیں ہے اس کی نوعیت ایک وسیع خاندان کی بھی ہے۔ ایسا خاندان جو ہر طبقے اور مزاج کے "خورد و کلاں" پر مشتمل ہو۔ طلبہ کی اقامت گاہوں کے آس پاس اساتذہ اولڈ بوائز (Oldboys) اور دوسرے چھوٹے بڑے ملازمین اور متوسلین کے خاندان بھی دور اور نزدیک پھیلے ہوئے ہیں۔ یونی ورسٹی کے کسی سکونتی مکان میں بیرونی یا غیر متعلق شخص کو ذاتی حیثیت سے رہنے سہنے کی اجازت نہیں۔ شریف نوجوان طلبہ کی موجودگی کا احساس ان خاندانوں کو اور ان خاندانوں کی رہن سہن اور عزت و ناموس کا لحاظ ان طلبہ کو غیر شعوری طور پر رہتا۔ اس طرح شریف گھرانوں کی روایات کا پاس مدت الایام سے ہمہ وقت دونوں کو رہتا آیا ہے۔ اس لیے یہاں کوئی ایسی نامناسب بات آسانی سے راہ نہیں پا سکتی جو ہماری دیرینہ قیمتی روایات کو مجروح کر سکے۔ چنانچہ جب سے یہ ادارہ قائم ہے آج تک کوئی ایسا حادثہ اس کے حدود کے اندر پیش نہیں آیا جو ہماری دیرینہ شرافت کے منافی ہو۔

علی گڑھ کی روایات کی دھوپ چھاؤں میں مختلف دیار، مختلف طبائع اور طبقات کے جتنے طلبہ ایک دوسرے کے کمروں میں، بورڈنگ ہاؤسوں میں، بورڈنگ ہال میں، کھیل کے میدانوں میں، یونین میں، مسجد میں، باغ میں، بازار میں، جماعت اساتذہ کے اراکین سے، اولڈ بوائز سے متواتر اور مسلسل ملتے جلتے رہتے ہیں اتنے شاید ہی کہیں اور نظر آئیں۔ اس طور پر ظاہر ہے، یہاں کے طلبہ میں فرخی، فرزانگی اور فراز بینی کے اوصاف پیدا ہوں گے جو اعلیٰ ظرافت و طنز نگاری کے لیے ضروری ہیں۔ علی گڑھ نے اچھے طنز نگار بھی پیدا کیے لیکن وہ جلن کے اتنے پیداوار نہ تھے جتنے جلال کے۔ ان میں اتنی بد دلی یا بیزاری نہ تھی جتنی برہمی، وہ اتنے بد مزاج یا بد باطن نہ تھے جتنے بے باک اور بے پناہ معیاری طنز کے لیے یہ شرائط ضروری ہیں۔

انگریزی سوسائٹی کے طور طریقوں سے آشنا کرانے کے لیے کالج میں ''مسز ٹول سوسائٹی'' تھی جس میں ہر مہینے دو ایک بار انگریزی میں مضامین پڑھے جاتے اور ان پر بحث ہوتی۔ اس کے علاوہ دیر تک دوسرے مسائل پر گفتگو رہتی۔ بلائے جانے والے بالعموم سینئر (Senior) طلبہ ہوتے یا وہ لوگ جو کالج کی اقامتی زندگی میں کسی اور حیثیت سے ممتاز ہوتے، مثلاً اچھے مقرر، اچھے کھلاڑی، سنیئر مانیٹر (Senior Monitor) کبھی کبھی ایسے طالب علم بھی جن کے بزرگ اپنے خاندان یا خدمات یا مناسب جلیلہ کے اعتبار سے قوم، ملک یا حکومت میں سر برآوردہ ہوتے لیکن مضمون پڑھنے والے کے نام بلاوا آتا تو اکثر وہ بچنے کی کوشش کرتا، اس لیے کہ اس مجلس میں ٹول صاحب موجود ہوتے اور یہی ایک ایسا موقع ہوتا جب موصوف کی نزدیکی حاصل ہوتی جس سے عام طور پر لوگ گھبراتے تھے۔ ٹول صاحب بڑے کم گو اور کم آمیز تھے۔ نپی تلی بات کرتے اور مقررہ آداب سے ہٹ کر مسکرانا تک گوارا نہ کرتے تھے۔ اگر کبھی خوش طبعی کا بھی کوئی فقرہ کہہ دیتے تو لطف لینے سے پہلے سوچنا پڑتا کہ:

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں[1]

اس صحبت میں حاضرین کی مدارات صرف کافی سے کی جاتی جو نہایت درجہ بدمزہ ہوتی۔ اس زمانے میں کافی کا ذوق بہت کم لوگوں کو تھا۔ پھر اس کو گوارا بنانے یا ''مزہ منھ کا بدلنے کے لیے'' کوئی چیز نہ ہوتی لیکن مسز ٹول کی خاطر اور مسٹر ٹول کے ڈر سے اس کو فرو کرنا ہی پڑتا۔ اس کے بعد اس سے بھی دشوار گزار مرحلہ میزبانوں کے سامنے انگریزی میں گفتگو کرنا ہوتا۔ کافی پینے اور انگریزی بولنے کی جس آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا، اس پر بس یوں سمجھیے غالبؔ کا مشہور شعر ہم پر صادق آتا:

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے
(غالبؔ)

---

[1] پورا شعر یہ ہے:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لیکن اس میں شک نہیں کچھ ہی دنوں بعد ''ہیا وکھل جاتا'' (معلوم نہیں اس پوربی فقرے سے کتنے پوربی دوست واقف ہوں گے!)

ٹول صاحب کا ایک واقعہ پچھلے اوراق میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں ایک اور سن لیجیے۔ایک شب موجودہ جوبلی گراؤنڈ میں دوز بردست پارٹیوں میں بلوا ہو گیا۔ لاٹھیاں چلیں اور فریقین بری طرح زخمی ہوئے۔صبح کالج میں خاصی تشویش پھیلی ہوئی تھی کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں سرسید ایسٹ کا پہلا کمرہ پرنسپل کا آفس تھا۔جن دواشخاص کے سبب سے یہ ہنگامہ ہوا تھا ان کی آفس میں پیشی ہوئی۔ٹول صاحب مسکرائے۔متحاربین کی تین چوتھائی ہمت یا ''ہیکڑی'' تو اس مسکرانے ہی نے سلب کرلی، اس کے بعد موصوف نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا ''میں سمجھتا ہوں یہ لڑائی دو گہرے دوستوں میں ہوئی (اور یہ واقعہ تھا) اس لیے تم ہی دونوں کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ آئندہ تمھارا باہم دگر کیا سلوک ہوگا۔فی الحال میں دخل دینا نہیں چاہتا۔اچھا بیک روم (Back room) میں چلے جاؤ اور جو کچھ فیصلہ کرو مجھے آکر بتاؤ'' اور گردن کو ہلکی سی جنبش دے کر مسکرائے۔اس سے فریقین کا رہا سہا دم خم بھی جاتا رہا۔ دونوں بیک روم میں گئے اور جلد ہی واپس آکر بتایا کہ جانبین نے صلح کرلی۔ٹول صاحب نے فرمایا ''اچھا ہاتھ ملاؤ۔'' دونوں نے ہاتھ ملائے۔ٹول صاحب پھر مسکرادیے اور فریقین بھاگ کھڑے ہوئے۔تصفیے کے تئیں کتنے نازک مرحلے ٹول صاحب نے صرف تین طرح سے مسکرا طے کردیے۔

کالج کے عہد میں ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الغرض[1] کا شمار طلبہ کے بڑے اداروں میں ہوتا تھا۔اب بھی کچھ کم نہیں ہے۔1890ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسے قائم کیا تھا۔اس کے دو مقاصد بہت اہم تھے۔ایک نادار لیکن ہونہار طلبہ کے لیے مالی امداد فراہم کرنا، دوسرے کالج کے بارے میں قوم اور ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہو اس کو دور کرنا۔اس طور پر انجمن کا کام سرسید کے مقاصد کو

---

[1] اس سوسائٹی کے بارے میں مزید معلومات ''حیات آفتاب'' مرتبہ خان بہادر الحاج ڈپٹی حبیب اللہ خاں صاحب 1955ء سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

آگے بڑھانا تھا۔ جب سے آج تک انجمن وہ فرائض یکساں تندہی سے بجا لا رہی ہے۔ ہر سال تعطیل میں طلبا ملک کے مختلف دور و نزدیک حصوں میں وفد لے جاتے ہیں اور جو کچھ جمع ہوتا ہے اسے انجمن کے فنڈ میں داخل کرتے ہیں۔ لاکھوں روپے جمع کیے، ہزارہا طلبا کو مدد پہنچائی۔ مستقل آمدنی کے لیے اپنے سرمائے سے دو عمارتیں بھی تعمیر کر لیں، کچھ زیر تعمیر ہیں۔ طلبا کی اس نوعیت کی اتنی قدیم، نیک نام اور کامیاب انجمن ہندوستان کی شاید ہی کسی تعلیم گاہ میں نظر آئے۔ اس انجمن نے نہ صرف طلبا میں درس گاہ کی الفت اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کیا، بلکہ علی گڑھ کو تاریخی اہمیت دینے میں جو خدمات انجام دیں ہیں ان کو مقررہ خانوں میں درج کر کے تو نہیں پیش کیا جا سکتا لیکن ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں روپے کی فراہمی پر اتنا زور دینا مقصود نہیں ہے جتنا اس پر کہ سوسائٹی کی خدمت کے طفیل طلبا کے کردار میں کتنی شائستگی اور محکمی آتی تھی۔ غیر متوقع مقامات پر غیر معمولی حالات میں پرانے طلبا سے ملتے تھے تو کالج کی روایات اور کالج میں اپنی زندگی کو یاد کر کے ایک دوسرے سے کس درجہ مسرور اور متاثر ہوتے تھے۔ اب بھی یہاں کے جو طلبا تعلیم سے فارغ ہو کر زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں مصروف و منہمک ہیں، جب کبھی اور جہاں کہیں ملیں گے علی گڑھ کا زمانہ یاد کر کے اور یاد دلا کر تھوڑی دیر کے لیے بالضرور خوش وقت اور دلشاد ہو لیں گے۔ کالج کی شہرت کو پھیلانے اور بابرکت بنانے میں ہمارے کھیل کی ٹیموں اور ڈیوٹی سوسائٹی کے وفود کو بڑا دخل ہے۔

میں اس دلیل کو زیادہ قوی نہیں سمجھتا کہ چونکہ اب حکومت کی طرف سے مالی امداد خاطر خواہ مل جاتی ہے اس لیے سوسائٹی کے وفود بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ یونیورسٹی کو مالی دشواریوں سے نجات ملی۔ اس خوش طالعی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس ادارے کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب طویل وقفوں اور طرح طرح کی کوششوں کے بعد کسی عطیے کے وصول ہونے پر ہم کس طرح غزل خواں (دراصل قصیدہ خواں!) ہوا کرتے تھے! بایں ہمہ میں حکومت کی امداد پر سولہ آنے (یا سونئے پیسے!) تکیہ کرنے کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ ہم کو وہ تمام نعمتیں کیوں نہ میسر آ جائیں جن سے احمقوں کی دنیا معمور بتائی جاتی ہے

پھر بھی ہم کو قوم اور ملک سے وہ رابطے قائم رکھنے پڑیں گے جن سے یہ دانش گاہ اب تک برومند رہی ہے۔ ہم ایسا کرنے پر ایک طور سے اخلاقاً معمور ہیں یہ بات ہم کو نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ اس ادارے کو حکومت نے نہیں بلکہ قوم نے بعض نہایت اہم تاریخی اور تہذیبی مقاصد کے تحفظ اور ترقی کے پیش نظر قائم کیا تھا۔ اس طور پر اس کے سپرد کچھ تاریخی ذمے داریاں رہی ہیں جن سے انحراف یا پہلو تہی کرنا آئین دیانت وحمیت دونوں کے منافی ہوگا۔ اس کو مقررہ محور پر قائم رکھنے میں قوم نے اپنی بہترین متاع صرف کی ہے اس لیے اس کی بہترین توقعات بھی اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔

آزادی ملنے پر حالات بہت بدل گئے ہیں اور یہ تبدیلی ہر اعتبار سے مبارک اور امید افزا ہے۔ لیکن ظاہر ہے نہ تو ہم قوم کے الطاف واعانت سے کسی حال میں بے نیاز رہ سکتے ہیں، نہ قوم کو اپنی خدمت اور عقیدت سے محروم رکھنا گوارا کریں گے۔ اس لیے مناسب حدود کے اندر رہ کر اس کا التزام رکھنا پڑے گا کہ ہم قوم کی صالح اور صحت مند توقعات کو پورا کرتے رہیں اور ان شعائر اور ان روایات کو نظر انداز نہ کریں جو اس ادارے کی پسندیدہ امتیازی خصوصیات رہی ہیں اور ہم کو بطور ایک قیمتی ورثے کے ملی ہیں۔ نظر برآں میں اس کا موئد ہوں کہ نہ صرف ڈیوٹی سوسائٹی بلکہ خود یونیورسٹی کے وفود ملک میں دورے کیا کریں۔ اس طور پر ہم ایک دوسرے کی دشواری اور ایک دوسرے کے عزائم سے واقف رہ کر ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہیں۔ اسی طرح کی کوئی بات رہی ہوگی جس کے پیش نظر اقبال نے کہا ہے!

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ[1]

''ڈیوٹی سوسائٹی'' سے دیرینہ تعلق کے لوازم میں ایک بات یہ بھی رہی ہے کہ مجھے طرح طرح کے مواقع اور مباحث پر کثرت سے خطوط اور مضامین لکھنے پڑے ہیں۔ یہ کاروباری انداز کی خط وکتابت نہ ہوتی بلکہ ایسے اصحاب سے ہوتی جن سے سوسائٹی یا کسی دوسرے کار خیر

[1] مکمل شعر یہ ہے:

امت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کے لیے عطیات کی درخواست کی جاتی یا وہ حضرات ہوتے جو سوسائٹی کے مقروض ہوتے لیکن اس بار سے سبکدوش ہونے پر مائل نہ ہوتے۔ اس سلسلے میں موخرالذکر جیسے عجیب وغریب خطوط لکھتے تھے۔ ان سے کیسی کیسی نفسیاتی گتھیوں کا انکشاف ہوتا تھا۔ ان دوستوں اور عزیزوں کو ایسے خطوط لکھتے کہ وہ نہ رنجیدہ ہوں نہ مشتعل، اور اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں جو سوسائٹی کی طرف سے ان پر عائد ہوتا تھا، اچھا خاصا مشکل لیکن دلچسپ مشغلہ تھا ایسے خطوط لکھنے میں جس تحمل وتوازن، خیراندیشی خوش مذاقی اور کبھی کبھی گلہ مندی یا آزردگی کا اظہار کرنا پڑتا، وہ میرے طورطریقوں نیز میرا سلیقہ تحریر کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ کالج کے عہد سے آج تک طرح طرح کے مباحث پر جتنے مضامین، خطبے پمفلٹ اپنے یا دوسروں کے لیے، لکھنے پڑے، میرا خیال ہے طالب علمی کے عہد میں علی گڑھ میں شاید ہی کسی اور کو لکھنے پڑے ہوں۔

کالج کے مقاصد کی حمایت واشاعت کے لیے 1892ء میں خان بہادر چودھری خوشی محمد خاں ناظر (علی گڑھ) نے برادر ہڈ[1] (Brother hood) کی بنیاد ڈالی جس میں اراکین اپنی آمدنی سے ایک فی صدی کالج کو دیتے تھے اور سالانہ ڈنر (Dinner) کرتے تھے۔ یہ جلسے 1897ء میں بند ہو گئے۔ 1898ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے دوستوں اور رفیقوں کے مشورے سے سابق طلبہ کے ڈنر کو پھر شروع کیا۔ چنانچہ 5/مارچ 1990ء کو ''اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' کا باضابطہ انعقاد ہوا۔ ڈیوٹی سوسائٹی، برادار ہڈ، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن طلبہ کی قائم کی ہوئی انجمنیں تھیں، جو کالج کے مقاصد کے پھیلانے اور باہمی یگانگت نیز کالج سے رشتۂ الفت قائم رکھنے میں ساعی رہتی تھیں۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے کارناموں میں اولڈ بوائز لاج اور آفتاب[2] ہوسٹل کی تعمیر، مسلم یونی ورسٹی کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے سرمائے کی فراہمی، سالانہ اجتماع اور وظائف تعلیمی کا مہیا کرنا رہا ہے۔ آج کل اس کی سرگرمی موخرالذکر دو خدمات تک محدود ہے۔

---

1. ملاحظہ ہو: حیات آفتاب، مصنفہ ڈپٹی حبیب اللہ خاں، ص: 15

2. جس کی تحریک اور تعمیر کا سہرا ڈپٹی محمد حبیب اللہ خاں صاحب مرحوم (1868ء-1961ء) (ولادت منزل) کے سر ہے۔

اس کے عروج کا زمانہ غالباً مولانا شوکت علی کی سکریٹری شپ کا دور تھا۔ تقریباً اس زمانے سے ایسوسی ایشن اور یونی ورسٹی کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ کشیدگی اور بدمزگی بڑھی جو دونوں اداروں کی بدنامی کا باعث ہو کر مدتوں بعد اب کہیں ختم ہوئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یونی ورسٹی کے دور میں آفتاب ہوسٹل کی تعمیر کے بعد نہ تو ایسوسی ایشن کے سامنے تقاضائے وقت کے مطابق کوئی پروگرام رہا نہ اس کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے جس ممتاز مخلص اور فعال شخصیت کی ضرورت تھی وہ ایسوسی ایشن کو میسر آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اچھی اور اہم توقعات جو اس اچھے اور اہم ادارے سے کی جا سکتی تھیں پوری نہ ہو سکیں۔ اس سے علی گڑھ اور اس کے مقاصد کو کیسا اور کتنا نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جب میں یہاں آیا تو ایسوسی ایشن کی حیثیت اتنی معیاری یا مقصدی نہیں رہ گئی تھی جتنی میکانکی یا تفریحی۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ رہا ہو کہ مسلم یونی ورسٹی کی اسکیم (Scheme) معرض التوا میں پڑ گئی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے محاربات کا انجام خلاف امید ہوا تھا۔ ایسوسی ایشن اور کالج کے اعیان اکابر میں اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے کام کرنے والوں پر ایک طرح کی بے حوصلگی طاری ہو گئی تھی۔ سال میں ایک بار دور ونزدیک سے آئے ہوئے اولڈ بوائز کا اجتماع ہو جاتا۔ ڈنر پر پرانے نئے طلبہ اور کالج اسٹاف مدعو ہوتا۔ مولانا شوکت علی اور محمد علی موجود ہوتے تو تقریروں میں سیاسی نوک جھونک کی بھی نوبت آجاتی جس کے ہدف اکثر یورپین اسٹاف اور انگریزی حکومت کے پرستار ہوتے۔ کچھ اور ہو، حق ہو جاتا اور کھیل کود ہنسی مذاق کے بعد تقریب ختم ہو جاتی۔

اس زمانے میں زیادہ تر ایسے ہی اولڈ بوائز سالانہ تقریبوں میں شرکت ہونے کے لیے تھے جو گورنمنٹ یا ریاستوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے۔ سالانہ جلسوں کی رونق انھیں کے دم قدم سے تھی۔ ان جلسوں کی نوعیت ایک طرح سے انگریز افسروں کے کلب کی سی تھی جس کی چہل پہل، رونق اور روشنی ہم دور سے یا چھپ چھپا کر دیکھتے اور ترسا کرتے تھے۔ اولڈ بوائز نئے طلبہ سے ملتے تھے لیکن ملنے کا انداز اتنا غیر رسمی یا بے تکلفانہ نہ ہوتا جتنا ''سرکاری'' یا ''مربیانہ'' البتہ علی برادران ایسے تھے جو نئے طلبہ سے بے تکلفی شفقت اور محبت سے ملتے تھے۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ جب تک دونوں بھائی جیتے رہے ہمارے ہیرو (Hero) بنے رہے۔

اولڈ بوئز ایسوسی ایشن (Old Boys Association) کی سالانہ، بیش تر بندھی ٹکی، تفریحی سرگرمیوں کا کالج کے طالب علموں پر کوئی قابل لحاظ اعلیٰ اخلاقی اثر نہیں پڑتا تھا۔ نئے طلبہ بالعموم یہ دیکھ کر خوش ہوتے کہ تقریب میں آئے ہوئے اولڈ بوائز کتنے بڑے عہدوں پر تھے، کتنے اچھے اور قیمتی سوٹ پہنتے تھے، کس ٹھاٹ سے رہتے تھے اور آپس میں کس طرح بے تکلف تھے، کبھی کبھی کافی سے زیادہ بے تکلف جیسے دنیا ان کے لیے ہر اندیشہ والم سے پاک کردی گئی ہو۔ ان تقریبوں کا اثر وقتی طور پر خاص تفریحی ہوتا تھا اور اس زمانے میں اس طرح کی تفریحوں ایک مقام بھی تھا۔ لیکن طلبہ کی آئندہ نسلوں پر ان کا اتنا اچھا اثر نہیں پڑا جتنا کہ اس طرح کے ادارے سے بجا طور پر توقع کرسکتے تھے۔ پھر آئے دن کی آپس کی مخالفتوں سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ایسوسی ایشن کی وقعت باقی نہ رہی اور وجود معطل ہو کر رہ گئی۔

پہلے سے بہتر ہونے کے باوجود اس ادارے کی حالت اور حیثیت آج بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ ان نئے اور اہم تقاضوں کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں سے عہدہ برآ ہوسکے، جن کا قوم، یونی ورسٹی اور ایسوسی ایشن تینوں کا سامنا ہے۔ قدیم روایتی پروگرام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بڑے خلوص، قابلیت، یک جہتی اور دلیری سے یونی ورسٹی کے دوش بدوش اور یونی ورسٹی کی حمایت میں ایسوسی ایشن کو کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی اور صورت (بحالت موجودہ) ایسی نہیں ہے جو اس ادارے کی اہمیت اور افادیت کو قائم رکھ سکے یا آگے بڑھا سکے۔ اس میں شک نہیں حوادث روزگار سے اولڈ بوائز تتر بتر ہوگئے جو رہ گئے ہیں وہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ بایں ہمہ علی گڑھ اولڈ بوائز سے اور اولڈ بوائز علی گڑھ سے علاحدہ نہ رہ سکتے ہیں اور نہ رکھے جاسکتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے جدا رہنا یا رکھا جانا دونوں کے بنیادی رشتوں کے منافی ہے [1]

---

[1] اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (ادارہ) کے بارے میں جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان کا اطلاق اولڈ بوائز پر (بحیثیت افراد) نہیں ہوتا۔ موخر الذکر اس ادارے کے "اعصاب واستخواں" یا روح ورواں رہے ہیں۔ نئی اور پرانی نسل کو ایک صحت مند نامی تصور سے وابستہ رکھنے میں ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے میرا متاثر نہ ہونا اور اولڈ بوائز سے ہونا قطعاً میرے ذاتی اور انفرادی تاثرات کی بنا پر ہے کسی اور چیز پر نہیں اور یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ 1915ء سے آج تک بیش تر اولڈ بوائز کی محبت ومرحمت کا جس طرح میں مورد رہا ہوں اس کو میں نے طرح طرح سے محسوس کیا ہے اور علی گڑھ سے مجھے جو شغف رہا ہے اس میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

کالج کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ ہسپتال کی وہی عمارت تھی جو آج ہے۔ سوا اس کے کہ اس وقت اس میں کمرے کم اور برآمدے زیادہ تھے۔ اب برآمدے کم کمرے زیادہ ہیں۔ انڈور وارڈ (Indoor ward) بالکل نہ تھا۔ عملہ اس سے بہت کم تھا۔ حکیم صاحب کا مطب مارلین روڈ پر اس جگہ تھا، جہاں اب ایک مختصر سی دومنزلہ عمارت ہے۔ جس میں کم وبیش پندرہ سولہ سال راقم السطور مقیم رہا۔ الہ آبادی کھپریل کا ایک طویل برآمدہ اور تین چار کمرے تھے جن کی چھت لوہے کی چادر اور مٹی سے پاٹ دی گئی تھی۔ اب وہاں کا نقشہ اس درجہ بدل گیا ہے کہ پہلی حالت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک حکیم صاحب تھے اور ایک ان کے مددگار جن کو حکیم صاحب ''منشی جی'' کہہ کر پکارتے تھے اور ہم سب حکیم جی کہتے تھے۔ ہمارے منشی جی کہہ دینے سے وہ اس قدر ناراض ہوتے کہ جوشاندے میں شربت نہیں ملاتے تھے! اور محبت و تعظیم سے حکیم جی کہنے پر کبھی کبھی وہ حکیم صاحب کی دوا کے بجائے ہمارے تجویز کردہ شربت اور مربے سے ہماری مدارات کرتے۔ ان کو مسکراتے ہوئے شاید کسی نے نہیں دیکھا۔ زیادہ تر وہ فلکِ ناہنجار کے شاکی رہتے یا ان لڑکوں کے جو بیمار نہ پڑتے، اس لیے کہ جوشاندہ بچ رہتا تو حکیم صاحب باز پرس کرتے۔ عموماً ہر مریض کو یا تو جوشاندہ ''دواے نزلہ'' تجویز کی جاتی یا سفوف ملین!

اس زمانے میں دوا تجویز کرنے میں جتنی توجہ صرف کی جاتی اتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اسی زمانے کی ہے، جس میں ذاکر صاحب کے تصرف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کرے۔ دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کروں گا! اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے، دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جس کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو، تیسرے یہ کہ اس حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی: ''میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا''۔

یعنی مرض دور نہ ہوا نہ سہی، دوا تو مزیدار تھی! پھر یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے مریض اپنے پیدائشی یا جمہوری حق سے محروم نہیں ہوتا، یعنی آئینی یا حفاظتی حدود میں رہ کر اس کو اپنی عاقبت یا صحت بگاڑنے یا سدھارنے کا حق اور اختیار حاصل رہتا ہے۔

ہسپتال میں ''بڑے ڈاکٹر صاحب'' سے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا ہمارا کھاتا ان کے اسسٹنٹ (Assistant) ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا، جن کو محض بر بنائے قافیہ یا حلیہ تمام کالج ہلاکت اللہ کہتا تھا، پستہ قد، سن رسیدہ، کاٹھی مضبوط، آنکھیں تیز اور بھوری، داڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس، آواز مخدوش، ہاتھ میں رعشہ، نسخہ لکھتے تو انگشت شہادت اچھلتی رہتی۔ اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لیے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست ادھر اُدھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اسی طرح کی مہم میں ہمرکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ ''قربان جائیے اس کمال پر، ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جار ہے ہیں اور ٹائپ بھی کرتے جاتے ہیں''۔

ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا کڑک کر بولے ''بدتمیز نکل جا ابھی ہسپتال سے''۔ وہ صاحب بھی فوراً چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ دوسروں نے پکڑ لیا اور ڈاکٹر صاحب سے زیادہ کڑک کر کہا ''یوں نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پر گر کر معافی مانگو ورنہ ہم سب تم کو یہیں مار ڈالیں گے۔ اس کے بعد جہاں جی چاہے جانا۔ گو ڈاکٹر صاحب کی شرافت نفس سے یقین ہے کہ تمھاری فرسٹ ایڈ (First aid) کرنے میں تامل نہ فرمائیں گے۔'' ملزم نے فوراً ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔ موصوف خوش ہو گئے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو راستے میں اپنے ساتھی کی طباعی کی داد دی اور ملامت بھی کی۔ اس نے کہا ''یہ سب ٹھیک ہے لیکن مجھے تو اس اندیشے نے بدحواس کر دیا کہ تم سب مجھے مار ڈالنے کے بجائے صرف مجروح کر کے چھوڑ دو گے تو ڈاکٹر صاحب اسی انگلی سے میری ڈریسنگ کریں گے!''

اس انگلی کا ایک کرشمہ سنیے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کی انگلی پک گئی تھی۔ میر پھویا قسم کے آدمی تھے۔ ہسپتال جا کر شگاف لگوانے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ تھوڑا بہت دوستوں نے سمجھایا اور بہت کچھ خود اس تکلیف نے سمجھایا۔ آخر کار آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ساتھیوں کے جلوس میں ان ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس اہتمام و اعزاز سے لائے کہ ایک شخص ماؤف انگلی کو پکڑے ہوئے تھا، دوسرا پہنچا اپنے قبضے میں کیے ہوئے تھا، تیسرے کے ہاتھ میں بازو، چوتھا بغل میں ہاتھ دیے ہوئے، پانچویں کے کندھے پر میر پھویا کا سر، بقیہ میں سے کچھ نے کمر کو

سہارا دے رکھا تھا اور سب مل کر جلوس کو منظم اور خاموش رکھنے کے لیے بآواز بلند ہدایت دے رہے تھے! جلوس کی شان کچھ اس طرح کی تھی جیسے کوئی سفید پوش گرہ کٹ، بھرے بازار میں جیب کاٹتے پکڑ لیا گیا ہو اور اسے ادھ موا کرنے کے بعد کوتوالی لے جا رہے ہوں۔ جوں جوں قافلہ ہسپتال کے قریب ہوتا جا رہا تھا، ہجوم اور ہمہمہ بڑھتا جاتا تھا۔ کتنے دنوں بعد اس جلوس نے شاعر کے تصور کو گدگدایا ہوگا کہ اس نے یہ مصرع موزوں کیا!

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا[1]

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ موصوف نے شگاف تجویز کیا، مریض نے ہچر مچر شروع کی، ساتھیوں نے کچھ منت سماجت سے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر ان کو خاموش کیا۔ چیر پھاڑ کا سامان منگایا گیا۔ بہ فحوائے

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست[2]

دوستوں نے ہاتھ ہی نہیں سارے اعضا و جوارح کو جہاں تہاں سے اس طور پر گرفت میں لے لیا جیسے میر پھویا کو مشین میں کس دیا گیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے آستین چڑھائی، ہاتھ میں نشتر لیا، انگشت شہادت پھوڑ کی مریض نے شور مچایا، ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ مارا:

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

ایک غیر متوقع چیخ سنائی دی، ہجوم میں ہلچل مچ گئی، ڈاکٹر صاحب نے اپنی انگلی پر نشتر مار لیا تھا!

---

[1] مکمل شعر یہ ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(ساحر لدھیانوی)

[2] مکمل شعر یہ ہے:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشان حالی و درماندگی

(سعدی)

ہسپتال میں کونین مکسچر بالعموم بطور دوا کے اور دودھ سوڈا بالخصوص بطور غذا کے تجویز ہوتا۔ کسی کے علیل ہونے کی اطلاع ملتی تو یہ نہ کہتے کہ کون صاحب کیا بیمار ہیں، صرف اتنا کہہ دیتے کہ فلاح صاحب دودھ سوڈے میں مبتلا ہیں۔ اس سے لوگ سمجھ جاتے کہ دوا، پرہیز، دیکھ بھال سب قابل اطمینان ہے۔

طالب علمی کے فوراً ہی بعد میں اسٹاف میں آگیا تھا۔ ایک ضرورت سے یونی ورسٹی کی طرف سے بمبئی جانا پڑا۔ ایک ہوٹل میں قیام ہوا ایک دن بیرر (Bearer) کو خانساماں سے کہتے سنا کہ ''فلاں کمرے کے صاحب کو دودھ سوڈا جائے گا۔'' میں چوکنا ہوا کہ یہ دودھ سوڈا تو کسی علی گڑھ والے کا تعاقب کر رہا ہے۔ پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب علی گڑھ کے طالب علم تھے! جا کر ملا تو کہنے لگے ''یہاں آتے ہی بیمار ہوگیا، ڈاکٹر کو کہاں دکھاتا ہم سب کی دوا غذا، تیمار دار، ہمیشہ سے دودھ سوڈا رہا۔ اسی کا یہاں سہارا پکڑا، چنانچہ اب بالکل اچھا ہوں۔''

منٹو سرکل میں اس ہسپتال کی ایک شاخ تھی جس کے انچارج ڈاکٹر خنداں تھے۔ نام کچھ اور تھا یہ ہیرو (Hero) تھے میرے ایک محترم کے تفنن شاعری کے، جس نے ان کو خلعت دوام بخشا۔ یہ نام بھی انھیں کا دیا ہوا ہے۔ خنداں اور ان کی شاعری پر عرصہ ہوا میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ مختصر سا قد شارٹ کوٹ ہیٹ اور پتلون میں ملبوس تینوں میلی، خستہ اور کاواک۔ بورڈنگ ہاؤس کے گشت پر نکلے ہوں یا کسی اور مقصد سے، دوا کی بوتلیں شیشیاں، سفوف کی پڑیاں، گولیاں سب قمیص کوٹ اور پتلون کی جیبوں میں موجود ہوتیں۔ زیادہ بڑی اور وزنی بوتلیں ہاتھ میں لیے ہوتے۔ بہت کم بولتے تھے نگاہ نیچی رکھتے۔ کوئی ''سلام علیک'' کہتا تو رک جاتے، نگاہ اوپر کر کے اظہار تخلص کرتے (مسکراتے) پھر پوچھتے ''دوا پیجیے گا'' مخاطب آمادہ نہ ہوا تو آگے بڑھ گئے، ورنہ نبض ہاتھ میں لے لی، ٹھیک اسی طرح جیسے بوتل کی گردن ہاتھ میں تھی۔ کسی کو دیکھتے یا نہیں جلد ہی ''چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ'' اور بوتل سے ایک خوراک براہ راست ملاقاتی کے گلے میں انڈیل کر روانہ ہو جاتے۔ چلتی پھرتی ڈسپنسری تھے۔ کالج میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی تشخیص، علاج یا طور طریقوں پر اعتراض کرتا اور کرتا بھی تو ان کے پاس جیب کی شیشیوں یا مسکرا دینے کے سوا کیا رکھا تھا، خود فرما چکے تھے کہ بس دو کام رہ گئے ہیں۔

مریضوں کو دوا دینا، اور حسینوں کو دعا دینا

اداروں سے قطع نظر ایم۔اے۔او۔کالج کے کتنے طرح طرح کے کردار بے اختیار یاد آتے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا ہے کہ سیرت اور شخصیت یا بحیثیت مجموعی میری قسمت کی تشکیل میں ان کو دخل ہو تو عجب نہیں۔ مثلاً میری سائڈ (سید محمود کورٹ مغربی) کا بیرا سراج۔1915ء میں پہلی بار ان سے سابقہ ہوا جہاں دس برس پہلے سے ان کا عمل دخل تھا۔ اب تک بفضلہٖ بقید حیات ہیں۔ ایک دن اتفاق سے نظر آ گئے۔ آنکھوں سے کچھ معذور ہو گئے ہیں۔ قریب پہنچ کر آواز دی تو پہچان گئے۔ کتنی باتیں اور یادیں تازہ ہو گئیں، ان کو میں نے ہمیشہ ایک ہی حال میں پایا۔ نہ خوش نہ ناخوش، نہ سراسیمہ نہ مستعجل نہ متامل۔ نہایت کم گو ہر سوال کا جواب مختصر سے مختصر الفاظ میں۔ اس اندیشے سے قطعاً بے نیاز رہ کر کہ جواب کے عواقب کیا ہوں گے۔ ہر کام مقررہ وقت پر کر ڈالنا، یہ ناممکن تھا کہ اس میں دیر یا سویر ہو۔

اس زمانے میں نو وارد طلبہ کو بیرے کبھی کبھی نظر انداز کر دیتے۔ کبھی مربیانہ انداز بھی اختیار کرتے۔ سراج میں شاید اس طرح کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ ہم میں ایسے بھی تھے جو طیش میں آ کر ان کو سخت سست کہہ ڈالتے تھے۔ دست درازی کرنے میں بھی شاید تامل نہ کرتے لیکن اس عہد میں بیروں (Bearers) کو مارنا سنگین جرم متصور ہوتا تھا۔ جو شخص اس کا مرتکب ہوتا اس کو کالج سے تو سخت سزا ملتی ہی، ساتھیوں کی نظر میں بھی اس کی وقعت گر جاتی اور کچھ دنوں بورڈنگ ہاؤس میں عام چرچا رہتا کہ فلاں شخص کو بیرر (Bearer) کو مارنے کے جرم میں سزا ملی۔ سزا کے سخت ہونے کے بارے میں یہ اصول کارفرما تھا کہ اگر طالب علم آپس میں مار پیٹ کریں تو زیادہ سزا دینے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ دونوں کو ایک دوسرے پر ہاتھ چلانے کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن نوکروں کی ہمت طالب علم پر ہاتھ اٹھانے کی نہیں ہو سکتی اس لیے نوکر کو مارنے کی سزا ہمیشہ سخت دی جائے گی۔

لیکن اس طرح کے ہر سلوک کا سراج کے ہاں صرف ایک جواب تھا وہ اپنے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے پھنسا لیتے اور جی میں آتا تو نگاہ اٹھائے بغیر ہاں یا نہیں کچھ کہہ دیتے ورنہ بالکل خاموش رہتے۔ جس وقت یہ اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے کر لیتے، بڑے سے بڑا سورما

بھی سپرڈال دیتا کہ 'سراج اپنے خول میں چلا گیا'، اب دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی!" چند سیاہ موٹی اور کھردری ہے، اس لیے بشرے سے اندازہ نہیں لگا جا سکتا تھا کہ ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ ڈائننگ ہال نہ ہوتا اور کھانا کمرے پر لانا ہوتا تو ساتھی بیروں کی عادت کے خلاف کسی طرح کی قیل وقال باورچی خانے میں کھانا تقسیم کرنے والے نہ کرتے۔ اپنی سائڈ کا کھانا لے کر چلے آتے اور ہر شخص کے کمرے میں اسی کے برتن میں چن دیتے اور انگیٹھی جلا کر رکھ دیتے۔ دوپہر کو شہر جانا اور اپنے کمروں کے طالب علموں کی ضرورت کی چیزیں خرید لانا معمول تھا۔ یہ کبھی نہ ہوا کہ سراج کوئی چیز بھول گئے ہوں یا دام پر لڑکوں سے حجت کی نوبت آئی ہو۔ یوں بھی اس زمانے میں حساب کرنے میں جھگڑنا، چاہے وہ کسی سے ہو، اچھی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ نہ کبھی بدتمیزی کی، نہ چوری کی، نہ انعام مانگا، کسی نے دے دیا تو اس پر شادمانی اور شکر گزاری کا بھی اظہار نہیں کیا کرتے ہوں تو ان کا کوئی خاص طریقہ ہوگا جس کا علم دینے والے کو کبھی نہ ہوا۔

1915ء سے اب تک ان کو یکساں حال میں دیکھ رہا ہوں، درمیان میں کیسے کیسے انقلاب آئے اور گزر گئے۔ اس دن سراج کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ اسی استغنا اور پامردی سے اسی جگہ پر جمے ہوئے ہیں، جہاں میں نے ان کو اور انھوں نے مجھ کو چھوڑا تھا، جیسے اس دنیا کا تمام ناؤنوش یا نالہ ونفیر، ان کے لیے "بدرد سرنمی آزرد" کا مصداق ہو۔

میں نے چھ سال مسلسل کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں گزارے اور صرف ایک پوسٹ مین سے سابقہ رہا، ان کا نام نہیں یاد رہا۔ ہم سب ان کو "شیخ جی" کہا کرتے تھے اور شیخ جی کا جیسا حلیہ ہو سکتا ہے بجنسہ ان کا تھا۔ ہمہ وقت خلجان میں مبتلا نظر آتے۔ چال ڈھال، جسم وجان، بات چیت سبھی سے، جیسے غلط پتے پر کوئی رجسٹری، بیمہ یا منی آرڈر دے آئے ہوں اور سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کریں، حالاں کہ شیخ جی کی نیکی سادگی اور ایمان داری کا طالب علموں پر اتنا اثر تھا کہ اگر وہ غلطی سے کسی وقت کسی کو کچھ کا کچھ دے بھی آتے تھے تو وہ بے چارہ خود پریشان ہو کر شیخ جی کے تعاقب میں بھاگتا پھرتا، لیکن وہ چیز ان کے حوالے کرتا تو شیخ جی کو نہ تو کوئی تعجب ہوتا نہ خوشی جیسے وہ چیز دیر سویر خود واپس آ جانے والی تھی، چنانچہ آ گئی اور بس!

ظاہر ہے کہ بڑی تعداد میں طلبہ کے خطوط اور منی آرڈر آتے ہوں گے، شیخ جی ہر طالب علم سے آشنا تھے، صورت سے اتنے نہیں جتنے اس کی آواز سے گھنٹہ بجا، کلاس ختم ہوئی، سارے لڑکے کلاس روم سے نکل آئے۔ کالج کے زمانے میں یونی فارم کی بڑی سخت پابندی تھی۔ چنانچہ مہدی منزل سے مشتاق منزل تک یونی فارم میں لڑکوں کا یہ ہجوم نہایت دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ اور باتوں سے قطع نظر کسی ادارے کو صرف اتنی سی بات پر بھی فخر کرنے کا حق حاصل ہوسکتا ہے کہ اس کے سایۂ عاطفت میں اتنے مہذب اور زندگی سے بھرپور نوجوان مجتمع ہیں۔ ہجوم اب بھی نظر آجاتا ہے لیکن یونی فارم کی وہ یکسانیت اور تعلیم یافتہ نوجوان کے مجمع کی وہ بے تکلف شائستگی یا شائستہ بے تکلفی جو اس زمانے میں عام تھی اب نہیں ملتی۔ ظاہر ہے اس عہد کا رہن سہن اطمینان وسکون اور رسم وروایات بھلی یا بری جیسی بھی تھیں وہ بھی اب دنیا کے کسی گوشے میں نظر نہیں آتیں!

اس موقع پر فرض کر لیجیے شیخ جی کا بھی گزر ہوا۔ لڑکوں نے گھیر لیا سبھی کہہ رہے ہیں ''شیخ جی میرا ہے؟'' یعنی میرا کوئی خط یا منی آڈر ہے اور شیخ جی بغیر کسی کو دیکھے صرف آواز پہچان کر کہتے جارہے ہیں ''آپ کا ہے'' یا ''آپ کا نہیں ہے'' یہ دونوں فقرے اتنی جلد جلد اور اس درجے بے اختیار ہو کر کہتے کہ اس زمانے میں تفریحاً ہم سب اس لہجے کی نقل کرنے لگے تھے۔ شیخ جی کا یہ کہہ دینا کہ ''ہے'' یا ''نہیں ہے'' کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔ نئے لڑکوں کو کبھی کبھی یقین نہ آتا اس لیے وہ خطوں کا پلندا دیکھنے پر اصرار کرتے اور شیخ جی کے قائل ہوجاتے۔ یہی نہیں، شیخ جی (Room fellows) روم فیلوز گہرے دوستوں یا آس پاس کے کمرے والوں کے خطوط ایک دوسرے کو دیتے تھے لیکن ملاقات ہونے پر چاہے اس کی نوبت دنوں بعد آتی ہمیشہ اس امر کی تصدیق کر لیتے کہ ''آپ کا لفافہ یا کارڈ فلاں صاحب کو فلاں دن دیا گیا تھا آپ کو مل گیا یا نہیں؟'' شیخ جی کا پوچھنا ہمیشہ درست نکلتا!

عید کے موقع پر ایک بار ایسا ہوا کہ شیخ جی اپنا تھیلا کہیں رکھ کر مسجد میں آگئے۔ نماز ختم ہوئی تو سب سے زیادہ معانقے شیخ صاحب کو کرنے پڑے لیکن بجائے اس کے کہ فریقین ایک دوسرے کو عید کی مبارک دیتے ہر لڑکا یہی کہتا ''شیخ جی میرا ہے'' اور شیخ جی یہی کہتے رہے کہ

''آپ کا نہیں ہے'' یا ''آپ کا ہے'' چنانچہ نہ لڑکوں کو اس خیال رہا کہ ان کو مبارک باد دیں نہ ان کو فرصت کہ یہ دیتے۔

ذاکر صاحب کے نام گھر سے بہت کم خطوط آتے تھے۔ تقریباً نہیں کے برابر۔ اس کی تلافی اس سے ہو جاتی کہ ڈاک خانے کے ذریعے گھی کا پارسل آتا رہتا۔ موصوف نے ایک آدھ بار خط کے بارے میں شیخ جی سے سوال کیا لیکن جواب یہی ملا کہ ''آپ کا نہیں ہے۔'' اس لیے پوچھنا ہی ترک کر دیا تھا۔ ہم سب کو اس سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ چنانچہ شیخ جی نظر آئے نہیں کہ ہم میں سے کسی نے آواز دی ''شیخ جی ذاکر صاحب کا خط ہے؟'' ساتھ ہی ذاکر صاحب کی آواز بلند ہوتی ''ہرگز نہیں شیخ جی، میں نے نہیں پوچھا ہے!'' ایک بار جب کہ ہم دونوں کا صاحب باغ، کی اوپر کی منزل میں قیام تھا۔ شیخ جی نیچے کی منزل میں خط بانٹتے نظر آئے۔ حسب معمول آواز دی گئی ''شیخ جی ذاکر صاحب کا خط ہے؟'' ساتھ ہی ذاکر صاحب کی صدا اس کی تردید میں بلند ہوئی۔ اس دفعہ انوکھی بات یہ ہوئی کہ دونوں آوازیں ہی نہیں دونوں اشخاص بھی ایک دوسرے کا پیچھا کرتے زینے پھاندتے شیخ جی تک جا پہنچے۔

کھمانی تفریح تھے، ٹریجڈی (Tragedy) تھے، بھید تھے، علامت تھے، تقدیر تھے، جانے کیا تھے، شاید یہ سب ایک ساتھ تھے۔ اتنے اور اس طرح کے بوڑھے کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا، چونچال اتنے کہ نوجوان نہیں بچے کا دھوکا ہوتا تھا۔ بات زیادہ دیر تک نہیں کر پاتے تھے۔ سپاہیوں کی طرح قواعد پریڈ کرنے لگتے اور معلوم نہیں کس کس زبان کے الفاظ میں پریڈ کے احکام نافذ کرتے۔ تمام جاڑے میلے بادامی رنگ کی روئی دار پوری آستین کی مرزئی، ویسا ہی روئی دار پائجامہ، اسی رنگ کا روئی کا کنٹوپ زیب تن رہتا۔ گرمیوں میں صرف کرتا اور لنگوٹی۔ پان بیچتے تھے۔ لکڑی کی چھوٹی سی بھدی گاڑی تھی جس پر سرکی ڈال رکھی تھی۔ وہ بھی جگہ جگہ سے خستہ تمام دن رات گئے تک اسی گاڑی کو کھینچتے ڈھکیلتے بورڈنگ ہاؤسوں کا چکر لگاتے رہتے۔

پان کے سامان کے علاوہ اپنی زندگی کے لیے جن چیزوں کو ضروری سمجھتے تھے وہ سب اسی گاڑی میں رکھ لی تھیں گویا یہ گاڑی نہ تھی پہیے پر ان کا مکان تھا! کانوں میں عجب طرح کی آواز

آنے لگتی جس سے معلوم ہو جاتا کہ آس پاس کہیں کھمانی آ گئے ہیں۔ کسی طرح یہ پتا نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کیا صدا لگاتے تھے، واقعی کچھ الفاظ تھے یا صرف حلق میں پھنسی ہوئی یا فضا میں بھٹکی ہوئی کوئی مبہم آواز یا صرف ایک گونج۔ پان کیا بناتے تھے صرف لیپ پوت کر دیتے تھے۔ اس کا ساز و سامان گاڑی کے اندر ہوتا، جو باہر سے بالکل نظر نہ آتا لیکن ان کا ہاتھ انھیں اجزا پر پڑتا جن کی ضرورت ہوتی ان کا بنایا ہوا پان کوئی ایسا شخص کھانا گوارا نہیں کر سکتا تھا جو پان کھانے کے آداب سے واقف ہو۔ اس لیے کہ پان کا انتخاب یا پان بنانے کے صاف ستھرے طریقے، یا پان کے اجزا کو جس معیار کا ہونا چاہیے وہ سارے کے سارے نظر انداز ہوتے تھے۔ آپ نے پان مانگا انھوں نے فی الفور بنا کر دے دیا۔ کتھا، چونا، پانی ٹپکتا ہوا۔ جن میں لتھڑی ہوئی انگلیاں دیکھ کر غالبؔ کے مصرع کی طرف خیال جاتا۔ ع

انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا[1]

ترنگ میں ہوئے، اور اکثر رہا کرتے تھے، تو پان دے کر فوجی قاعدے کا سلام کر دیا۔ آپ کی طبیعت گدگدائی تو کہہ دیا "کھمانی تمھاری قواعد دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔" کھمانی گاڑی کے اندر سے ڈنڈا نکال کر قواعد شروع کر دیتے، خود کمانڈ (Command) دیتے، خود ہی پریڈ کرتے، کیا کمانڈ دیتے تھے نہ وہ جانتے تھے نہ ہم آپ سمجھ سکتے تھے۔ کسی نے فرمائش کر دی۔ "کھمانی انگریزی ناچ دکھاؤ۔" کھمانی ڈنڈے کو میم صاحب قرار دے کر ناچنے لگتے جی میں آ گیا تو ڈنڈا پھینک دیا اور دو چار پینترے ہندوستانی ناچ کے بھی دکھا دیے۔ کھمانی بھولے بسرے یا عالمِ بے خبری میں محض ذرا دیر کے لیے اپنی بیوی کو یاد کرتے، جسے وہ میم صاحب کہا کرتے تھے۔ ہم سب بھی تفریحاً میم صاحب ہی کہہ کر ان کی بیوی کا ذکر چھیڑتے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کھمانی کی زندگی میں کہیں کوئی ٹریجڈی (کوئی غم ناک حادثہ) ہے جس کو وہ اپنی

---

[1] مکمل شعر اس طرح ہے:

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں

انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

غالبؔ

طرح طرح کی حرکتوں یا کرتبوں سے بھلانے کی کوشش کرتے ہوں۔ جیسے ایک سرو سنسان تنہائی میں اسیر ہوں جس سے رہائی نصیب نہ ہوتی ہو، کسی نے پان کے پیسے دے دیے تو احسان نہیں۔ کھمانی کسی شغل میں ہوں کوئی طالب علم قواعد پر یا ناچ کی فرمائش کر دیتا تو سب کام چھوڑ کر دکھانے بتانے لگتے۔

کھمانی کسی کو پہچانتے نہ تھے، پان ہر ایک کو بے تکلف دے دیتے تھے۔ کوئی دام دینا بھول جاتا یا اس وقت پیسے نہ ہوتے اور معذرت کر کے یا بغیر اس کے چلا جاتا تو ان کو خبر نہ ہوتی۔ اس کا جب جی چاہتا دام چکا دیتا۔ کھمانی یہ بھی نہ پوچھتے کہ دینے والا کون تھا، کب کے دام چاہیے تھے یا کتنے چاہیے تھے۔ جیسے پان دے کر وہ سب کچھ بھول جاتے، اپنے کو بھی، جیسے اس عالم میں پہنچ جاتے ہوں جہاں زمانہ خرام میں نہ قیام میں ہو!

کہیں ان کا ذکر آتا یا آواز آجاتی تو ایک طرح کی بشاشت کی لہر دوڑ جاتی۔ تھوڑی دیر کے لیے جیسے مصروفیت اور مکروہات ختم ہو جاتیں۔ گویا کھمانی کا دور تھا۔ ''ان کا پان کھایا جائے گا اور ان سے جی بہلایا جائے گا۔'' ایم۔ اے او۔ کالج کے عہد میں بی۔ اے، ایم۔ اے کا امتحان دینے الہ آباد جانا پڑتا تھا اور مسلم بورڈنگ ہاؤس میں طعام و قیام کا بندوبست ہوتا۔ ہر طرح کی آسایش اور آزادی میسر رہتی۔ وہاں کے بورڈرس (Boarders) اور ان کے مہتمم بڑے اخلاص و احترام سے پذیرائی کرتے اور ہمارا بڑا خیال رکھتے، بایں ہمہ محسوس کیا گیا کہ سب کچھ ملتا ہے علی گڑھ نہیں ملتا۔ یہ کمی کس طرح پوری کی جائے۔ ایک دن اسی طرح کی گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک طرف سے کھمانی کی آواز آئی۔ سب اُچھل پڑے کہ ''بس کھمانی کو ساتھ لیا جائے گا۔ ہم جو خلا محسوس کر رہے تھے اس کو صرف کھمانی پورا کر سکتے تھے۔'' چنانچہ ان کو الہ آباد لے گئے۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں کھمانی کی آمد کی دھوم مچ گئی جہاں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا:

سنتے ہیں آپ کے الہ آباد کے مایۂ ناز شہری پنڈت موتی لال نہرو ولایت تشریف لے گئے تو ہندوستان کے یگانۂ روزگار غلام پہلوان کو وہاں کے پہلوانوں سے روشناس کرانے ہمراہ لے گئے تھے۔ آج ہم علی گڑھ کے پہلوان کھمانی کو الہ آباد لائے ہیں۔ ''بیا ور یدگر انیجا بود پہلوانے!''

کسی کو معلوم نہ تھا کمانی کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور ان کی سرگزشت کیا تھی۔ ایک دن معلوم ہوا کہ اسی فضا میں گم ہو گئے۔ جہاں کتنے دنوں سے ان کی صدا گم ہونے کے لیے سرگرداں تھی!

گذشتہ اوراق میں جن اصحاب یا اداروں کے بارے میں عرض کیا گیا ہے ان کے علاوہ کتنے اور ممتاز منفرد کردار ذکر ہونے سے رہ گئے۔ جو ذہن کے دُھندلے افق پر بار بار اور بے اختیار ابھرتے ہیں۔ لیکن ان صفحات میں ان سب کا ذکر میرے لیے بڑا مشکل ہے۔ اس عہد کے بہت سے ایسے ساتھی ہوں گے جن کو یہاں کے بعض دوسرے کرداروں سے وہی شغف رہا ہوگا جو مجھے اپنے پیش کردہ کرداروں سے رہا ہے۔ البتہ اتنا یقین ہے کہ جن لوگوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے اس عہد کے تقریباً سارے رفقا مانوس ہوں گے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جب سے یونی ورسٹی معرض وجود میں آئی ہے مختلف عہد کے طلبہ کو یہاں کے بعض دوسرے غیر معمولی کرداروں سے سابقہ رہا ہوگا اور وہ ان کو بجا طور پر وہی اہمیت دیتے ہوں گے جو میں نے دی ہے۔ بہت ممکن ہے یونی ورسٹی کے دَور یا کالج کے 1915ء سے قبل کے عہد کی سرگزشت لکھنے والے ان کا ذکر کبھی قلم بند کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس طرح کی کوئی ڈائرکٹری مرتب کی جائے تو اس ادارے کی اقامتی زندگی (جس کے لیے یہ پورے برصغیر میں ممتاز ہے) کا بڑا دلچسپ اور نتیجہ خیز مطالعہ ہوگا جس کی نظیر کہیں اور نہ ملے گی۔

یہ داستان یوں بھی نامکمل ہے لیکن میرا خیال ہے کہ علی گڑھ کے بسکٹوں کا ذکر نہ کیا گیا تو نامکمن ہونے کے ساتھ یہ ناقص بھی رہ جائے گی۔ یہ بسکٹ یہاں کی زندگی میں بہت زیادہ دخیل رہے ہیں۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے عہد میں ان کی مانگ اور کھپت ناشتے کی تمام دوسری چیزوں سے زیادہ تھی، اس لیے کہ سستے، مزیدار اور ''بھاری بھرکم'' ہونے کے علاوہ ہر وقت، ہر جگہ مل جاتے اور اپنے کھائے جانے میں کسی تکلف یا اہتمام کے محتاج نہ ہوتے، جب چاہا جہاں چاہا، جس طرح چاہا کھایا اور ''فارغ ہوئے شتابی سے۔'' طالب علمی کے زمانے میں جب اشتہا بالعموم قوی اور جیب بالخصوص ہلکی ہوتی ہے یہاں کے بسکٹوں کی یہ صفات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں! علی گڑھ کا کوئی طالب علم ایسا نہ ہوگا جو ان کی کرامات سے واقف نہ ہو۔

اب یہاں بوڑھے غلام حسین (بسکٹ والے) یاد آتے ہیں جو کالج میں یہ نعمت ہمارے لیے فراہم کیا کرتے تھے۔ان کا سراپا، ان کا خوانچہ، ان کی چال، ان کا ڈنڈا جس کی یکساں وقفے کی ہموار کھٹ کھٹ سے ہم کو خبر ہو جاتی کہ غلام حسین آ گئے۔صاف لباس میں شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔کبھی اپنی یا اپنے بسکٹوں کی جوبلی (Jubilee) منانے کا خیال آ جاتا تو ایک وقت میں ایک لباس، کرتا یا پاجامہ، صاف پہن لیتے اور اس کا انتقام اس طرح لیتے کہ دوسرے کو اور میلا کر لیتے یا تضاد کی وجہ سے زیادہ میلا نظر آتا۔ٹوپی کے بجائے خوانچہ استعمال کرتے۔حساب کسی سے ہفتہ وار ہوتا، کسی سے ماہوار بہتوں سے ''علی الحساب'' یعنی آپ نے جو کچھ دیا انھوں نے لے کر گنا، پھر جیب میں ڈالنے کے لیے آمادہ ہوئے لیکن رکے اور نئے سرے سے گِنتا اور روپے ریز گاری کو ہاتھ سے ملنا شروع کیا، پھر جیب کے قریب لے گئے اور رک گئے۔آپ نے پوچھا غلام حسین کیا بات ہے، بولے، اس طرح جیسے کہیں دور سے آواز آ رہی ہو'' کچھ زیادہ دے دیا ہے'' آپ نے کہا: ''زائد واپس کر دو'' جواب دیں گے ''نہیں معلوم کتنے زائد ہیں۔'' یہی دقّت اس وقت پیش آتی جب آپ کے پوچھنے پر وہ کہتے'' کچھ کم دیے ہیں'' آپ پوچھتے'' کتنے کم ہیں؟'' تو پھر وہی جواب ''نہیں معلوم کتنے کم دیے ہیں!''

غلام حسین کا ایک مصرف اور تھا۔آج کل جلسے جلوس کی رونق کا مدار اس پر ہے کہ ہائے ہائے زندہ باد و مردہ باد کے نعرے کس بے جگری یا بے غیرتی سے لگائے جاتے ہیں۔غلام حسین کے عہد میں یہ تقریب اس طرح منائی جاتی۔رات کے وقت کھانے کے بعد ایک بورڈنگ ہاؤس سے آواز بلند ہوتی ''غلام حسین'' پاس کے بورڈنگ سے اس کا جواب دیا جاتا ''بسکٹ والا'' پندرہ بیس منٹ تک یہ سوال جواب طرح طرح کے اونچے نیچے سروں میں ہوتا رہتا اور پھر بند ہو جاتا۔دوسرے دن معلوم ہوتا کہ وجہ احتجاج کیا تھی جس کو دور کرنے کے لیے ضروری کارروائی عمل میں آئی۔نہ کہیں احتجاج ہوتا نہ جلوس نکلتا، نہ اس کار خیر میں شریک کرنے کے لیے اسکول کے بچوں کو دعوت دی جاتی، نہ کسی کی آبرو یا عافیت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا! موجودہ طلبہ کا زیادہ حال نہیں معلوم لیکن اپنی طالب علمی کے عہد میں جب کبھی گھر جانا ہوتا تو علی گڑھ کے بسکٹوں کا خاصا انبار لے جانا پڑتا اس لیے کہ وطن میں اعزا اور احباب جس

اشتیاق سے میری آمد کے منتظر ہوتے اس سے کچھ کم ان بسکٹوں کے ورود مسعود کے نہ ہوتے۔ یہ فریضہ اب بھی ادا کرنا پڑتا ہے کبھی ''انفرادیت'' کے تقاضے سے کبھی ''روایت کے احترام میں'' البتہ اتنا فرق ضرور آگیا ہے کہ پہلے ان بسکٹوں کو اپنے ہمراہ لے جاتا تھا اور جانے کا اتفاق کم ہوتا تھا اب دوسروں کے ہمراہ بھیجنا پڑتا ہے اور یہ سانحہ آئے دن پیش آتا رہتا ہے۔ پہلے اس کا معاوضہ سود در سود کے حساب سے ملتا تھا اب اسی حساب سے ادا کرنا پڑتا تھا ہے۔

1917ء میں ڈیوٹی ڈیپوٹیشن (Duty Deputation) کے ساتھ کلکتہ چٹا گانگ ملر نگون میمیو وغیرہ جانا ہوا تو علی گڑھ کا بسکٹ اور مکھن زادِ راہ کے طور پر لیا گیا۔ جب تک سفر میں یہ ساتھ رہے یہی محسوس ہوتا رہا جیسے ہم علی گڑھ ہی کی فضا میں ہیں۔ راستے میں کسی ہم سفر کو ناشتے میں شریک کر لیتے تو وہ اتنا ہمارے نہیں۔ جتنا ان بسکٹوں کے گن گاتا۔ اس دورے میں بعض ''بڑے سخت مقام'' آئے۔ لیکن ان بسکٹوں کے سہارے ہم ان سے اسی آسانی سے گزر گئے جس سے اقبال کو خیال تھا وہ ''مقام عقل'' سے گزر گئے تھے! چٹا گانگ میں ایک مسلم بورڈنگ ہاؤس میں قیام کرنا پڑا جہاں سونے کے لیے تخت اور مبتلا ہونے کے لیے ہیضہ موجود تھا، کھانے پینے کا سامان دیکھ کر لرزہ بھی طاری ہونے لگا کیلے کی فیرینی چھوٹی چھوٹی کھلی نا ندوں میں جما کر بہنگیوں میں لیے پھرتے تھے، جن پر ہر گلی کوچے کی مکھیوں کی لوزیں چھڑکی ہوتیں۔ پینے کا پانی گڈھوں سے لیا جاتا تھا، جو کثرت سے جا بجا کائی کا دبیز سبز دوشالہ اوڑھے مصروف استراحت ہوتا جن کا پانی جو شخص یا جانور اپنے مصرف میں لاتا اتنا ہی اور کبھی اس سے زیادہ کچھ نئے خواص یعنی خوبو سے ساتھ وہیں واپس کر جاتا تھا۔ اس موقع پر ہماری جان بہت کچھ تو ان بسکٹوں نے بچائی، بقیہ جان اور بسکٹ لے کر ہم جلد ہی چٹا گانگ سے بھاگ نکلے۔

ل ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے ہر سال تعطیلات میں طلبا کی ایک جماعت جو چار یا پانچ افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں کالج کے لیے رقم جمع کرنے جاتی تھی۔ رشید صاحب نے ڈیوٹی سوسائٹی کے ایک سفر کا حال ''سیاحت برما'' کے عنوان سے علی گڑھ منتھلی کے 1917ء، 1918ء اور 1919ء کے شماروں میں دل چسپ انداز میں کیا ہے۔

کالج کے زمانے میں یہاں سے وطن جانے والے طلبہ دو چیزوں سے ہر جگہ پہچان لیے جاتے تھے، ایک تو یہاں کے یونی فارم سے جو زیب تن ہوتا۔ دوسرے یہاں کے بسکٹوں کے بنڈل یا جھابے سے جو ان کے آس پاس ہوتا۔ ان بسکٹوں اور اولڈ بوائز (Old Boys) کے بارے میں ایک ممتاز اولڈ بوائے کا قول اکثر یاد آتا ہے کہ ''یہ دونوں علی گڑھ میں ملیں تو نیوئی سنس (Nuisance)[1] اور علی گڑھ کے باہر ملیں تو نعمت!''

ہندوستان میں مسلمانوں کا دور حکومت جو کئی صدیوں پر محیط ہے دوسرے کارناموں کے علاوہ صوفیہ کرام کی خدمت اور خسرؔو اور غالبؔ کی دل آویز اور پُر مایہ و منزلت شاعری کے اعتبار سے بھی یہاں کی تاریخ میں احترام و افتخار سے یاد رکھا جائے گا خسرؔو نے ایران ہند کے ثقافتی عوامل کو شاعری اور موسیقی کے وسیلے سے جس طور ''ریختہ'' کیا، ان سے پہلے کسی اور نے نہیں کیا تھا۔ ایک نئی زبان کا آمیزہ جو پہلے سے تیار ہو رہا تھا خسرؔو کی فطانت و ذہانت نے اُسے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ یہ تاریخی اور تہذیبی کارنامہ خسرؔو ہی انجام دے سکتے تھے جو شاعری، موسیقی، اور زبان کے ماہر ہونے کے ساتھ تصوف یا انسان دوستی کے بھی مبلغ اور معنّی تھے، تصوف نے نہ صرف طرح طرح کے خداؤں کو یکجا اور ایک کیا بلکہ انسان کو بھی ذات پات اور طبقات کی تقسیم سے نکال کر یکجا اور ایک کیا اس طور پر خدا پرستی اور انسان دوستی کو باہم گر ربط دینے میں تصوف کو بڑا دخل رہا[2] ہے۔ اس کے علاوہ اس ترک لاچین'' (خسرؔو) کے دل میں ہندوستان کی جو محبت اور وقعت تھی، اس کا ثبوت اس نے جیسی حسین، لازوال اور قیمتی

---

[1] نیوئی سنس وبال جان۔ امر باعث تکلیف

[2] تصوف کا ایک تصور ترک و نفی کا ہے لیکن اس بحث کا یہ محل نہیں ہے یہاں تصوف کے صرف اس رول کا ذکر مقصود ہے جو خدمت خلق یا انسان دوستی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ کہیں اور نہیں تو ہندوستان میں مبارک اور دلکش رہا ہے! امیر خسرؔو کی تصانیف کی فہرست یہ ہے۔

مثنویات:

(1) دول رانی خضر خاں (2) شریں خسرو (3) آئینہ سکندری (4) ہشت بہشت (5) مجنوں لیلیٰ (6) قران السعدین (7) وسط الحیواۃ (8) مطلع الانوار (9) لالی عمان موسوم بہ'' جواہر خسروی۔

خدمات میں پیش کیا وہ شاید ہی کسی دوسرے غیر ملکی کے حصے میں آیا ہو۔ بقول شبلی ''ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجے کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے۔''

علی گڑھ کی معارف شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ آج سے بہت پہلے خسروؔ اور غالب کے کارناموں کو فروغ دینے کے لیے اس نے اپنی بساط کے مطابق پوری کوشش کی، جسے علم دوست طبقہ ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رکھے گا۔ چنانچہ نواب محمد اسحاق خاں[1] صاحب، آنریری سکریٹری ایم۔اے۔او۔ کالج نے کلیات خسرو کو بڑے شوق اور اہتمام سے بہ صرف کثیر مستند نسخوں سے مقابلہ کرا کے مشاہیر اہل قلم کے مقدمے اور حواشی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ پریس (کالج کا مشہور پریس) سے شائع کرایا۔ کاغذ کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی ان مطبوعات کا درجہ بہت اونچا ہے۔ خسروؔ جیسی عظیم المرتبت شخصیت پر اس تفصیل سے اتنا مستند کام اس برصغیر میں شاید کہیں اور نہیں ہوا۔

کچھ ہی دن ہوئے یونی ورسٹی کے بعض ارباب ذوق اس فکر میں تھے کہ تاریخ اور فارسی کے شعبوں کی نگرانی میں یونی ورسٹی کی طرف سے خسروؔ کے رتبے کے مطابق تاریخ اور شعر و ادب کے فاضلوں کا ایک نمائندہ اجتماع کیا جائے جس میں موسیقی اور زبان کے ماہرین کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے اور خسروؔ کی شایان شان ایک مستقل یادگار یونی ورسٹی میں قائم کی جائے۔ خسروؔ کے احترام میں اس طرح کا اقدام ہماری یونی ورسٹی کی روایات کے مطابق ہوتا۔ مگر کچھ ایسے موانع پیش آئے کہ یہ ارادہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔

---

[1] نواب محمد اسحاق خاں (1860ء۔1918ء) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ریاست جہانگیر آباد (میرٹھ) کے نامور فرزند۔ 1913ء میں عہدہ سے سبک دوش ہونے کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ 1913ء سے 1918ء اپنی وفات تک اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔ ان کے دور میں کالج میں بہت ترقی ہوئی۔ کلیات امیر خسرو کی تدوین اور اشاعت نواب صاحب کی ذاتی دلچسپی اور کوشش سے ممکن ہو سکی۔ یونی ورسٹی کی خوب صورت جامع مسجد کی تکمیل بھی نواب محمد اسحاق کی کوششوں سے ہوئی۔

مزید حالات کے لیے دیکھیے، فکر و نظر۔ نامورانِ علی گڑھ (دوسرا کارواں) مضمون نواب محمد اسحاق خاں از پروفیسر کبیر احمد جائسی۔

غالب نے اردو شاعری کو وزن اور وقعت دینے کے علاوہ ایک نسب اور ایک روایت بھی دی جن سے ہماری زبان اس قابل ہوئی کہ شاعری کے ان مشکل لیکن اہم مطالبات سے بھی عہدہ برآ ہو سکے جس کے بغیر وہ عظیم شاعری کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ علی گڑھ میں غالبؔ سے شغف پیدا کرنے میں مولانا سہیلؔ کا جو حصہ رہا ہے اس کا تذکرہ پچھلے اوراق میں آچکا ہے۔

غالب پر سب سے پہلی مستند تصنیف ''یادگار غالب'' ہے جس میں غالب کی سیرت، سوانح اور شاعری پر حالیؔ نے اپنے مخصوص شریفانہ سنجیدہ اور سلجھے ہوئے انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ غالب پر آئندہ جتنے اہل قلم جو کچھ لکھنا چاہیں گے ''یادگار غالب'' ان کی رہنمائی میں بہت زیادہ معین ہوگی۔ حالی سے قطع نظر جو علی گڑھ تحریک کے زبردست حامی اور سرسید کے ممتاز رفقائے ادب میں سے تھے غالب پر شاید سب سے پہلے جدید طرز کا مقدمہ لکھنے کا سہرا ڈاکٹر سید محمود [1] کے سر ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا غالب کے نسخۂ حمیدیہ بھوپال پر وہ مشہور و معروف مقدمہ ہے جو ''محاسن کلام غالب'' کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا حسرت موہانی نے غالباً سب سے پہلے کلام غالب کی مختصر شرح لکھی۔

ذاکر صاحب تعلیم کی غرض سے جرمنی تشریف لے گئے تو موصوف نے کاویانی پریس برلن سے کلام غالبؔ کا مشہور پاکٹ اڈیشن بڑے خوش خط ٹائپ میں، حسین جلد کے ساتھ شائع کیا۔ اتنا خوب صورت اڈیشن اب تک کہیں اور سے شائع نہیں ہوا۔ سہا اور قاضی سعید الدین احمد نے غالب کی شرحیں لکھیں۔ حال میں ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کی ادارت میں ''علی گڑھ میگزین'' کا غالب نمبر مرتب ہوا جسے علمی حلقوں میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس پر

---

[1] ڈاکٹر سید محمود (1889ء۔1900ء) ایم۔اے۔او کالج کے ممتاز طالب علم اور مشہور سیاسی شخصیت، ملک کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ آزاد ہندوستان کے وزیر خارجہ رہے۔

ڈاکٹر سید محمود نے ''دیوان غالب'' مرتبہ نظامی بدایونی پر ایک روایتی انداز سے ہٹ کر مقدمہ تحریر کیا تھا جو غالب کی شخصیت اور شاعری پر منفرد طرز کا ہے۔ دیکھئے دیوان غالب مرتبہ نظام الدین حسن نظامی، نظامی پریس، بدایوں۔1925ء

نظرِ ثانی کرنے کے بعد متعدد اضافوں کے ساتھ کئی جلدوں میں شائع کرنے کا ''التزام انجمن ترقی اردو ہند'' (علی گڑھ) نے کیا ہے۔

کچھ دن ہوئے ذاکر صاحب کے ایما سے موصوف کے کالج کے ساتھی اور عزیز دوست عطاء اللہ خاں صاحب درّانی نے جواب امریکن شہری ہیں ایک گراں قدر عطیہ اس غرض سے مرحمت فرمایا کہ اس سے یونی ورسٹی میں ایک پروفیسر شپ (Professorship) قائم کی جائے جو غالب ان کے کلام اور ان کے عہد کو اہلِ مغرب سے روشناس کرنے کے لیے ایک مبسوط اور مستند تصنیف پیش کرے۔ اس پروفیسر شپ پر اردو اور انگریزی کے فاضل اور اردو کے مشہور ادیب نقاد و شاعر آل احمد سرور[1] علی گڑھ کا تقرر ہوا ہے۔ جن دوستوں اور بزرگوں کے نام نامی اس سلسلے میں اوپر لیے گئے ہیں وہ سب علی گڑھ کے ''ساختہ پرداختہ'' ہیں۔

ضمناً یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ غالب شناسی کا جو ذوق علی گڑھ نے پیدا کر دیا تھا وہ جلد ہی پورے طور پر برگ و بار لایا۔ چنانچہ گذشتہ بیس سال میں غالب پر طرح طرح کی مستند تصانیف، مقالے اور ان کے دیوان کے دل کش (اڈیشن مصور) شائع ہوئے جن میں عبدالرحمٰن چغتائی، غلام رسول مہر، محمد اکرام، پروفیسر حمید احمد، مالک رام۔ امتیاز علی عرشی، شوکت سبزواری کی تصانیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یونی ورسٹی کے اس کم و بیش چالیس سال کے دور میں تصنیف و تالیف کا کوئی کام مطبوعاتِ خسروی کے پایہ کا نہیں ہوا۔ بالآخر ذاکر صاحب کے ایماء سے شعبۂ اردو نے علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر (Aligarh History of urdu Literature) کی تالیف و تدوین کی ایک جامع اسکیم (Scheme) مرتب کی، جس کے لیے مرکزی حکومت نے ایک

---

[1] عطاء اللہ درّانی (مرحوم) نے اپنے دوست سید حسین کی یاد میں سید حسین چیر قائم کی تھی جس پر سرور صاحب کا تقرر ہوا تھا اور ایک بڑی رقم کا عطیہ بھی اس کے لیے دیا تھا۔ دیوان غالب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا کام سرور صاحب کے سپرد کیا گیا تھا۔ سرور صاحب نے اپنی خودنوشت ''خواب باقی'' ہیں میں تحریر کیا ہے کہ انھوں نے ترجمہ مکمل کر کے درانی صاحب کے سپرد کر دیا تھا لیکن عام خیال یہ ہے کہ ترجمہ کا کام نامکمل رہا۔ ذاکر صاحب اور رشید صاحب اس مسئلہ پر سرور صاحب سے بددل تھے۔

لاکھ سے زائد کا عطیہ منظور کیا۔ تاریخ پانچ جلدوں پر مشتمل ہوگی، اور کم سے کم چار سال اس کی تکمیل پر صرف ہوں گے۔ وسط سال رواں ۱۹۵۷ء سے ہندوستان کے منتخب اہل قلم اس کی تیاری میں مصروف ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ مکمل ہو جانے پر یہ تاریخ ہماری یونی ورسٹی کا مہتم بالشان کارنامہ ہوگی اور اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی، علمی اورادبی سرمایہ۔[۱]

گذشتہ اوراق میں علی گڑھ سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ ایک طور پر نامکمل رہیں گی اگر اس امر کی طرف اشارہ نہ کر دیا جائے کہ علی گڑھ جن حالات کے ماتحت وجود میں آیا، جس طرح اور جس حد تک اس نے یہاں کی زندگی کو متاثر کیا، اس کا اردو شعر و ادب (جدید اردو) پر کیا اثر پڑا۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے پر اردو شعر و ادب ان تکلفات سے آزاد

۱۔ علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر اسکیم کے تحت تاریخ ادب اردو تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل پانچ جلدوں میں شائع ہونا تھی:

پہلی جلد	1200ء	تا	1700ء
دوسری جلد	1700ء	تا	1800ء
تیسری جلد	1800ء	تا	1857ء
چوتھی جلد	1857ء	تا	1914ء
پانچویں جلد	1914ء	تا	1957ء

رشید صاحب علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر پروجیکٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ یکم مئی 1958ء کو رشید صاحب کے ریٹائر ہونے پر سرور صاحب اس کے ڈائرکٹر ہو گئے۔ احمد صدیق گورکھ پوری اور ڈاکٹر نذیر احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔

کمیٹی میں ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر اعجاز حسین، قاضی عبدالودود، پروفیسر اختر اورینوی اور احمد صدیق مجنوں گورکھ پوری تھے۔

تاریخ ادب اردو کی صرف پہلی جلد ہی تیار ہو کر شائع ہو سکی اور کتابت، طباعت اور تحقیقی اغلاط کی بنا پر سخت تنقید ہوئی کہ اور یہ منصوبہ ختم ہو گیا!

ہونے لگا تھا جو اس پر عائد اور اس کی فطری صلاحیتوں اور خوبیوں کی نشو ونما میں حائل تھے۔ یہ تبدیلی فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوئی جس نے دہلی اردو کالج کی تالیفی وتدریسی سرگرمیوں میں ظہور پا کر ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور علی گڑھ پہنچ کر اردو کی نشاۃ ثانیہ بن گئی۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس بڑے نشاۃ ثانیہ کا جزو بن گئی جس کو ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں!

علی گڑھ نہ ہوتا اور اس نے اردو کو اپنی طرف سے نئی توانائی، نئی راہیں اور رفتار نہ دی ہوتیں تو اردو کو اتنا جلد وہ فروغ نصیب نہ ہوتا جو ہوا۔ علی گڑھ کے مقاصد فورٹ ولیم کالج اور دلی اردو کالج کے مقاصد سے زیادہ بلند، ہمہ جہت اور باہم گر مربوط ومحکم تھے۔ علی گڑھ کے رفقائے ادب ایک نصب العین رکھتے تھے جس کے حصول کو وہ شخصی فرض اور قومی ذمے داری سمجھتے تھے۔

بحیثیت مجموعی یہ کہہ سکتے ہیں کہ فورٹ ولیم کا مقصد انگریزوں کو اردو سے اور دہلی کالج کا ہندوستان کو انگریزی سے آشنا کرانا تھا۔ بالفاظ دیگر تدریسی اور تعلیمی تھا۔ علی گڑھ کا نصب العین ان کے علاوہ علمی، قومی اور تہذیبی بھی تھا۔ علی گڑھ کے سامنے ایک بڑی مہم یہ بھی رہی کہ اول الذکر دو اداروں نے جس زبان سے ہم سب کو بہرہ مند کرنے اور رکھنے کی کوشش کی تھی اس کو مسلسل ناروا حملوں سے بچائے۔

''علی گڑھ تحریک'' کے امام سرسید تھے جن کے رفقائے ادب[1] حالؔی، شبلؔی، نذیر احمد، محسن الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ، وحید الدین سلیم جدید اردو کی بڑی اہم شخصیتیں ہیں۔ جدید اردو کی توسیع وترقی میں علی گڑھ کا کیا حصہ رہا اور علی گڑھ جدید اردو کا کس طرح مرکز ومحور بنا ان پر یہاں براہ راست تفصیل سے بحث کرنا اتنا مقصود نہیں ہے جتنا عہد بعہد ان مصنفین اور ان کی تصانیف کا تعارف کرا دینا مدنظر ہے جن کا علی گڑھ سے شروع سے آج تک بہت گہرا اور بہت قریب کا تعلق رہا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ جدید اردو کو علی گڑھ سے کس طرح کی تب وتاب نصیب ہوئی۔

---

[1] طوالت سے بچنے کے لیے یہاں صرف سرسید شبلی، حالی اور نذیر احمد پر جستہ جستہ اظہار خیال کروں گا۔

اُردو کی ترقی میں سرسید نے جو حصہ لیا وہ اتنا براہ راست نہ تھا، جتنا بالواسطہ۔ وہ دراصل قوم کی اصلاح اور تنظیم چاہتے تھے جو اپنی حکومت کے جانے اور بدیسی حکومت کے آ جانے سے طرح طرح کی دشواریوں میں مبتلا تھی۔ یہ دشواریاں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، تعلیمی، سبھی طرح کی تھیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید اور ان کے رفقا نے اتنے مختصر زمانے میں جتنے متفرق موضوعات پر جس دلسوزی، قابلیت اور جرأت سے اردو کی جتنی مستند تصانیف پیش کیں وہ بے نظیر ہے۔

ان تحریروں اور تقریروں نے قوم اور ملک کی اصلاح اور تنظیم کے ساتھ زبان وادب کے رُخ کو صحیح سمت اور راستے پر موڑ کر نہ صرف اس کی ہیئت وحیثیت بدل دی، بلکہ اس کی ترقی رفتار کو بھی تیز کر دیا۔ اس طور پر قوم و ملک کی اصلاح کی کوشش زبان وادب کی اصلاح کا موجب بن گئی۔ ایسا نہ ہوتا تو اردو کو اتنی جلد اتنی نمایاں ترقی نصیب نہ ہوتی جتنی کہ ہوئی۔ زبان وادب بجائے خود اتنے اہم نہیں ہوتے جتنے وہ لوگ جو اس کو کام میں لائے ہیں یا جن کی خدمت کے لیے زبان وادب مامور ہیں۔ اس لیے زبان وادب پر براہِ راست تصرف کرنے کے بجائے یہ طریقہ زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوتا ہے کہ زبان کے لکھنے، بولنے والوں کے قوائے ذہنی وعمل کی اصلاح وترتیب کی کوشش کی جائی۔ جس مقصد اور منزل کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے گی وہی مقصد و منزل زبان وادب کی تقدیر بن جائے گی۔ سرسید کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور جدید اردو کی توسیع اور ترقی میں اس کارنامے کو بڑا دخل ہے۔

سرسید کی انشا پردازی کی خصوصیت یہ ہے کہ بات کتنی ہی ٹیڑھی یا ٹیکنیکل (Technical) کیوں نہ ہوتی وہ اس کی وضاحت بڑی خوبی سے ہماری آپ کی زبان میں کر دیتے۔ سبب یہ تھا کہ وہ چھوٹے بڑے کو یکساں طور پر اپنا مخاطب سمجھتے تھے اس لیے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار آسان الفاظ اور پیرایۂ بیان میں کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ اس طرح زبان وادب، محاسن صوری ومعنوی سے ''محروم'' ہو جائیں گے یا نہیں۔ وہ صنائع، بدائع، مناسبت لفظی، مترادفات اور مصطلحات کی پیروی اور پابندی کم کرتے تھے، اپنی بات لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی فکر زیادہ کرتے تھے۔

سرسید جتنی پابندی اسلوب کی کرتے تھے اتنی ہی موضوع کی۔ موضوع جس انداز گفتگو کا مطالبہ کرتا تھا، سرسید کا وہی انداز ہوتا۔ اردو میں ایسے لکھنے والے کم نہیں ہیں جو اکثر موضوع کو اسلوب پر قربان کر دیتے ہیں۔ انشا پردازی کی یہ کمزوری ہے کہ اس کا موضوع اس کے اسلوب کا شکار ہو جائے۔ ہر انشا پرداز کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے اور ہر موضوع اپنا اسلوب رکھتا ہے۔ مستند انشا پرداز دونوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد اکثر اسلوب پر موضوع کو قربان کر دیتے ہیں۔ سرسید کا کمال یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کے مناسب حال اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرسید کی تحریروں میں جتنے اسالیب ملتے ہیں اردو کے شاید کسی انشا پرداز کے ہاں ملیں۔

سرسید کے مضامین خانقاہوں یا شبستانوں میں نہیں، جدوجہد کے میدانوں میں لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بڑی جرأت سے سوچتے تھے اور اسی جرات سے لکھتے تھے۔ سرسید کی تحریروں نیز ان کے عام اقدامات میں وہ توانائی یا غلبہ رانی ملتی ہے جو ان قوموں کے ہاں نظر آتی ہے جو مثلاً پہلے پہل ''بدویت'' کے دائرے سے نکل کر ''مدنیت'' کے آستانے پر نمودار ہوئے ہوں گے۔ سرسید کی ابتدائی تحریروں میں زبان کی ناہمواریاں ملتی ہیں۔ یہ طرز قدیم کا اثر اور متروک الفاظ کا استعمال تھا اور عام طور پر اس زمانے کے لکھنے والوں میں عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن ''علی گڑھ تحریک'' کے آگے بڑھانے میں وہ ہمہ تن منہمک ہو جاتے ہیں تو ان کے لکھنے کا انداز تہ دار اور دل نشیں ہو جاتا ہے۔ اردو میں مقالہ نگاری کو مستقل صنف ادب کی حیثیت سرسید نے دی۔

سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کو مغربی مصنفین سے روشناس کرایا، اردو کے اخبارات سرسید کے عہد سے پہلے سے شائع ہو رہے تھے، لیکن سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' سے قوم کی اصلاح و تنظیم اور اس کے حقوق کی حفاظت و حمایت کا جتنا بڑا کام لیا اور اس کو ''علی گڑھ تحریک'' کا جیسا موثر آلہ بنایا وہ اس عہد کے کسی دوسرے اخبار کے حصے میں نہ آیا۔ اس بنا پر سرسید کو اپنے عہد کا سب سے بڑا صحافی تسلیم کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سرسید کا اردو زبان و ادب پر یہ کچھ معمولی احسان نہیں ہے۔ انھوں نے بڑے نازک موقع پر اور سب سے پہلے اردو کے تحفظ اور حمایت میں آواز بلند کی۔ ان کی تحریر و تقریر اور ان کے

جذبہ خلوص و خدمت سے متاثر ہوکر مختلف مفید اہم اور نئے موضوعات پر دور اور نزدیک اچھے سے اچھے لکھنے والے پیدا ہوئے جنھوں نے بعد میں آنے والوں کے لیے لکھنے اور کہنے کے آداب و اخلاق کی قابل قدر روایات چھوڑی ہیں۔

سرسید کے نصیب میں اس قوم کی سربراہی آئی جو تعداد میں کم، تنظیم سے محروم، انگریزی تعلیم سے ناآشنا، صنعت و حرفت سے بے بہرہ، معاشی وسائل کے اعتبار سے درماندہ، حکومت کی نظر میں مقہور، طرح طرح کی ناعاقبت اندیشیوں میں اسیر اور بحیثیت مجموعی پسماندہ تھی۔ اس لیے سرسید کا موازنہ ان کے معاصر لیڈروں سے کرنا درست نہیں ہے۔ موخرالذکر اور ان کی قوم نہ صرف یہ کہ ان مصیبتوں سے مامون تھی بلکہ مدتوں پہلے سے بہر گونہ منظم اور مرفہ الحال تھے۔ تاریخی اور سیاسی اعتبار سے انگریز اور انگریزی حکومت کو ان سے کوئی عناد نہ تھا۔ مسلمانوں کی طرح انھوں نے غدر کی ہولناک تباہیاں نہیں جھیلی تھیں، اس لیے ابنائے وطن اور ان کے لیڈر جو چاہتے جس طرح چاہتے کر سکتے تھے۔ وہ حکومت کے شک و شبہے کا شکار نہیں ہو سکتے تھے۔ مسلمان یقیناً ہوتے۔ ظاہر ہے ایسے متضاد اور مخصوص حالات میں کسی جماعت کے لیڈر کا کیا پروگرام اور پالیسی (Policy) ہوتی۔ سرسید کے سامنے مسلمانوں کی فوری آبادکاری کا مسئلہ تھا اور حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے کم و بیش ہر قیمت پر تھا۔ دوسری طرف ابنائے وطن اور ان کے لیڈروں کے سامنے آبادکاری کا نہیں، خود اظہاری اور سیاسی برتری کا مسئلہ تھا۔ اس لیے سرسید کا موازنہ ہندوستان کے دوسرے لیڈروں سے کرنا اور سرسید کو رجعت پسند، تنگ خیال اور فرقہ پرست قرار دینا قرین انصاف نہیں، بلکہ ان امور کے پیش نظر سرسید اور ان کے جانشینوں کے خیالات اور مقالات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی، شاید ہمدردی بھی۔

اب سے پہلے زندگی کو متاثر کرنے اور محکم و مزین رکھنے میں مذہب کو بڑا دخل تھا۔ اسی سرچشمے سے تہذیب یا کلچر کا ظہور ہوتا تھا، چنانچہ علم و فضل، شرف و سعادت اور حسن و خوبی کے جتنے بے بہا نمونے انسان نے دنیا کو دیے ان میں مذہب کی تخلیقی کارفرمائی مسلم ہے۔ یہی نہیں بلکہ تسخیر فطرت کے کارنامے بھی جو علوم عقلیہ کی معراج اور معجزے سمجھے جاتے ہیں اور یقیناً ہیں، وہ مذہب ہی کی دی ہوئی بشارت سے ممکن ہوئے۔

مذہب اور معاشرت کے عام عقلی اور اسلامی تصور اور ان کے باہمی رشتے کو معین اور منقح کرنے میں علی گڑھ کے بیشتر مصنفین نے سرسید اور ان کے رفقا کی پیروی کی ہے۔ یعنی خدا کے تصور کو زندگی کے تصور سے جدا نہیں کیا جا سکتا، بالفاظ دیگر اگر زندگی "جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں" ہے تو خدا کا تصور بھی اسی طرح نامی اور حرکی ہے اور زندگی کا جب یہ تصور ہے تو اس میں اسیر انسانی عقل و شعور کا بھی نامی اور حرکی ہونا لازم آتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی صحت محل نظر ہو یا اس کے سمجھنے میں سرسید سے چوک ہوئی ہو، اس سے بحث نہیں۔ اس میں بھی شک نہیں سرسید کے اس نقطۂ نظر یا اس طرح کے بعض دوسرے نظریوں یا باتوں سے ان کے رفقا کو اختلاف تھا، اور مخالفت کی حد تک اختلاف، لیکن سرسید کی واقعیت پسندی، خلوص اور ہمت مردانہ کے سب قائل تھے، وہ جانتے تھے کہ سرسید سے مذہب کے اسرار و رموز کے سمجھنے میں ممکن ہے، جہاں تہاں لغزش ہوئی ہو، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی ناموس کا نگہبان اور ان کی نجات کا ضامن اس پُر آشوب زمانے میں سرسید سے بڑا اور بہتر کوئی دوسرا نہ تھا۔

یہ کچھ سرسید اور علی گڑھ ہی پر موقوف نہ تھا۔ یورپ کے صنعتی انقلاب اور اسلام کے خلاف عیسائی مبلغین اور مصنفین اور سلاطین کی دیرینہ جدوجہد کے باعث تمام اسلامی ممالک میں مسلمان مصلحین اور مفکرین کے لیے مذہب کی شیرازہ بندی اور مسلمانوں کی تنظیم کا مسئلہ، حیات و ممات کا مسئلہ بن گیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بیشتر کے سوچنے کا انداز وہی تھا جو سرسید کا تھا۔

متذکرہ بالا امور کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید کے اسلوب انشا میں کہاں کہاں سے اور کس طرح توانائی اور تنوع آیا ہوگا۔ چنانچہ ہم سرسید کو اسالیب کا امام وقت اور علی گڑھ کو اسالیب اور موضوعات کا سرچشمہ قرار دیں تو حقیقت سے دور نہ ہوگا۔

حالی:

اردو شعر و ادب کو قومی شاعری، تنقید نگاری اور سوانح نویسی سے متعارف کرانے کا سہرا حالی کے سر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اردو میں جدید نظم کی ابتدا لاہور میں سرکاری تحریک و سرپرستی میں غالباً ۱۸۷۴ء میں ہوئی اور حالی نے اس طرح کی نظم نگاری میں حصہ لیا۔ یہاں ان

کی وہ شاعری خصوصیت کے ساتھ مدنظر ہے جو ہمارے ملی اور قومی عروج وزوال کی تفسیر ہے اور اسلامی اقدار اعلیٰ کے حصول وحمایت کی تلقین کرتی ہے۔

حالی کی تصانیف پر اہل قلم نے بہت کچھ لکھا ہے جن کا احاطہ کرنا یہاں نہ مقصود ہے نہ ممکن، ایک تنقید نگار نے سب سے علاحدہ اور دل نشین بات یہ کہی ہے کہ" حالی کی تصانیف نظم ونثر کے مطالعے سے بے اختیار محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص کتنا شریف انسان ہے۔" جدید تنقید نگاری کی رو سے ممکن ہے اس بیان کو وہ وقعت نہ دی جائے جس کا وہ مستحق ہے، لیکن شعروادب اور دیگر فنون لطیفہ کی قدر وقیمت متعین کرنے میں فنکار کی شرافت نفس کے عنصر کو جتنی اہمیت دی جائے بجا ہے۔ حالی انسان کی حیوانی سرشت نہیں انسانی (حیاوحمیت) پر زور دیتے ہیں۔ یہاں اقدار عالیہ یا اقدار مطلقہ کی جواز اور مدار انسان دوستی پر ہے، جس کے لیے ابتدائے تہذیب سے آج تک اچھے اور بڑے انسان ہر طرح کی کوشش کرتے اور قربانی دیتے آئے ہیں۔ جب انسان کا معیار "انسان اور انسانیت" ہو تو اُس حسن عملی یعنی شعروادب کو بھی انسان وانسانیت ہی کے معیار سے پرکھنا چاہئے۔ شعروادب میں آج کل جو اضطراب وانتشار اور ایک طرح کا نراج ملتا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم ناواقفیت یا نالائقی کی بنا پر سائنس اور نفسیات کی تحقیقات کو اخلاق و انسانیت کے مقتضیات ومطالبات پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ حالاں کہ سائنس ونفسانیت دونوں کے محور اور مقاصد جداگانہ ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم میں شاعر اور ادیب کی آزادی فکر کا غلط اور بڑا خطرناک تصور راہ پا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے شاعر اور انشا پرداز یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ہر طرح کی بات جس طرح چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم نہ زبان اور قواعد کی صحت کا لحاظ کرتے ہیں نہ خیال کی رفعت، جذبے کی تطہیر یا فکر کی گہرائی کا!

حالی کے سامنے شاعری اور ادب کے مسائل اتنے زیادہ قابل لحاظ نہ تھے جتنے قوم کی بدحالی اور زمانے کی ناسازگاری کے۔ سرسید کی طرح وہ بھی اس کے قائل تھے کہ قوم کی اصلاح کے ساتھ شعروادب کی اصلاح ہو جائے گی۔ گو حالی نے شعروادب کی اصلاح پر بھی اپنی توجہ کا بہترین حصہ صرف کیا۔ حالی اسلام کے ماضی اور اسلاف کی روایات عالیہ میں قوم کی بہت سی

مصیبتوں کا مداوا دیکھتے تھے، ان کی روشنی میں حال اور مستقبل میں قوم کے لیے بصیرتیں اور بشارتیں بھی پاتے تھے۔ حالیؔ پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ''ماضی کی طرف جھکتے تھے'' لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت نظر انداز کردی جاتی ہے کہ ماضی قوم کا حافظہ ہے جس کے بغیر شعور کا وہ تسلسل باقی نہیں رہتا جس سے سوسائٹی یا قوم کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ جس قوم کے ماضی کو انسانیت کی تعمیر اور ترقّع میں دخل رہا ہو اور جس کا ماضی حاصل رہا ہو ''صدیوں کی برومندی کا'' اسے فراموش کرنا نہ ممکن ہے نہ مناسب!

حالیؔ اپنی شاعری میں اسلاف اور ان کے کارناموں ہی کا واسطہ نہیں دیتے، بلکہ ہندوستان اور اس میں رہنے بسنے والے جس پستی اور غفلت کے شکار نیز بدلے ہوئے حالات میں زندگی اور زمانے کے جن مصائب و مطالبات سے دوچار یا غافل تھے ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کا راستہ دکھاتے اور حوصلہ دلاتے ہیں۔ حالیؔ نے مسلمانوں کو ''مسدس حالی'' اور ''شکوۂ ہند'' میں ان کا ماضی یاد دلانے کے علاوہ اپنی دوسری نظموں، تحریروں اور تقریروں میں حال کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی جس دلسوزی اور دلیری سے تلقین کی ان کے عہد کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔ اور باتوں سے قطع نظر، حالی کی شاعری کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے کہ ان سے قبل اس طرح کی نظموں کا چرچا اردو میں نہ تھا۔ اس کی نظم میں طرح ڈالی گئی تو لوگوں نے ان کا اور ان کی شاعری کا مضحکہ اڑایا۔ لیکن حالی کے بعد اس نوعیت کی شاعری کو ایسا قبول عام نصیب ہوا اور ایسے نامور شعرا پیدا ہوئے جن کے کلام سے ہماری سوسائٹی اور سیاست میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔

بعض اصحاب حالیؔ کی غزلوں کے علاوہ ان کے بقیہ کلام کو بے مزہ قرار دیتے ہیں۔ ہم حسن و عشق کی روایتی شاعری سے زیادہ مانوس رہے ہیں۔ اس لیے اس کو شاعری کا سب سے بہتر اور مستند نمونہ سمجھتے ہیں۔ موضوع شاعری کو حسن و عشق تک محدود سمجھ لینے میں مضائقہ نہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حسن و عشق کا تصور جنس و جمال سے بہت اونچا اور بہت آگے بھی چلا گیا ہے۔ پھر شاعری الفاظ و اسلوب، ان کی مخصوص دروبست، لب و لہجہ اور خیالات و جذبات ہی پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ حقیقی شاعری عبارت ہوتی

ہے شاعر کے بے پایاں خلوص وخلش، دردمندی ودلنوازی، سادگی وسپردگی اوراس کے فکر وتخیل کی رفعت و پاکیزگی سے، حالؔی کی شاعری اس بے پایاں اور بے غش انسانیت دوستی اور قومی غیرت وحمیت کا آئینہ ہے، جن سے خود حالؔی عبارت ہیں۔

حالؔی کا یہی رنگ ان کی سوانح نگاری میں ملتا ہے۔ سعدی (حیات سعدی) سے قطع نظر جو زمان ومکان کے اعتبار سے ہم سے بہت دور ہیں۔ سرسید اور غالبؔ کو روشناس کرانے میں حالؔی نے اپنا یہ مخصوص نقطۂ نظر ملحوظ رکھا ہے کہ یہ دونوں ''تاریخی نام وروں'' میں ہوں یا نہیں ہماری قوم اور ہمارے شعروادب میں محسنوں یا ''نجات دہندوں'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسے عہد میں جب ہماری ہر متاع بے وقعت ہو رہی تھی، ہم میں ایسی گراں مایہ ہستیاں نمودار ہوئیں جنھوں نے ہماری زندگی کو تازگی وتوانائی اور ہمارے شعروادب کو محکمی اور منزلت بخشی، یہ لوگ ایسے تھے جنھوں نے قوم اور اس کی گراں قدر روایات کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ ان کی سوانح حیات لکھنے میں نقطۂ نظر اتنا ''ناقدانہ ومورخانہ'' نہیں ہوتا جتنا ''ہمدردانہ اور شریفانہ'' چنانچہ یہ ممکن ہے کہ حالؔی کی شخصیت اور شرافت کو سوانح نگاری کے ''ضابطۂ دیوانی وفوجداری'' سے ربط نہ دیا جاسکے۔ لیکن سوانح نگاری کے صحیفۂ اخلاق میں ان کو یقیناً اونچی جگہ دی جائے گی۔ کسی کے ہاں کچھ ہوتا ہو، ہمارے یہاں بزرگانِ سلف کی خدمات کو بالعموم احترام وعقیدت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ان کی کمزوریوں کا کھوج لگانے اور شہرت دینے سے احتراز کیا گیا۔ ہم ان کی باتوں کو مانیں یا نہ مانیں، ان کے اعمال کو طرح طرح کی چھلنیوں میں چھانتے رہنے کو مذموم نہیں تو فعلِ عبث ضرور سمجھتے ہیں۔

ایک بات یہاں خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہے۔ سرسید اور حالؔی کے عہد میں قومی شعور بیدار ہو چلا تھا جس کی آبیاری کے لیے جہاں اور تدابیر کی جارہی تھیں وہاں ایک یہ بھی تھی کہ قوم کے نام ورانِ پیشین کی شخصیت اور کارناموں کو تصانیف کے ذریعہ زندہ کیا جائے ''ہیروز آف اسلام''[1] کا سلسلہ اس تحریک کی ایک کڑی تھی جس میں شبلی، شرر، اور عبدالرزاق کی تصانیف کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ایک بات جو حالؔی کو خاص طور پر ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ متذکرہ

---

[1] ناموران اسلام

صدر مصنفین نے جہاں اسلام کے قدیم نادروں کو جن کے گرد تاریخ و تکریم کا ہالہ مدت الایام سے چلا آتا ہے نمایاں کیا ہے، حالی نے اپنے معاصر اور ہم سے قریب ترین زمانے کے نام وروں کو ہمارے لیے قابل اعتبار و افتخار گردانا ہے، بہ فحوائے۔

''مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانہ تست!''

سرسید اور غالبؔ کی سوانح عمریوں کے بارے میں ہم آپ جو رائے چاہیں قائم کریں، لیکن اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کی یہ دو ہستیاں ان شخصیتوں سے کمتر نہیں جن کو ہمارے ہاں تاریخی امتیاز حاصل ہے۔ حالؔی نے قدیم اور جدید دونوں کی شہادت اور شخصیتوں سے ہمارے مانوس دلوں کو جس طرح تازگی اور توانائی بخشی کسی اور نے نہیں بخشی۔ وہ بھی ایسے زمانے میں جب ہندوستان کے مسلمانوں کے گرد و پیش تقریباً وہی انجام منڈلا رہا تھا جو اسپین کے مسلمانوں کو پیش آیا تھا۔ حالی کا خیال آتے ہی کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا ہے جیسے قدیم زمانے کے بعض گمنام پیغمبر شاید اسی طرح کے رہے ہوں گے۔

حالؔی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس پر تنقید نگاروں نے موافقت یا مخالفت میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے'' حالؔی نے مغربی مصنفین کے خیالات کی ترجمانی میں غلطی کی ہے۔ یا جن ایسے مصنفین کا ذکر کیا ہے ان کی حیثیت اب مستند نہیں رہی۔'' میرا خیال ہے کہ حالؔی نے اردو شاعری سے متعلق مقدمہ میں خود اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس تعبیر یا ترجمانی سے وقیع تر ہے جہاں انھوں نے مغربی مصنفین کا حوالہ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر حالؔی مغربی مصنفین کا حوالہ نہ دیتے، جب بھی ''مقدمہ شعر و شاعری'' اردو شعر و شاعری پر بہت مستند تصنیف ہوتی۔ حالؔی نے مغربی مصنفین کا ذکر اپنے اطمینان خاطر کے لیے اتنا نہیں کیا ہے جتنا اپنے عہد کے ڈانواڈول نوجوانوں کی طمانیت قلب کے لیے۔

اردو میں حالؔی ہمارے پہلے تنقید نگار ہیں جنھوں نے اردو شعر و شاعری کے خوب و زشت کو پرکھنے کے لیے اردو شعر و شاعری کی تصنیفات اور روایات، بالفاظ دیگر اس کی نہاد کو پیش نظر رکھا ہے۔ مریض کے لیے وہ تدابیر اور وہ غذائیں اور دوائیں زیادہ مؤثر ہوتی ہیں جو اس کے جسم و جاں سے، بہ نسبت دوسرے مریضوں یا خود معالج کے جسم و جاں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہوں!

شبلی:

شبلی[1] کو ذہانت اور شعریت کا بہرۂ وافر قدرت سے ودیعت ہوا تھا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام سے بے کراں شغف تھا۔ سلف کے کارناموں کو مایۂ افتخار جانتے تھے اور مسلمانوں کی عالمگیر زبوں حالی سے آتش بجاں رہتے۔ اس عہد میں حالیؔ اور شبلی کی شاعری، تنقید نگاری اور سیرت نویسی نے جس قدر اونچا درجہ، جتنی جلد حاصل کر لیا وہ حیرت انگیز ہے۔ دونوں کو اردو فارسی اور عربی پر عبور تھا، اور ان زبانوں کے مزاج اور مقام سے باخبر تھے۔ یہی حال نذیر احمد اور سرسید کے دوسرے رفقا کا تھا جو زبانوں کے علاوہ علوم اسلامیہ میں بھی بڑا درک رکھتے تھے۔

یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ سرسید اور ان کے ساتھی کلیۃً مشرقی اور مذہبی ہوتے ہوئے اور بڑی حد تک انگریزی سے ناواقف رہ کر کس طرح ان نئے اور بدلتے ہوئے حالات و حوادث سے عہدہ برآ ہوئے جو برطانوی حکومت، صنعتی تہذیب اور مغربی خیالات و تصورات کے لائے ہوئے تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے ایک ایسی عہد آفریں تحریک ''علی گڑھ تحریک'' کی بنیاد ڈالی جس نے کم و بیش تین چوتھائی صدی تک مسلمانوں کی علمی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی مقتضیات کی رہنمائی کی اور جس کے بارے میں یہ کہنا ایک حد تک بجا ہوگا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی صلاحیتوں کی اس طرح تنظیم کی اور ان کو اس قابل بنایا اور رکھا کہ وہ امن و آبرو کی زندگی بسر کریں اور وطن میں وقعت کی نظر سے دیکھے جائیں۔

سرسید، شبلی، چراغ علی معتقدات کو معقولات کی روشنی میں پیش کرنے میں بڑے کوشاں تھے۔ بغداد میں عباسیوں کے عہد میں ہندوستان میں مغلوں کی حکومت میں، انیسویں اور بیسویں صدی میں انگریزی (مغربی) اقتدار اور قومی تعصبات کے دور میں اسلام اور مسلمانوں کو نئے حالات اور خیالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لیے ان زبانوں کے اکابر علمائے شریعت اور حامیانِ ملت کو اسلام کی تعلیمات کو نئی روشنی میں تعبیر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ علی گڑھ نے یہ فریضہ سرسید، شبلی اور چراغ علی کے وسیلے سے ادا کیا۔ ان سے دور اور ان سے علاحدہ رہ کر جسٹس امیر علی کو بھی اسی مہم سے سابقہ ہوا۔ آگے چل کر یہی مرحلہ علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی،

---

[1] شبلی (1857ء-1914ء)

اور مولانا مودودی کو پیش آیا۔ تاریخ کے ہر بڑے موڑ پر جدید علم کلام تصنیف کرنے کی ضرورت سامنے آئی ہے۔ ایسا مسلمانوں ہی میں نہیں ہوتا آیا ہے، ہر قوم کو اس مرحلے سے گزرنا پڑا ہے اور پڑتا رہتا ہے۔

شبلی اور حالی کی سیرت نویسی اور تنقید نگاری میں ایک بات خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ شبلی نے سیرت کے لیے اسلام کے نام ورانِ سلف اور تنقید کے لیے فارسی شاعری کا انتخاب کیا، جن دونوں کا اعتبار و احترام ہمارے دلوں میں پہلے سے جاگزیں تھا دوسری طرف حالی نے (سعدی سے قطع نظر) غالب اور سرسید کو اپنایا، جو اپنے عہد میں بدنام نہ تھے تو ایسے نیک نام بھی نہ تھے اور اردو شاعری کی اس طور پر ''خبر لی'' کہ جو باتیں سب سے زیادہ مقبول تھیں ان ہی کو سب سے زیادہ ہدف ملامت بنایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ غالب اور سرسید کو جو شہرت اور نیک نامی آج نصیب ہے اور حالی کے نقد و جرح سے اردو شاعری جس منزلت کو پہنچی وہ محتاج بیان نہیں۔

سرسید کے ساتھیوں میں شبلی سے زیادہ جمالیات کا رمز آشنا دوسرا نہ تھا۔ یہ رنگ ان کے خطوط اور غزلوں میں بالخصوص اور دوسری اصناف انشا پردازی میں بالعموم ملتا ہے۔ ان کی نثر و نظم میں وہ رامش و رنگینی ہے جسے عجم کا لمس کہہ سکتے ہیں۔ شبلی طبعاً شاعر تھے۔ یہ رنگ ان کی تحریر و تقریر سب میں جھلکتا ہے۔ مورخ ہونے کے باوجود جہاں جذبات کا بہت کم دخل ہونا چاہیے جذباتی تھے۔ دوسری طرف سید سلیمان ندوی جو شبلی کے سب سے معتبر شاگرد اور جانشین سمجھے جاتے ہیں تاریخی مسائل کی تحقیق و توضیح میں جذبات سے سروکار نہیں رکھتے تھے۔ استاد کا لہجہ شاعرانہ اور خطیبانہ تھا، شاگرد کا متوازن اور مفکرانہ۔ سوچنے اور لکھنے کے اعتبار سے سید سلیمان ندوی شبلی کے بجائے حالی سے زیادہ قریب ہیں۔

نذیر احمد[1]:

اردو لکھنے کے جتنے اسالیب سرسید کے عہد میں بالخصوص ان کے رفقا میں مروج تھے ان سے پہلے کے لکھنے والوں میں نہیں ملتے۔ سبب یہ تھا کہ اس عہد میں قوم اور ملک کے گوناگوں مطالبات کے مطابق اہل فکر و نظر کے نو بہ نو حوصلے اور عزائم بھی بیدار ہو رہے تھے، جن کی بیشتر

---

[1] نذیر احمد دہلوی (1836ء-1912ء)

تعداد سرسید کے چشمۂ فیض سے سیراب اور سرسید ہی کے گرد جمع تھی۔ اوروں سے قطع نظر نذیر احمد کی زبان اس اعتبار سے بہت اہم اور دل چسپ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے دہلی کے ہر طبقے کی زبان کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ اردو میں ناول کی داغ بیل نذیر احمد نے ڈالی اور ناول جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ عہد کا سب سے نمائندہ، بلند آہنگ اور موثر ترجمان ہوتا ہے اور یہ حق پورے طور پر اسی وقت ادا ہوتا ہے جب دوسری باتوں کے علاوہ ناول نگار خواص و عوام کی زبانوں کا خاص طور پر التزام رکھے۔

ان کے ناولوں میں دہلی کے متوسط اور متوسط سے نچلے شریف گھرانوں کے افراد کی رہن سہن کی بڑی اچھی مصوری اور ان کی بول چال کے بڑے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے دلی کی خواتین کی زبان سے ہم کو آشنا کیا، جن سے بعد میں حکیم ناصر، نذیر فراق اور مولانا راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں بڑا کام لیا۔ خواتین کی بول چال کا ہماری زبان میں ایک اہم مقام ہے اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو شاید دنیا کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں۔ آج کل اس زبان کے ماہر اور دلی کے قدیم شریف گھرانوں کی معاشرت کے سب سے معتبر واقف کار آغا حیدر حسن دہلوی (عنیگ) ہیں جن کا ذکر ان اوراق میں آچکا ہے!

اردو نثر میں افلاس و عوام کا ذکر غالباً سب سے پہلے نذیر احمد کی تصانیف میں آیا ہے، جس کو پریم چند نے اپنی دردمندی اور فن کارانہ بصیرت سے حد کمال کو پہنچا دیا۔ قرآن پاک اور قانون کا اردو ترجمہ کرنے میں نذیر احمد نے جس ذہانت اور زبان پر جس غیر معمولی قدرت کا اظہار کیا ہے وہ بے مثل ہے۔ البتہ زبان اور زبان دانی کے اظہار میں وہ کہیں کہیں مناسب حدود سے تجاوز کر گئے ہیں اور حفظ مراتب کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں عربی اور انگریزی کے الفاظ بڑے شوق سے، بڑی کثرت سے، کبھی کبھی بے ڈھنگے طور پر، اور جا بجا بے ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ بے ضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال سرسید اور حالی کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن نہ اس قدر!

نذیر احمد کا شمار سرسید کے رفقائے ادب میں ہوتا ہے لیکن ان کی بیشتر اہم تصانیف سرسید کے حلقۂ اثر میں آنے سے پہلے شائع ہو چکی تھیں، اس لیے ان تصانیف کے موضوع اور

زبان کے بارے میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ان میں سرسید کا اثر کارفرما ہے۔ نذیر احمد ''علی گڑھ تحریک'' کے زبردست علم بردار صرف اپنے خطبات میں نظر آتے ہیں جس کا سلسلہ غالباً 1888ء سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے سرسید سے کچھ زیادہ شغف کا اظہار نہیں کیا، لیکن جلد ہی وہ سرسید کے زبردست معاون ومناد بن گئے۔

نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنھوں نے عورت کو داستاں طرازوں، بادشاہوں اور شاعروں کے قبضے سے نکال کر روزآنہ زندگی کے نشیب وفراز اور دھوپ چھاؤں میں دکھایا ہے۔ عورت کی حمایت اور ہمدردی میں سب سے پہلی آواز نذیر احمد اور حالؔی نے بلند کی۔ دونوں کے یہاں عورت کا اخلاقی تصور (روایتی!!) ملتا ہے۔ جس کی ترجمانی حالؔی کے مشہور طرز خطاب میں ملتی ہے۔

''اے ماؤ۔ بہنو۔ بیٹیو۔ دنیا کی زینت تم سے ہے''[1]

جس کی مذمت کرنے اور مضحکہ اڑانے میں جدید مکتبۂ فکر کے مرد اور عورت دونوں متفق ہیں۔

علی گڑھ میں عورت کا کم وبیش یہی اخلاقی تصور مدتوں مقبول رہا، جس کی طرف گذشتہ اوراق میں کہیں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ انداز 1934ء میں بدلا، جب ترقی پسند ادب کی تحریک وجود میں آئی اور جس طرح عورت کو پہلے داستان طرازوں، بادشاہوں اور شاعروں کے قبضے سے رہائی دلائی گئی تھی، اسی طرح ان کو نذیر احمد اور حالؔی (یا علی گڑھ) کی قید سے آزاد کیا گیا۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا جیسے عورتوں نے خود اپنے سے رہائی حاصل کر لی ہو! کیا رہائی ہے؟

اردو شاعری کو حالؔی اور شبلؔی نے شعریت وشرافت کی فضا، معیار وموضوع کی اہمیت اور فکروفن کے جن آداب سے آشنا کرایا تھا، وہ حسب تقاضائے زندگی وزمانہ، تھوڑا بہت جہاں تہاں

---

[1] حالؔی کی نظم ''چپ کی داد'' کا پہلا بند کا پہلا شعر ہے:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی ہستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے

یہ نظم سب سے پہلے رسالہ ''خاتون'' (علی گڑھ) کے دسمبر 1905ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی جو شیخ محمد عبداللہ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مرتبین

سے بنتے بدلتے، آج تک علی گڑھ سے فیض پائے ہوئے شعرا میں مقبول ہیں۔ طوالت کے اندیشے سے ناموں کی فہرست نہیں پیش کرتا۔

ان اوراق کو مرتب کرنے میں بعض ساتھی کام کرنے والوں کو بڑی زحمت اٹھانی پڑی جسے انھوں نے میری خاطر خوشی سے گوارا کیا۔ یہی نہیں بلکہ کتابت سے اشاعت تک کے جس ہفت خواں کو طے کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بھی ان ہی کو گزرنا پڑا۔ مواد کی فراہمی اور مباحث کی چھان بین میں بھی اُن سے گراں قدر مدد ملی۔ ان کا دل سے شکر گزار ہوں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ مسٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، مسٹر نسیم قریشی، ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی (رفقائے شعبہ) مسٹر فرخ جلالی (یونیورسٹی لائبریری) میں جانتا ہوں کہ یہ حضرات اپنے ناموں کا ظاہر کیا جانا پسند نہ کریں گے، لیکن مجھے ان لوگوں کا بھی کچھ کم خیال نہیں ہے جو تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہوں گے، یا کرنے والے ہوں گے۔ ان ناموں کے اعلان سے ان کو مخلص اور منجھے ہوئے کام کرنے والے ''سرمۂ مفت نظر'' کی روایتی قیمت سے بھی کم قیمت پر مل جائیں گے!

موجودہ اڈیشن سے علی گڑھ کے مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست حذف کی جاتی ہے بعض اساتذہ کے تذکرے میں کچھ اوراق کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

●

اپنی یاد میں

دیوتاؤں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جسے عزیز رکھتے ہیں، اسے دنیا سے جلد اٹھا لیتے ہیں۔ دیویوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جس کو عزیز رکھتی ہیں اسے کہیں کا نہیں رکھتیں۔ خود اپنے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دیویوں کو عزیز رکھنے کا سودا بُرا نہیں! مجھے اپنی پیدائش اور وفات دونوں کا علم نہیں۔ ان دونوں سانحات کے وقت دنیا میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوا اور ظاہر ہے جب تک انقلاب نہ ہو کسی بات کی اہمیت نہیں۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ میں نے بھی تمام عمر انقلاب پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں نے شعر بھی تمام عمر نہ کہے۔ غلط البتہ پڑھ سکتا تھا۔ نثر لکھتا رہا۔ شاعری پر قدرت ہوتی تو انقلاب کچھ دور نہ تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری آتی ہو تو انقلاب پیدا کرنے کا امکان کم اور ارمان بڑھ جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی صحیح ہو۔ غرض تمام عمر میں اور انقلاب ایک دوسرے سے بدگمان رہے۔ میری زندگی میں شاعر انقلاب پیدا ہونے لگے تھے، لیکن جس وقت میں نے ان کو چھوڑا ہے تو وہ سر بکف تھے اور انقلاب سر بگریباں!

میں نے نثر میں جو کچھ لکھا اور بکثرت لکھا وہ اردو داں طبقہ کے سامنے ہے۔ میں نے ہر طرح کی زندگی بسر کی اور ہر طرح کے لوگ دیکھے۔ آپ منتظر ہوں گے کہ میں اپنے مضامین

کے بارے میں کچھ اعترافات کروں۔ لیکن اعتراف کرنے سے پہلے میرے دل میں ایک بات کھٹکتی ہے۔ دل کی کھٹک میں مرنے کے بعد بھی ساتھ لایا ہوں۔ وہ یہ کہ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ مرتے وقت آدمی جو کچھ بیان کرتا ہے وہ سچ ہو یا نہ ہو عدالت اسے سچ تسلیم کرتی ہے، لیکن آپ یہ بتائیے کہ اگر کوئی شخص مرجانے کے بعد بیان دے تو آپ اسے سچ مانیں گے یا جھوٹ؟ اس سوال کا جواب دینے میں آپ کو مشکلات کا سامنا ہو یا نہ ہو کراماً کاتبین کو یقیناً ہوگا۔ آپ ہنسیں گے کہ مرنے کے بعد کراماً کاتبین کا کیا سوال، لیکن اتنا تو آپ جانتے ہوں گے کہ تحریروں میں ''مکرر آں کہ'' کی بھی تو کوئی حیثیت ہے!

مرنے کے بعد جو دقتیں پیش آتی ہیں ان میں ریڈیو نے اس ایک دقت کا اور اضافہ کردیا ہے کہ اپنی یاد میں مبتلا ہو جاؤ اور دوسروں کو ہنسنے کا موقع دو۔ مرنے کے بعد ہنسنے کا موقع دینا کوئی قابل فخر بات نہیں ہے، لیکن یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو مجھے یا کسی دوسرے کو اپنی حرکات سے باز رکھ سکے۔ جس دنیا کو میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں بہت سے ایسے لوگ تھے، اب بھی یقیناً ہوں گے، جنھوں نے کبھی کوئی قابل فخر بات نہ کی۔ لیکن ان کی بات اور ذات پر فخر کیا گیا۔

زندگی میں مجھے ہنسانا بہت پسند تھا، مرنے کے بعد رلانا مجھے بالکل پسند نہیں، لیکن اگر رونا کسی کا پیدائشی حق ہو تو میں اس میں مخل بھی نہ ہوں گا، البتہ کوئی بے سمجھے ہنس پڑے تو میں لڑ پڑوں گا اگر فی الفور مر نہ گیا۔ موت کا علم کسی کو نہیں گو موت سب کو آتی ہے، یہ میں شروع ہی میں کہہ آیا ہوں، لیکن جہاں میں ہوں (ملٹری نہیں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی آج کل مقام کا اتا پتا دینا خلاف مصلحت ہے) وہاں افواہ یہ ہے کہ میری موت واقع اس لیے ہوئی کہ ایک کور ذوق بغیر کچھ سمجھے محض احتیاطاً میری بات پر ہنس پڑا، اس کا خیال تھا کہ چوں کہ میں نے بات کہی ہے اس لیے وہ یقیناً کوئی ہنسی کی بات ہوگی! یہ فریقین کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا چنانچہ میں نے ڈوبنے کا انتظار نہ کیا مر گیا — اور کچھ کہہ نہ گیا! ارباب ریڈیو مجھ پر بڑے مہربان رہے ہیں ان کو گوارا نہ ہوا کہ ''مر گیا کچھ کہہ نہ گیا'' کا الزام مجھ پر قائم رہے، انھوں نے سب سے پہلے مجھے زندگی کے الزام سے بری کردیا۔ اس کے بعد مجھے موقع دیا کہ میں ''بیان استغاثہ'' یا ''جواب

ملزم" کے طور پر آپ کے سامنے کچھ پیش کروں۔ ریڈیو کی عدالت نے پہلے سے فیصلہ کرلیا ہے کہ میرا یہ بیان شاملِ مسل ہونے کے لیے عدالت العالیہ کو بھیج دیا جائے گا۔

ہنسنے ہنسانے کی علت نے زندگی کے آخر میں مجھے کٹکھنا بنا دیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بڑھاپے میں جب دانت مفارقت کر جاتے ہیں تو کٹکھنے پن سے اس کی تلافی ہوتی رہتی ہے، میں مرنے سے پہلے ادھ موا ہو چکا تھا۔ مجھ پر ایسے لوگوں کی ٹھول بڑی شاق ہوتی تھی، جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مجھ سے وہ بات اس طور پر کرتے تھے جیسے ان سے بڑا خوش مذاق یا خوش مذاقوں کا مربی و محسن کوئی دوسرا نہ تھا۔ دوسری طرف میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی غرض مجھ سے جلد سے جلد بیان کر دیں اور مجھ سے نہ ہو سکے تو بھی اسے جلد سے جلد پورا کر دوں۔ اکثر تو طبیعت ایسی اکتاتی ہے کہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ان کا کام نہ بھی کر سکوں گا تو بھی اس کو پورا کرنے کا جھوٹا حلف اٹھالوں گا، لیکن وہ برابر مذاقیہ جملے بولتے جاتے تھے اور خود ہی گنواروں کی ہنسی ہنس ہنس کر اپنے آپ کو داد دیتے جاتے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی سے باز آ کر مجھے جلد سے جلد...... گولی مار دیں۔ لیکن وہ "مزاح المزارعین" سے باز نہیں آتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو وقت وہ مسخرگی کے مظاہرہ میں صرف فرماتے وہی وقت میں اپنے دل کو مضبوط کرنے پر صرف کرتا تھا کہ سب کچھ کروں گا انہی کا کام نہ کروں گا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ مانگتے قرض اور میں کچھ نہ کر پاتا ان کا سوا اس کے کہ دوسروں سے قرض لے کر ان کے حوالہ کر دوں۔ چونکہ قرض لینے کے بعد وہ میرا یا میں ان کا سامنا نہ کر سکتے، اس لیے کراماً کاتبین اس قرض کا ثواب میرے نامۂ اعمال میں لکھ کر اس کی ایک نقل میرے پاس بھیج دیتے!

میری ایک دوسری دقت یہ ہے کہ میں اپنے فن یا موضوع یا اسلوب کے بارے میں گفتگو کہاں سے شروع کروں اور کیسے شروع کروں۔ میری زندگی کا بیش تر اور بہترین حصہ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں صرف ہوا۔ کوئی طالب علم مجھ سے پوچھتا کہ اچھا لکھنا کیسے آئے گا میں کہتا اچھے آدمی بن جاؤ اچھا لکھنے لگو گے۔ وہ مجھ پر ہنستا اور طرح طرح کے اقوال پیش کرتا، میں کہتا کہ سیکھنے مجھ سے آئے ہو قول دوسرے کا پیش کرتے ہو، میرے لیے تو میرا ہی

قول مستند ہے، وہ کہتا موتی پھر موتی ہے غواص کوئی ہو میں کہتا غواص اور موتی میں ربط نہیں تو پھر غواص چور ہے یا موتی جھوٹا وہ اس پر جز بز ہوتا تو میں اس پر ہنستا!

میں مسلمان پیدا ہوا۔ نہ میری پیدائش میں میرا کوئی دخل تھا اور نہ مسلمان ہونے میں، لیکن زندگی بھر جب مجھے ہر بات میں دخل تھا خودکشی بھی کر سکتا تھا اور اسلام سے منحرف بھی ہو سکتا تھا میں نے زندگی اور اسلام دونوں کو ایک ہی بات سمجھا۔ ظاہر میں بھی باطن میں بھی مجھے اسلام کا پابند رہنے میں مرتے دم تک کبھی کوئی اہتمام نہ کرنا پڑا۔ بری بات کو میں نے ہمیشہ برا سمجھا اور ہر اچھی بات میں اسلام کو معاون پایا۔ میں مسلمان پیدا نہ ہوا ہوتا تو بھی شاید مسلمان ہی رہتا یہ اور بات ہے کہ مسلمان نہ کہلاتا میں خدا سے سلوک کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہا۔ بغیر اس خیال کے کہ خود خدا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا اور بغیر اس بات کو ذہن میں لائے کہ خدا کا تصور مسلمانوں کا کیا ہے یا کسی دوسرے کا کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ رسالت مآب کا درجہ خدا نے کیا مقرر کیا تھا۔ رسالت مآب کا تصور میرے ذہن میں ہمارے ہی جیسے ایک ایسے انسان کا تھا جس سے بڑے اور برگزیدہ انسان کا تصور میرے ذہن میں بھی کبھی نہ آیا۔ میں کیا اور میرا تصور کیا لیکن میرے لیے تو یہ "میں" سب کچھ ہے!

مجھے اوائل طالب علمی ہی سے زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ فراز کم نشیب زیادہ۔ فارسی بہت کچھ اور عربی تھوڑی بہت گھر پر پڑھ کر میں انگریزی اسکول میں داخل ہوا۔ سال ہا سال اسکول میں اور چھ سال تک علی گڑھ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا۔ بورڈنگ لائف کا ٹھپہ میری بقیہ زندگی پر نمایاں رہا یعنی سپاہی اور قلندر کی زندگی آسودہ حال ہونے کے باوجود جب میں علی گڑھ کی اصطلاح میں کافی "عیاشی" کر سکتا تھا۔ دیو جانس کلبی کی طرح ایک ہی مختصر کمرہ میں پورا مکان اور اپنی ضروریات کا تمام سامان سموئے رکھتا تھا۔ سونے کا کمرہ، پڑھنے کا کمرہ، مہمان کا کمرہ، ملاقات کا کمرہ، کھانے کا کمرہ، لباس کا کمرہ، غسل خانہ، بساط خانہ غرض ہر گفتنی و ناگفتنی شدنی اور ناشدنی امور کا جائے وقوع جغرافیائی اعتبار سے ایک ہی تھا۔ چنانچہ میں مہمان کی حیثیت سے کہیں جاتا اور میزبان میری پذیرائی اور طعام و قیام میں اہتمام کرتا یا تکلف برتتا تو مجھے بڑی وحشت اور ذہنی تکلیف ہوتی تھی۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں کسی کا

مہمان شاید ہی بنتا تھا۔ اسکول میں کرکٹ، ہاکی، اور فٹ بال کا کیپٹن رہا، واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ مجھے کھیلنے کا شوق لایا، لیکن میں آیا ایسی ناکسی اور بے کسی کے عالم میں تھا اور وہ زمانہ علی گڑھ اور علی گڑھ والوں کی ایسی تمکنت وجلال کا تھا کہ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال میں میرا کوئی پرسان حال نہ ہوا۔ ناچار میں نے ٹینس سیکھنی شروع کی اور کچی بارک (عثمانیہ) میں چارپائی ٹینس کلب کا خودرو ممبر ہو گیا۔ جال کے بجائے چارپائی کھڑی کر لی جاتی تھی اور کچی بارک کے سامنے ریت سے اٹے ہوئے میدان پر لوٹے سے پانی ڈال کر کورٹ بنالیا جاتا تھا۔ ممبر ہر وہ شخص ہوسکتا تھا جس کے پاس چارپائی اور سیکنڈ ہینڈ گیند ہو۔ آنریری ممبر وہ ہوسکتے تھے بیت الخلا (جس کا نام اس زمانے میں برسرآفس بھی تھا) جاتے اور وہاں سے آتے وقت کورٹ کی مٹی اور روندی ہوئی لائن پر پانی ڈال کر اسے پھر سے نمایاں کر دیں۔

فرسٹ ایر میں جونیر اسکالر ہوا۔ سیکنڈ ایر سے ٹینس ٹیم میں آ گیا۔ تھرڈ ایر میں ڈیوٹی سوسائٹی کے وفد کے ساتھ مشرقی بنگال، چٹاگانگ اور برما کا دورہ کیا۔ بی۔ اے میں علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر اور ٹینس کا جنرل سکریٹری مقرر ہوا۔ ففتھ ایر میں یونین کا سکریٹری اور ایم۔ اے پاس کرتے ہی ٹینس کا پریسڈنٹ اور اردو کا لکچرر ہو گیا۔ میں نے انٹرنس پاس کرتے ہی کلرکی کر لی تھی۔ جب کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں تو کلرکی پر چلا جاتا تھا اور چھٹیاں ختم ہوتیں تو کالج چلا آتا۔ اس طور پر پانچ سال گزارے مجھے دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کر کے بہت سے مقامات اور عجیب وغریب انسانی کاروبار کے عجیب وغریب تجربات حاصل ہوئے، جو بجائے خود ایک مستقل داستان ہے۔ ایک بار دو مہینہ کے اندر اندر ایک طرف سر ریجنالڈ کریڈگ گورنر برما سے گورنمنٹ ہاؤس میمیو میں علی گڑھ حالات وحوادث بالخصوص علی برادران کی حمایت میں تیز وتند گفتگو کی دوسری طرف بنارس کی عدالت دیوانی میں فرش پر بیٹھ کر شام تک مسلسل نقل کی ہے اور ہیڈ کلرک اور منصرم کی جھڑکیاں اور چپراسیوں کی بے اعتنائیاں اٹھائیں۔ تیسری طرف علی گڑھ میں آکر ٹینس کے معرکۃ الآرا میچ اور معرکۃ الآرا تر یونین کے الیکشن جیتے ہیں۔ گذشتہ 28-29 سال میں علی گڑھ کا کوئی انقلاب ایسا نہ تھا جس سے میں بحیثیت طالب علم یا ممبر اسٹاف نہ گزرا ہوں۔ دراصل میں کھلاڑی تھا، جواری کبھی نہیں رہا۔ علی گڑھ نے کھیل میں اعتنا

نہ کیا تب بھی میں نے کھیل نہ چھوڑا۔ بالآخر اسے اعتنا کرنا پڑا میری سیرت، میری زندگی اور میرے مضامین میں کھیل ہی کے اصول اور عادتیں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ سچے اور پکے کھیل کی (Sportmanship) ''اسپورٹس مین شپ'' سے میں نے کبھی انحراف نہیں کیا۔ میں کھیل کا قائل تھا ہار جیت کا بالکل نہیں۔ مجھے کھلاڑی سے الفت اور مداری و جواری سے نفرت رہی۔

میری زندگی کا سب سے وقیع حصہ علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے لیے صرف ہوا۔ میں نے یہاں شہرت حاصل کی اور آسودگی پائی۔ علی گڑھ کی فیض بخشیوں نے مجھے دوسرے کے فیض سے بے نیاز کر دیا۔ علی گڑھ میری زندگی، میری شخصیت میری تحریر میں جاری و ساری رہا۔ بعض ناقدین نے میرے مضامین پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان میں علی گڑھ کی اتنی بہتات ہے کہ باہر والے ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ مجھے چاہئے کہ ہر مضمون کے ساتھ ایک فرہنگ کا اضافہ کر دیا کروں۔ یہ اعتراض صحیح ہے، مشورہ غلط ہے۔ فرہنگ اضافہ کرنے کا کام میرا نہیں ہے۔ ان کا ہے جو میرے مضامین کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ''قبول خاطر'' و ''لطف سخن'' کا میرا تصور کچھ اور تھا اور میرے اس انقیاد کا کچھ اور۔ علی گڑھ سے باہر بھی میں ہر حیثیت میں ہر حیثیت کے لوگوں سے ملا ہوں اور ہر حیثیت کی تقریب میں شرکت کی ہے۔ لیکن بات سمجھنے، بات کرنے اور صحیح و بروقت راہ دینے یا گرفت کرنے کا جو ملکہ میں نے علی گڑھ والوں میں پایا وہ مجھے اور کہیں نظر نہ آیا۔

''انداز گل افشانی گفتار'' مجھ میں علی گڑھ کے ہی ''پیمانہ وصہبا'' سے آیا۔ کسی معقول اجنبی سے ملتا تو بے اختیار و بے محابا سوال کرتا ''علی گڑھ میں بھی پڑھا ہے''؟ اگر وہ کہتا، ''نہیں'' تو افسوس ہوتا کہ کیسی کمی رہ گئی۔

میرے مضامین میں ''علی گڑھ کی بھرمار'' کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ ان تقریروں میں دور ہو گیا ہے۔ جو ریڈیو پر میں نے کی ہیں۔ ریڈیائی تقریروں میں میرے لیے بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ان تقریروں میں، میں اپنے اور اپنے فن کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ یوں تو انیس نے بھی کہا ہے کہ خیال خاطر احباب چاہئے، کہیں ان آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے لیکن ریڈیو نے خیال خاطر احباب کی خاطر اس درجہ احتیاط اور نزاکت برتی ہے اور ایسی ایسی ٹھیس بچاؤ

تدبیریں وضع کر دی ہیں کہ طنز وظرافت کے لیے زمین اور آسمان کی وسعتیں تنگ ہوگئیں اور میرا حال۔

''دست و پایم بشکستند وکمانم دادند''

کا مصداق بن گیا۔ طنز وظرافت میں احتیاط ضرور برتنا چاہئے اس سے طنز وظرافت میں لطف اور زور دونوں پیدا ہوتے ہیں لیکن ضرورت سے زیادہ پابندیاں عائد کر دینے سے فن میں کوتاہیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

تفریحی مضمون ہوں یا غیر تفریحی اتنی بات ہر شخص کو مان لینا چاہئے کہ فن بجائے خود کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔ یہ خود صاحب فن کی زندگی اور کارکردگی کا حاصل بھی ہوتا ہے اور اس کا جز و بھی۔ یہ وہ عبادت ہے جس کے لیے وہ غیب سے مامور کیا گیا ہے۔ ہر موجود یا ہر شخص کسی نہ کسی وظیفہ عبادت یا مشن کے ساتھ خلق کیا گیا ہے اور اسی وظیفہ عبادت یا مشن کے مطابق اس میں استعداد ودیعت کی گئی ہے۔ یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنا مشن یا اپنی عبادت دریافت کرے اور اسے پورا کرے۔ اسی عبادت میں اس کی نجات مضمر ہے، اگر وہ اپنی نجات چاہتا ہے۔ اسی بناء پر ہنسنا ہنسانا بھی ایک عبادت ہے اور اس عبادت کا اجر اتنا ہی ہے جتنا کسی بڑی سے بڑی عبادت کا ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ عبادت اسی خلوص، انصاف اور استقامت سے کی جائے جن سے دوسری عبادتیں کی جاتی ہیں۔

ظرافت یا طنز ایسی چیزیں نہیں ہیں جو کسی خاص چہار دیواری کے اندر خاص رسوم کے ساتھ کسی خاص پروہت کی نگرانی میں حاصل کی جائیں۔ دوسرے فنون یا انسانی سرگرمیوں کی مانند ان کا سرچشمہ بھی زندگی کی پراسرار اور ناپیدا کنار وسعتیں ہیں۔ کوئی شخص زندگی سے علاحدہ ہو کر نہ فن حاصل کر سکتا ہے نہ اپنے کو پا سکتا ہے، اسی لیے ظرافت ہو یا عبادت اس کو زندگی ہی میں ڈھونڈنا چاہئے۔ زندگی ہی سے اس کی آبیاری کرنا چاہئے اور زندگی ہی کے لیے اس کو کارآمد بنانا چاہئے۔ فن کی پرورش و پرداخت تھوڑی بہت فنی چیزوں سے ضرور ہوتی ہے، لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ ہماری ہی زندگی سے اپنی زندگی کو تقویت پہنچائے، پروان چڑھائے اور مفید بنائے فن اگر زندگی سے ترقی پاتا ہے تو زندگی ہی کی ترقی اس کا مقصد ہونا چاہیے۔

کسی اور فن سے قطع نظر طنز وظرافت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ محض کتابیں دیکھنے، دوسروں کی نقل کرنے، منہ بنانے، بندھے ٹکے فقرے کہنے، شور مچانے اور بکواس سے نہیں آتے۔ میرے زمانہ میں بہت سارے مزاح نگار پیدا ہو چکے تھے، لیکن ان میں دو چار کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس کی کارگزاری کو امید افزا کہا جا سکتا۔ اس وقت کے اردو دانوں کو بندہ بننے سے پہلے خدا بننے کا بڑا شوق تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ فن کہاں تک ترقی کر چکا ہے۔ ان کو اپنی خامیوں کا بھی احساس نہ تھا، وہ ہنس پڑنے کو ہنسا دینا سمجھتے تھے۔ میرے زمانہ تک ظرافت کا معیار قریب ''پنچ'' کا معیار تھا۔ رعایت لفظی، فقرہ بازی، شور وشغب، مضحک موضوعات کا انتخاب، تتلانا، ہکلانا، غرض وہی تمام باتیں، جو پنچ میں زیادہ شوخ اور بھونڈے رنگ وآہنگ میں ملتی ہیں۔ ان کے ہاں نسبتاً کم شوخ اور بھونڈے رنگ وآہنگ میں موجود تھیں۔ ہندوستان کا جو رنگ میرے زمانہ تک ازل سے چلا آتا تھا اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ممکن ہے ہندوستان کو آزادی جلد مل جائے ظرافت اس میں دیر سے آئے گی۔

ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے، طنز میں ظرافت کا دخل نہ ہونا چاہئے۔ میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ ظرافت کے لیے خوش دلی اور مرحمت درکار ہوتی ہے، طنز میں جوش، رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے انسانیت میں دونوں کا کیا مقام ہے، زندگی اور زمانہ کی مکروہات سے بیزار و بددل ہونا، طیش میں آجانا اور دوسروں کو شرمندہ یا برافروختہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن ان خرابیوں کو دیکھ کر مسکرا دینا اور دوسروں کو خواہ وہ کتنی ہی مصیبت و مایوسی میں کیوں نہ مبتلا ہوں اس پر آمادہ کر دینا کہ وہ ہنس کھیل کر ان مصائب و مکروہات سے گزر جائیں اور ان کو پاس نہ پھٹکنے دیں معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک طنز نگار جو فرائض جتنا جلد پورا کر دیتا ہے ظرافت نگار نہیں کر سکتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اکبر کی ظرافت نے یکہ وتنہا جو کام کیا وہ بہت سے طنز نگاروں سے مل کر بھی نہ ہو سکا۔ اکبر کے یہاں ظرافت کے ساتھ طنز بھی ملتی ہے، لیکن اس حد تک جس حد تک طنز کو ظرافت میں ملنا چاہئے۔ مغربیت کے نامحمود عناصر پر سب سے پہلے اور سب سے مؤثر حملہ اکبر کی ظرافت نے کیا۔ شبلی، ابوالکلام، ظفر علی خاں، محمد علی، عبدالغفار، عبدالماجد وغیرہ کی آتش نوائی ونشتر زنی بعد کی چیزیں

تھیں۔ نظر برآں ظرافت نگار کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے گزرے۔ مجبور ہو کر نہیں خوشی، فراخ دلی، حوصلہ اور خلوص کے ساتھ۔ ظرافت کی کوئی کان نہیں ہوتی جہاں یہ جواہرات مدفون ملتے ہوں۔ یہ جواہر پارے ہر مقام پر ہوا اور حرارت کی مانند سرایت کیے ہوئے ملیں گے۔ اس لیے کہ ایک ظریف اور طنز نگار کے لیے بھی سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اپنے تصورات، روایات اور عقائد پر پورا بھروسہ کر کے آگے بڑھے اور نوع انساں کو جہالت، تعصب اور ظلم سے نجات دلائے۔ ایک ظریف اور طنز نگار کو چاہئے کہ وہ سب سے بڑا کائناتی یا آفاقی انسان بن جائے۔

آپ کو سن کر غالباً تعجب ہوگا کہ میں نے شاید ہی کوئی مضمون بقول شخصے "خوشی خاطر" لکھا ہو، لکھنا اسی وقت شروع کیا جب ایسے لوگوں نے میری زندگی تلخ کر دی جن کو میں عزیز رکھتا تھا یا جن سے کسی قیمت پر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مضمون لکھ لینے پر سمجھتا تھا کہ میں نے بڑا کام کیا ہے۔ اس مضمون سے زمین و آسمان میں تہلکہ مچ جائے گا۔ شائع ہو جانے پر مجھے محسوس ہوتا کہ مجھ جیسا مہمل نگار شخص شاید ہی کوئی اور ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے شائع شدہ مضامین کو پھر سے شاید ہی کبھی پڑھا ہو۔ اگر کبھی ایسا کرنا پڑتا تو دو چار ہی فقروں کے پڑھنے کے بعد اپنے اوپر لعنت بھیج کر بند کر دیتا اور کہتا کہ میں تو اس سے بدرجہا بہتر لکھ سکتا تھا۔ یہ میں نے کیا کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب دوسرا مضمون لکھتا تو پھر اسی یقین کے ساتھ کہ کوئی نہ کوئی تہلکہ ضرور پیدا ہوگا۔ چنانچہ اسی طرح تمام عمر مضامین میں لکھتا رہا، تہلکات ملتوی ہوتے رہے اور میں عجب آزاد مرد نہ ہونے کے باوجود "حق مغفرت کرے" ہو گیا۔

مجھے مضامین لکھنے میں بہت اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ اس کا اہتمام کہ کسی طرح مضمون لکھنے کا وقت ٹلتا رہے۔ خواہ مخواہ ارد گرد کی صفائی، جو باتیں اپنی یا دوسروں کی مدتوں سے التوا میں پڑی آرہی تھیں ان کے پورا کرنے میں انہماک مہمل جزئیات کی تکمیل، لکھنے کا سامان بے ضرورت ٹھیک ٹھاک کرنا وہ حرکتیں کرنا جو کسی اور وقت کبھی نہ کروں، اپنے اوپر وہ جذبہ طاری کرنا جس کے طاری کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ چھوٹے بڑے سے حق بخشوانا یا لڑائی مول لینا اس طرح کی حرکتوں میں لکھنے کا موقع نکل جاتا تو اپنے پہ آفریں کرتا کہ اتنے کام ہوتے کون شخص مضمون لکھ سکتا

تھا۔ پھر حرج ہی کیا ہے مضمون نہ لکھا گیا نہ سہی، کتنے اور ضروری کام کر ڈالے۔ کچھ دن بعد پھر جبراً قہراً لکھنے بیٹھتا۔ ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا کہ پہلی بار گردو پیش کی جس طرح چول بٹھائی گئی تھی وہ بگڑ چکی ہے پھر سے درست کرنا چاہئے۔ دل گواہی دیتا کہ یہ حرکت سخت نامعقول ہے۔ مجبور ہو کر بیٹھ جاتا اور لکھنے پر آمادہ ہوتا، ارد گرد کی تمام چیزیں دعوت دینے لگتیں کہ ہم حسب معمول تمہاری توجہ کے محتاج ہیں، لکھنے کی ذمہ داری یہ کچوکے لگاتی کہ میں بڑا ہی بے ایمان اور کام چور ہوں، خواہ مخواہ کے بہانے تراشتا ہوں۔ غصہ میں آ کر پھر خفیف ہو کر اس پر آمادہ ہو جاتا کہ کسی کے دو چار فقرے چوری کر کے لکھ دوں کاش کوئی اچھا سا شعر یاد آ جاتا، کوئی پھڑکتا ہوا فقرہ قابو میں آ جاتا، نتیجہ یہ ہوتا کہ سارے فقرے اور اشعار بے مزہ اور بے محل معلوم ہونے لگتے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا جس کا نہ سر ہوتا نہ پیر، سارا صفحہ ایسا نظر آنے لگتا جیسے ہتھیلی کی ریکھاؤں کا چربہ اتار رہا تھا۔ دوسرے صفحہ کا بھی یہی حشر ہوتا، یک لخت کوئی نعرہ لگا کر اٹھ کھڑا ہوتا کہ گولی مارو اس لکھنے پر، آخر بندہ بشر ہوں کب تک سر کھپاؤں، مونگ پھلی والا کب سے آواز دے رہا ہے موزے پہنے پہنے پاؤں دم بخت ہو گیا، اب مونگ پھلی کھائی جائے گی اور ننگے پاؤں ٹہلا جائے گا۔

مونگ پھلی کھاتے اور ننگے پاؤں پھرتے دیکھ کر غریب دل بھی صبر کر کے بیٹھ جاتا، اتنے میں باغ کی طرف توجہ مائل ہو جاتی۔ اوہوہوہو، آج خانساماں نے صاف کپڑے پہن لیے فلاں سوکھا گلاب پنپنے لگا۔ بھنگن نے خوب جھاڑو دی ہے۔ لان کس درجہ سبز اور ہموار ہے، ذرا اس پر چل کر تو دیکھوں، واہ واہ قالین بھی اس کا جواب نہیں، کیا خوب شعر کہا ہے۔ پھولا جو ڈھاک بن میں وہ زمانہ یاد آ گیا۔ جب میں بچپن میں اسکول جاتے ڈھاک کے جنگل سے گزرتا، جنگل سے گزر رہا ہی تھا کہ سارا مضمون مستحضر ہو گیا۔ بھاگ کر اپنی کرسی پر آیا، لکھنا شروع کر دیا، جو باتیں حاشیہ خیال میں بھی نہ آئی تھیں وہ ذہن میں آبشار کی مانند گرنے لگیں، خیالات، قلم کی روانی سے آگے بڑھنے لگے۔ اس خیال سے کہ کہیں ان کو بھول نہ جاؤں کاغذ کے حاشیہ پر وقتاً فوقتاً نوٹ کرنے لگا۔ اگر اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ پیش آ جاتا کہ مضمون بند کر کے گھاس کھودنی پڑتی یا کئی دن کے لیے لکھنا ملتوی کرنا پڑتا تو قطعاً کوئی ہرج واقع نہ ہوتا۔ جب بیٹھتا خیالات کی روانی شروع ہو جاتی۔ مضمون مکمل ہو جانے پر اس کے نقل کرنے کا مرحلہ

پیش آتا میں نقل کرنے میں اپنے مضامین پر اصلاح دیتا تھا۔ جتنی بار یہ مضمون نقل ہوتا اتنا ہی سجل ہو جاتا اس لیے میں اپنے مضامین صرف انتہائی مجبوری کی بناء پر کسی دوسرے سے نقل کراتا۔ اپنا مصلح و معلم بننے کا ملکہ حاصل کرنا انشاء پرداز کے لیے سب سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

میں نے بعض ایسے دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی وفات پر بھی مضامین لکھے ہیں جن سے مجھ کو یا جن کو مجھ سے بڑا شغف تھا۔ ان مضامین کے لکھنے میں کوئی دقت کبھی پیش نہ آئی۔ ان کے لکھنے میں مجھ سے صبر و ضبط کا دامن اکثر چھوٹ گیا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کی تکلیف سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور ان کی دائمی مفارقت مجھے یک لخت زیر و زبر کر دیتی تھی۔ چنانچہ لکھتے وقت میں محسوس کرتا تھا کہ میں اس عزیز کے حضور میں اپنے جسم و جان اور ذہن و خیال کی ساری متاع پیش کر رہا ہوں۔ اس حالت میں انشاء پردازی کے سارے لوازم میرے دل سے یکسر محو ہو جاتے تھے۔ ان مضامین میں الفاظ و عبارت، لب و لہجہ، انداز و اسالیب نکلتے میرے ہی ذہن و قلم سے تھے، لیکن آتے معلوم نہیں کہاں سے تھے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایسے مواقع پر صرف مناسب کلمے اور جذبات برآمد ہوں گے جن کو جوں کا توں پیش کر دینا سب سے اچھا اور برگزیدہ فریضہ ہے اور فن بھی۔

میں نے بچوں کے لیے بھی مضامین لکھے ہیں، مجھے بچوں سے بڑی الفت تھی، لیکن اسی وقت تک جب تک ان کے بچپن میں آورد نہیں آمد ہوتی تھی۔ مجھے ضرورت سے زیادہ نستعلیق اور زیادہ تمیزدار بچے زیادہ پسند نہ تھے، بچوں کو زیادہ سمجھ دار نہ ہونا چاہیے اور نہ خواہ مخواہ ان کو بہت زیادہ صاف ستھرا اور پٹاری کا انگور بنانا چاہیے۔ یہ بات آگے چل کر ان میں عجیب و غریب نفسیاتی الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کو سدھارنے میں آج کل جتنا اہتمام کیا جاتا ہے وہ ضرورت سے زیادہ ہے اور یقیناً اتنا مفید نہیں ہے جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی چوتھائی کوشش اگر بچے کے والدین اور اس کے گھریلو ماحول کے درست کرنے میں کی جائے تو نتیجہ نسبتاً نہایت درجہ امید افزا ہوگا۔ بچہ اپنی عاقبت شاید ہی ساتھ لاتا ہو۔ اکثر و بیشتر اس کے والدین اپنی عاقبت بچے کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ یہ ایک سانحہ ہے جس پر ہندوستان میں بہت کم غور کیا جاتا ہے۔ جہاں سب سے زیادہ غور کرنا چاہیے۔

میں نے بڑی کثرت سے ہر طرح کے مضامین لکھے اور ترجمے کیے۔ دوسروں کی بیگار بھی کافی کی ہے۔ اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ایک صاحب کو جو کچھ لکھ کر دیا دوسرے صاحب کی فرمائش پر ان کی طرف سے اس پر نکتہ چینی بھی کرنا پڑی۔ جواب اور جواب الجواب کا یہ سلسلہ مدتوں قائم رہا۔ اس قسم کی حرکتوں سے میں بڑی حد تک اس بات کا قائل ہو گیا کہ یہ کافر دماغ جو چاہے کر دکھائے خیر کو شر اور شر کو خیر ثابت کر دینا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ ذہینوں کا کیا اس مفسدہ پردازی کا اندازہ عام لوگ بالخصوص معصوم اور پُر جوش نوجوان بالکل نہیں کر سکتے اور مارے جاتے ہیں۔

لیکن اصلی لطف مجھے بے تکلف اور مخلص دوستوں کو خط لکھنے میں آتا تھا۔ ان خطوط میں مجھے سب کچھ لکھ دینے میں مطلق باک نہ تھا اور یہ خطوط میرے اچھے برے خیالات اور جذبات کی سب سے اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے اکثر اس کا خیال آیا کرتا تھا کہ کہیں یہ منظر عام پر نہ آ جائیں۔ چنانچہ ایک بار ایک عزیز دوست[1] کی وفات کی خبر آئی تو میں بہت لمبا اور مشکل سفر کر کے جلد سے جلد پہنچا۔ یہ میرے خطوط بہت سینت کر رکھتے تھے میں نے پہنچتے ہی مرحوم کے کاغذات کا جائزہ لیا اور اپنے خطوط کے بنڈل قبضہ میں کر کے آگ کے حوالہ کر دیا۔ خدا کرے میرے اس قسم کے خطوط جن عزیزوں دوستوں کے پاس ہوں وہ میرے جذبات کا احترام کر کے ان کو تلف کر چکے ہوں وہ میرے ان کے درمیان پرائیویٹ گفتگو تھی جس کو مشتہر کرنا اخلاقی جرم ہے۔ میرے نزدیک اصلی اور اچھے خطوط وہی ہوتے ہیں جن کو شائع نہ کیا جا سکے۔ مجھے لکھنے پر جو قدرت حاصل تھی اس کی واقعی خوشی مجھے اس وقت ہوتی تھی جب میں اطمینان سے مخصوص احباب و عزیزوں کو خط لکھنے بیٹھتا یا ان کو کسی اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلانی ہوتی۔ اس وقت مجھ پر عجب سرخوشی اور ایک ناقابل بیان ارضی و غیر ارضی کیفیت طاری ہوتی میں محسوس کرتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ براہ راست مکتوب الیہ کے دل میں اترا جا رہا ہے۔

---

[1] اصغر حسین اصغر یکم مارچ 1884ء کو پیدا ہوئے۔ اصل وطن گورکھپور ہے۔ گونڈہ میں مستقل قیام رہا۔ ادبی دنیا میں اصغر گونڈوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ 30 نومبر 1936ء کو الہ آباد میں انتقال ہوا۔ اصغر صاحب کی وفات کے بعد رشید صاحب نے ان کے نام اپنے تمام خطوط جلا دیئے تھے۔ (مرتبین)

یہی نہیں بلکہ اس کا ذہن و دماغ میرے قبضہ میں ہے۔ میں جس طرح چاہوں اسے پلٹے دے سکتا ہوں یہ بات کہنے کی نہیں ہے لیکن سن لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ میں نے خطوط لکھ کر بڑے کام نکالے ہیں۔

خطوط کا اصلی جوہر خلوص اور اعتماد ہے۔ اپنا خلوص اور دوسرے پر اعتماد خطوط میں قابلیت کا اظہار نہ کرنا چاہئے۔ اپنی شرافت اور خیر اندیشی کو پیش کرنا چاہئے۔ بقول روسو: علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے، خلوص کی کمی علم سے کبھی پوری نہ ہوئی۔

اب میں تھوڑی دیر کے لیے آپ سے متفرق باتوں پر گفتگو کروں گا۔ بقول میرؔ ''پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا'' مجھ سے نہیں بلکہ کسی اور سے میں نے بہت پڑھا لیکن یہ بالکل نہیں بتا سکتا کہ کیا پڑھا۔ مجھے کسی کتاب کا مضمون یاد نہیں رہا، لیکن اس کے تاثرات قائم رہے۔ ایک کتاب کا نصف صفحہ بھی پڑھ کر بھول جاتا کہ کیا باتیں لکھی تھیں لیکن یہ محسوس کرتا کہ دماغ کے بعض نامعلوم سوتے کھل گئے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت کچھ لکھنے لگتا تو وہ کوئی ایسی بات ہوتی جو پہلے کبھی ذہن میں نہ آئی تھی اور اس کتاب میں بھی نہ تھی جو میں نے ابھی پڑھی تھی۔ میرے دو ایک ایسے گہرے اور مستند دوست تھے جن کو مدنظر رکھ کر میں لکھنا شروع کرتا تھا، ہر بات اور ہر فقرہ کو ذہن میں تول کر لکھتا تھا کہ یہ بات میرے دوست تک پہنچی تو وہ داد دے گا یا نہیں۔ اس نے داد دے دی تو پھر مجھے اس کی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ خلق اللہ نے اسے پسند کیا یا نہیں۔ چنانچہ اگر زمانہ میں میرے کارنامہ کی دھوم ہو جاتی لیکن دوست مطمئن نہ ہوتا تو میں اپنی نظروں سے گر جاتا تھا اور مجھے دوسروں کی توصیف منہ چڑھاتی معلوم ہوتی۔ میں ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے آدمی سے ملا تھا جو مذہب، سیاست، حکومت، شعروادب، فلسفہ وحکمت اور اس قسم کی دوسری باتوں میں ممتاز تھا۔ مجھ پر کسی کا اثر نہ ہوا یعنی ملنے کے بعد میں نے اپنے اندر کوئی تغیر محسوس نہیں کیا۔ مایوسی اکثر ہوئی، سوا مخلص دوستوں کے جن سے ملنے کے بعد مجھ کو ہمیشہ اپنی موجودہ سطح سے بلند ہونے کا ولولہ پیدا ہوا۔ میں ہر مذہب کا احترام کرتا تھا مگر میں نے مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقائد کی خانہ پری کر کے اعمال سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھنا چاہتے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے بلکہ انسانوں کی نجات

انسانوں کے سپرد کی ہے۔ خدا نے عقائد وعبادت کو خدمت خلق کے راستہ سے نازل کیا ہے اور اسی راستہ سے وہ ان کو پرکھے گا۔ عقائد اور اعمال کو یہ لوگ علاحدہ علاحدہ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں، حالاں کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا کا فرمان اور منشا علاحدہ خانوں میں نہیں بٹا ہے۔ دنیا کیا چیز ہے؟ زندگی کا کیا مقصد ہے؟ انسان کیوں پیدا کیا گیا؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ ان باتوں نے مجھ میں نہ کبھی تجسس پیدا کیا نہ تشویش۔ شرافت، خوش دلی اور بہادری ان سب کا جواب ہے۔ غالباً اسے بھی اسلام ہی کہتے ہیں۔ ہر انسان انسان ہی نہیں خدا بھی ہے اس کو اپنے اوپر دوسروں پر نہیں، خدائی کرنے کے لیے خدا نے بھیجا ہے۔ اس لیے انسان قطعاً مجبور نہیں ہے مختار ہے۔ مختار اس کو نہیں کہتے کہ جو چاہے کر ڈالے۔ مختار وہ ہے جو اپنی اچھی استعدادوں کو پورے طور پر اور آخر تک بر سر کار لا سکے۔ خواہ وہ استعداد معمولی ہو یا غیر معمولی اس کے بعد ہر انجام انعام بن جاتا ہے خواہ وہ المناک ہی کیوں نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہے۔

میرے زمانہ میں ہندوستانی عورتیں اپنی اصلاح اور اپنے ترفع میں اتنی سرگرم نہ تھیں جتنی ان سے کچھ قبل ان کی پیش رو تھیں۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ وہ دشوار گزار اور اصلی راستہ کو چھوڑ کر ارد گرد کی پگ ڈنڈیوں پر جا پڑی تھیں۔ جہاں وہ سفر کی صعوبت سے پناہ لے کر جنگلی پھل پھول کے درمیان پکنک منانے میں مصروف ہوگئیں اور بالآخر پکنک ہی کو منزل مقصود قرار دے دیا۔ جس طرح اقبال نے ایک جگہ بتایا ہے کہ نماز میں سجدہ کرنے کی آزادی مل جانے سے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کو آزادی نصیب ہوگئی ہے اسی طرح یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ عورتوں کو سنیما اور ناچ گھر میں جو فروغ نصیب ہوا اور نوجوان شعرا اور ادیبوں نے عورتوں کو جس حیثیت سے نظموں اور افسانوں میں جگہ دی اس سے عورتیں سمجھنے لگیں کہ انھوں نے زندگی کی بازی پوری نہیں تو بڑی حد تک جیت لی۔ جنگ کی ہولناکیوں میں عورت پر جو گزر جاتی ہے اس کا احساس عورت عجیب غلط طور پر کرتی ہے۔ وہ اپنی مانگ بڑھنے کو اپنی ترقی سمجھنے لگتی ہے۔ عورت جھوٹی اور چمک دار چیز کی طرف بہت جلد مائل ہو جاتی ہے۔ میں نے جب دنیا کو خیر باد کہا ہے تو وہ اپنی زندگی کی بتی کو دونوں سروں سے روشن کیے

ہوئے تھی۔ روشنی یقیناً زیادہ ہوگئی تھی، لیکن شمع جلد بجھنے والی تھی! میرے زمانہ تک عورت کی مدد کوئی نہیں کرنا چاہتا تھا، حاصل سب کرنا چاہتے تھے۔ افسانوں اور نظموں میں صرف جوان عورت کی پرستش و پذیرائی کی جاتی تھی۔ ان کی والدہ، چچی، ممانی، دادی خالہ وغیرہ کو کبھی جگہ دی بھی جاتی تھی تو نوکروں کے ڈبہ میں۔

اردو لکھنے والوں کی تعداد خاصی ترقی کر چکی تھی۔ ان میں ٹھکانے کے لکھنے والے بالعموم وہی لوگ تھے جو مغربی علوم اور طرز انشاء سے واقف تھے۔ مغربی ادب کے مقابلہ میں اردو ادب کا تذکرہ بے کار ہے۔ غزل کے علاوہ جو بدنام ہونے کے باوجود اردو شاعری کی آبرو تھی، اردو ادب کو مغربی ادب سے بہت کچھ نہیں بلکہ سب کچھ سیکھنا باقی تھا۔ ہندوستان والے جتنا چاہیں مغرب پر لعنت بھیج لیں، لیکن محض لعنت بھیجنے سے نہ کبھی کام بنا ہے اور نہ بنے گا۔ اگر اردو لکھنے والے یہ چاہتے ہیں کہ اچھے اور بڑے مصنفین کے پہلو میں جگہ ملے تو ان کو مستند مغربی مصنفین کا نہایت کثرت سے، نہایت گہری نظر سے اور نہایت خلوص اور فراخ دلی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیا لکھنا چاہیے، کہاں پہنچ کر لکھنا چاہیے اور کیسے لکھنا چاہیے۔ یہ باتیں مستند مغربی مصنفین کے ہاں ملیں گی۔ لیکن یہاں ایک خطرہ کا بھی اظہار کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ مغربی مصنفین کا مطالعہ ہی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ خود مطالعہ کرنے والا بھی مخلص اور متمدن ہے یا نہیں۔ مغربی تصانیف کو اردو میں ڈھالنے کا سلیقہ ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ہم کو جن مغربی مصنفین یا ان کے اسالیب یا موضوع سے روشناس کر رہا ہے، وہ دوسرے یا تیسرے درجہ کے مصنفین ہیں۔ وہ ہمارے ملک اور زبان کے مزاج سے واقف ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے معمولی درجہ کے مغربی مصنفین یا تصانیف سے فائدہ اٹھانے کے درپے ہو۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے زمانہ میں یہ خرابیاں اردو میں راہ پا رہی تھیں۔ اردو کو نقصان پہنچ رہا تھا اور مغربی مصنفین بھی بدنام ہو رہے تھے۔

مجھے اچھے کھانے، اچھا پہننے اور راحت کی زندگی پسند نہ تھی۔ یہ باتیں دراصل عورتوں اور بچوں کو زیب دیتی ہیں۔ میں سب سے کم وقت کھانا کھانے، کپڑا پہن لینے، منہ ہاتھ دھونے، حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے یا سفر کے لیے آمادہ ہو جانے میں لیتا تھا۔ یہ بات میرے دل

میں بیٹھ گئی تھی کہ دل میں خوشی اور خلوص ہو تو رسمی تکلفات بے معنی ہیں، مجھے اپنے اوپر وقت ،دولت، راحت اور اس قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا بڑا شاق ہوتا تھا۔ لیکن مجھے یہ چیزیں بجائے خود ناپسند نہ تھیں۔ مجھے ہر پسندیدہ چیز پسند تھی، البتہ میں اس کے درپے رہتا تھا کہ اپنے بجائے ان کا فائدہ میں دوسروں کو پہنچاؤں۔ میری ایک کمزوری ایسی تھی جس کو میری زندگی میں غالباً کسی نے نہ پہچانا، وہ یہ کہ میں ڈرانے دھمکانے سے کبھی قابو میں نہیں آ سکتا تھا۔ اگر مجھے کوئی ڈراتا یا دھمکاتا تو نبرد آزمائی کے لیے مجھ میں بعض نہایت نامعقول خصائل بیدار ہونے لگتے تھے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ یعنی میں جس کو دوست سمجھتا یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا یا جس کو میں مجبور و مظلوم سمجھتا تھا اس کی حمایت میں خواہ وہ بیجا کیوں نہ ہو۔ عقل اور اخلاق دونوں سے گزر جانے میں مطلق تامل نہ کرتا، الکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا خواہ فریق مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوا ہو۔

مجھے زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی ہے جو میرے اطمینان کے مطابق پوری نہ ہوئی، یعنی یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجت مند کی اپنے اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا یا میرا کوئی ایسا دولت مند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی تو وہ میری خاطر اور مجھ پر بھروسہ کر کے اسے پورا کر دیتا۔ میں خدا کی ناشکری نہ کروں گا۔ اس بارۂ خاص میں میرے دوستوں ہی نے نہیں بلکہ میری تحریک پر بعض اجنبیوں نے غیر متوقع طور پر مدد کی لیکن واقعہ یہی ہے کہ میری یہ تمنا اس حد تک پوری نہ ہوئی جس حد تک میں اسے پوری دیکھنا چاہتا تھا۔ میں خدا سے انھیں نا کردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی راز ایسا نہیں ہے جس سے وہ لوگ واقف نہ ہوں، جن کو اس راز سے واقف ہونے کا حق حاصل تھا، میں دوستی چھپا سکتا تھا دشمنی کبھی نہ چھپا سکا۔ حماقتیں میں نے اکثر کی ہیں سازش کبھی نہ کی۔

علی گڑھ میں رہ کر میری عادت ہو گئی تھی کہ ہر کام خواہ کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اس وقت کیا جائے جب اس کام کا وقت بالکل ہی گزر جانے پر آ گیا ہو۔ کام ہمیشہ وقت ہی پر ہو کر رہا، لیکن اس کے لیے جس بے تکی و بے پناہ جدوجہد کو بر سر کار لانا پڑتا اس سے عہدہ برآ ہونے کا احساس بھی بڑے مزے کا ہوتا۔ اس سے مجھ میں وہ اعتماد پھر عود کر آتا جس کو میں کسی نہ کسی وجہ

سے کھو چکا ہوتا تھا۔ اس لیے میں اپنے آپ میں نوجوانوں کا حوصلہ اور تب و تاب محسوس کرنے لگتا۔ یہ وہ خود فریبی تھی، جس نے مجھے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے مقابلہ میں مستعد اور مگن رکھا، میں کام اس وقت زیادہ کرتا تھا جب فرصت کم ہو، موسم خراب ہو اور طبیعت بھی اچھی نہ ہو۔ ایسے مواقع پر کام میں لگ جانا یوں مفید ہوتا کہ میرا ذہن تکلیف اور نامساعد حالات کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا تھا۔ کام کرنا وہ نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر قسم کے مصائب غرق کیے جاسکتے ہیں۔ جب موسم خوشگوار ہوتا اور طبیعت بحال ہوتی تو مجھے کام کرنا مطلق پسند نہ تھا۔ میری لغت میں تعطیل منانے کے یہ معنی تھے کہ کسی کو مزے کا خط لکھا جائے، گھر سے باہر قدم نہ نکالا جائے۔ باغ میں کام کیا جائے، گھر کی صفائی کی جائے، ایک آدھ وقت کا کھانا ترک کردیا جائے یا دو چار وقت کا کھالیا جائے، بیوی، بچوں کو بھی کوئی کام نہ کرنے دیا جائے۔ جو ملنے آئے اس سے طرح طرح سے بچا جائے، غسل کرنے کا اہتمام کیا جائے اور صرف ہاتھ پاؤں کو جھاڑ پونچھ لینے پر اکتفا کی جائے۔ بڑا قرض لے کر چھوٹے چھوٹے قرض ادا کیے جائیں اور جو رقم بچ رہے اسے لے کر بازار چلا جائے اور بے ضرورت چیزیں خرید لائے۔ مجھے قرض لینے اور اس کے ادا کرنے کی بے حد خوشی ہوتی تھی۔ میں قرض کو فنون لطیفہ میں سے سمجھتا تھا۔ کب لیا جائے، کس سے لیا جائے کس طرح لیا جائے۔ اس سے دوستی بڑھائی اور دشمنی گھٹائی کس طرح کی جاسکتی ہے۔ میرے ایک دوست تھے جو اکثر بے وجہ مجھ سے خفا یا اپنی بیوی کی طرف سے مغموم ہوجایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی میں ان کو ایسی حالت میں پاتا تو فوراً کسی بہانہ سے قرض مانگ بیٹھتا اور وہ یک لخت چونکنے اور چونچال ہوجاتے تھے۔

زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بدتوفیقی تھا، یہ باتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لیے روا رکھی جاسکتی تھیں۔ دنیا اور اس کے کاروبار اتنے دلچسپ تھے اور ہر آن انسان کو بہتر و برتر بنانے میں اس درجہ معاون ہوتے تھے کہ میں سونے میں ان کو کھونا گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ سونا محض سونے کی خاطر میرے نزدیک فعل عبث تھا۔ دنیا دیکھنے اور برتنے کا جو لطف اور ذمہ داری ہے اس کو آدمی سمجھ لے تو میرا خیال ہے کہ وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی سونے پر آمادہ نہ ہوگا۔ سیاسی سرگرمیوں کی خاطر نہ مجھے جیل خانہ پسند تھا نہ جاہ و منزلت میں اس

آدمی سے بہت خوش رہتا تھا جو مجھ سے کم سے کم ملتا اور زیادہ سے زیادہ مجھ سے کام لیتا۔ مجھے دربارداری سے سخت نفرت تھی۔ درباراری کے محتاج وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لیے وہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اپنا نفس لعنت بھیجتا ہے تو وہ کرایہ کے قصیدہ خواں، اپنے اردگرد رکھتے ہیں۔ طوائف سے ہمدردی بھی کی جا سکتی ہے دربار پر صرف لعنت بھیجی جا سکتی ہے۔

میرے زمانہ میں سینما کو بڑی ترقی اور اہمیت حاصل تھی۔ سب سے کم سینما دیکھنے والوں میں میرا بھی شمار تھا۔ میں تصویر دیکھنا گناہ نہیں سمجھتا تھا، لیکن مجھے اچھا مضمون لکھنا اور بیوی بچوں یا دوستوں اور دشمنوں میں بیٹھ کر نئی تصویریں بنانا زیادہ پسند تھا۔ ممکن ہے میں نے اچھے ہندوستانی فلم نہ دیکھے ہوں۔ اسی سبب سے میری رائے یہ ہو کہ قدیم ہندوستانی تھیٹر اور موجودہ ہندوستانی فلم میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں کے اداکار قولنج یا ہسٹریا میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ وہ اداکاری اور حرکات میمونی میں بہت کم فرق کر سکتے تھے۔ میں نے سینما کے اداکاروں کو دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہے تھے لیکن رونے کے دوران میں گاتے اس اہتمام و مشاقی سے تھے کہ تال وسم میں ذرہ برابر فرق نہ آنے پاتا تھا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا۔ سینما کمپنیاں روپیہ کمانے کے فن میں طاق تھیں۔ وہ فن کے رموز سے بے بہرہ اور زندگی کے آداب سے لاعلم تھیں۔ ان کے ہاں زندگی عبارت تھی صرف حسن اور عشق سے۔ عورتوں کا حسن اور عورتوں سے عشق! حسن اور عشق کا یہی تصور اور اتنا ہی سا تصور غالباً جانوروں کا بھی ہوتا ہے مجھے سینما سے اتنی دلچسپی ضرور تھی کہ جو باتیں مجھے دنیا کے پردہ پر نظر نہ آتی تھیں وہ مجھ کو سینما کے پردہ پر نظر آ جاتی تھیں۔

عورتوں کے بارے میں میری کچھ ہی رائے کیوں نہ ہو میں جنسی میلانات کو بڑی اچھی چیز سمجھتا تھا اور جو ایسا نہیں سمجھتا تھا اس کو میں کسی جنس میں نہیں سمجھتا تھا لیکن میں جنسی میلانات کو بدوضعی کا بہانہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ان میلانات کی موجودگی مستحسن ہے اس کا مظاہرہ مذموم ہے۔ ہر انسانی فعل کا محرک جنسی میلان ہو سکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک جنسی میلان کا ارتکاب نہ کر لیا جائے اس وقت تک کوئی کام شروع نہ کیا جائے اور کوئی کام، کام نہیں جب تک اس پر جنسی میلان کی مثبت کاری نہ ملے۔ ہر بات خدا سے منسوب کی

جاتی ہے، لیکن محض اسی بناء پر کسی عدالت یا مولوی نے ملزم یا مجرم کو معاف نہیں کیا ہے۔ میلان اور اعلان ہم قافیہ ہوں تو ہوں ہم معنی تو نہیں ہیں!

مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے بڑی بے اطمینانی تھی۔ ان میں مقتدی سے زیادہ امام پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ نماز کے اتنے قائل نہیں رہے تھے جتنے جانماز کے۔ وہ بیماری کو علاج صبر و پرہیز سے دور کرنے کے بجائے بیماری کو پروپیگنڈا بنانا زیادہ مفید سمجھنے لگے تھے۔ وہ جنگ کے لیے کیل کانٹے سے تیار ہونے کے بجائے دشمن کو اکسانے پر زیادہ مائل تھے۔ میں جب دنیا سے گزر رہا ہوں تو میرے ذہن میں یہ اندیشہ بھی جاگزیں تھا کہ مسلمان دشمن کو شاید ہزیمت دے دیں لیکن مال غنیمت سے ہزیمت یقیناً کھا جائیں گے۔

میرے زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے سخت بیزار تھے۔ دونوں اس کے درپے تھے کہ کس طرح اور کتنے عناصر ایسے دریافت کیے جا سکتے تھے جو دونوں کو ایک دوسرے سے بیزار رکھنے میں معین ہو سکتے تھے۔ یہ فکر کسی کو نہ تھی کہ ایسی باتیں بھی دریافت کرنی چاہئیں جن پر تھوڑا بہت ہی اتفاق ہو سکتا ہو۔ ہندو مسلمان دونوں اپنے اپنے قومی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دینے میں بدحواس تھے۔ وہ اپنے سے اور ایک دوسرے سے اس درجہ بدگمان تھے کہ وہ قومی مفاد اور ملکی مفاد کو امتزاج نہ دے سکتے تھے اور نہ امتزاج دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہ کر سکتے تھے تو اچھے ہمسایہ کس طرح بن سکیں گے۔ ناخداؤں میں جنگ چھڑ چکی تھی مسافر سراسیمہ تھے اور طوفان کا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ وہ تعطل دور نہ کر سکتے تھے۔ تہلکہ بھی دور نہ تھا!

''خیال'' اور ''الفاظ'' میں کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اچھا خاصا دلچسپ اور دقیق مسئلہ ہے، لیکن لکھنے کے دوران میں مجھے اس کی دقت محسوس نہ ہوئی، عام طور پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ آدمی سوچتا الفاظ ہی میں ہے اور سوچنے اور بات کے متعین کر دینے میں الفاظ بڑے معاون ہوتے ہیں، لیکن اکثر میں نے ایسا بھی محسوس کیا ہے جیسے دل میں ایک بات بغیر الفاظ کے بھی آئی۔ اسے ذہنی کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ یہ کیفیت یا اثرِ معنی بے لفظ ہے۔ اس کو مختلف طور سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کو بے کم و کاست بیان کر دینا ناممکن ہے۔ جس کو ''مکمل اظہار'' کہتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ ناممکن الوقوع ہے۔ یہی سبب ہے کہ اظہار کیف و خیال میں آرٹسٹ کو بڑی کاوش کرنا پڑتی ہے۔

اسی کاوش میں جس حد تک کامیابی ہوتی ہے اسی حد تک اور اسی معیار سے آرٹسٹ کے کمال یا فن کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ خیال یا کیفیت کے اظہار کے لیے الفاظ، آواز، حرکت، رنگ وغیرہ کے سانچے بنے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ان سانچوں کا آرٹسٹ کے ہاں کیا درجہ ہوگا۔ سانچوں کا صحیح انتخاب ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے سے بڑے فن کار کے بس میں بھی پورے طور پر نہیں آتے۔ اس لیے کہ یہ سانچے یا وسائل محدود ہیں، اور واردات ذہنی لامحدود۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ اور باتوں سے قطع نظر، شاعر تشبیہ و استعارات اختراع کرتا رہتا ہے۔ الفاظ بھی تو ایک طور پر تشبیہ و استعارہ ہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن الفاظ کا درجہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ خیال یا جذبہ حسین بھی ہو سکتا ہے اور قبیح بھی لیکن شاعر ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے کہ حسین قبیح اور قبیح حسین نظر آنے لگے یا حسین حسین تر اور قبیح قبیح تر بن جائے۔ الفاظ کے استعمال میں اگر احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو دنیا کا شور و فتن بڑی حد تک اعتدال پر لایا جا سکتا ہے خیال کی آمد میں الفاظ کی آورد اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ہے۔ نئے ادب کے پیروؤں پر یہ الزام ہے کہ وہ جذبات کو بے لگام ہو جانے دیتے ہیں۔ اس الزام کو بڑی حد تک دور کیا جا سکتا ہے اگر وہ الفاظ کو بے لگام نہ ہونے دیں اس اصول پر عمل کرنے سے ''بہتوں کا بھلا ہوگا''۔ بہتوں میں بعض مولویوں اور لیڈروں کو بھی شامل کر لیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

لکھنے میں ظاہر ہے ارادہ کو بھی دخل ہوتا ہے اور میں خود بھی ارادہ کرتا تھا، لیکن دراصل میرے لکھنے میں میرے ارادہ کو اتنا نہیں جتنا کہ ایک خاص لمحہ کو دخل ہوتا تھا۔ یہ میں کبھی نہ دریافت کر سکا کہ وہ لمحہ کب اور کیسے میسر آ سکتا تھا۔ میں لکھنے میں ابتدا، ارتقا اور عروج وغیرہ قسم کی بات ملحوظ نہیں رکھتا تھا۔ مخلصانہ اور بے تکلف گفتگو میں ان امور کی پابندی نہیں کی جا سکتی اور نہ کرنا چاہیے، مجھے مضمون نگاری کے متداول آداب تسلیمات بھی نہ آتے تھے۔ میں قارئین کو اپنا اچھا اور بے تکلف دوست سمجھ کر گفتگو کرنا شروع کرتا تھا۔ اچھا اور بے تکلف دوست ہی نہیں بلکہ اچھا اور بے تکلف خاندان بھی جس میں جوان، بوڑھے، بیمار، تندرست، ملول، سرور سبھی ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس حلقہ میں ایک اچھے رفیق کی حیثیت سے پیش کرتا تھا اچھی گفتگو کسی پروگرام کے ماتحت نہیں ہوا کرتی کہ صرف یہ ہوگا اور یوں ہوگا۔

گفتگو کرنا ایک سفر کی مانند ہے جس میں مختلف مناظر، مختلف اشخاص اور مختلف حالات وحوادث سے سابقہ ہوتا ہے۔ایک اچھا آدمی ہم سفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور ان کے رنج وراحت کو اپنے رنج وراحت پر ترجیح دیتا ہے۔یہ شرافت ہی کی نہیں اچھے لکھنے والے کی بھی پہچان ہے۔لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں بھی رونا، گڑگڑانا، رعب بٹھانا اور قابلیت جتانا نااہلوں کا کام ہے۔میرے مضامین، غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق تھیں۔میں خود نہیں بہکتا تھا دوسروں کو بہکنے بہلنے کی فرصت دیتا تھا۔عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جاسکتی ہیں نہ سنائی جاسکتی ہیں۔

نئے اور پرانے کی آویزش ازل سے چلی آتی ہے، لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جب میں نے سفر آخرت کیا ہے اس وقت بوڑھوں اور نوجوانوں میں اختلافات کی جو خلیج حائل ہوگئی تھی وہ ناقابل عبور حد تک عمیق اور وسیع ہوگئی تھی، جس کی مثال شاید ہی تواریخ میں ملتی ہو۔ نوجوانوں کا یہ سمجھنا کہ وہ کبھی بوڑھے نہ ہوں گے۔سمجھ میں آنے کی بات تھی، البتہ یہ تعجب اور افسوس کی تھی کہ بوڑھے اپنی جوانی بھول چکے تھے ان کو نوجوانوں سے چڑھ ہوگئی تھی، یہ بوڑھوں کی بھول تھی۔بوڑھوں کا سابقہ دو عالم گیر جنگوں سے ہو چکا تھا، لیکن وہ ان انقلابات کے مطالبات اور مطائبات دونوں سے ناآشنا تھے۔نوجوانوں سے مجھے ہمدردی تھی۔وہ ایک جنگ کی پیداوار تھے اور دوسری جنگ کی کھپت میں تھے۔وہ زمانہ اور زندگی کی الجھنوں میں مبتلا ہوگئے تھے۔وہ جنگ سے زیادہ اہم اور سنگین حادثہ یعنی صلح کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔وہ زیادہ سے زیادہ جو بات سوچ سکتے تھے وہ یہ کہ نوجوانوں کے لیے ایک نئی دنیا بنائی جائے خواہ وہ انسانوں کے موافق آئے یا نہ آئے۔وہ اپنی نجات بغاوت میں دیکھتے تھے۔انسانیت کی معراج شہادت میں ان کو نظر نہ آتی تھی۔ممکن ہے وہ ایک نئی دنیا پیدا کرسکتے۔صحیح اور سچی قدروں کا احترام ان کے دلوں سے اٹھ چکا تھا۔اس صورت حال کے پیدا کرنے میں بوڑھوں کا یقیناً دخل تھا۔بوڑھوں نے کشتے کا سہارا پکڑا تھا۔نوجواب شراب میں غم غلط کررہے تھے۔ (علی گڑھ میگزین۔مارچ 1944ء)

●

میرے گھر کا حال

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

لیکن میری عمر تمام نہیں ہوتی۔ آج تک یاد نہیں گھر بھر میں مجھ سے (پہلے کوئی اور) سویرے اٹھا ہو اور رات میں میرے بعد سویا ہو۔ دو کوے البتہ ایسے ہیں جو میرے صحن میں ان دو درختوں پر الگ الگ آ کر بیٹھتے ہیں جو ایک دوسرے اور میری چارپائی سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر واقع ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں مجھ پر باری باری لعنت بھیجنا شروع کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ کوے کون ہیں کہاں کے ہیں اور کیوں ہیں؟

یہ یقیناً میاں بیوی نہیں ہیں میاں بیوی میں اتنا اتفاق کہاں کہ سال ہا سال سے پابندی سے یک زبان ہو کر صبح کے وقت آئیں اور مجھ پر لعنت بھیج کر چلے جائیں۔ دونوں عورتیں نہیں اس لیے کہ دو عورتیں ایک ہی شخص پر زیادہ دن تک لعنت نہیں بھیج سکتیں۔ ایک ان میں سے شادی کر لے گی اور طوق لعنت بن جائے گی۔ دونوں مرد بھی نہیں ہو سکتے اس لیے کہ مرد کو اپنی لعنتوں سے کہاں چھٹکارا کہ وہ مجھ پر لعنت بھیجنے کی تفریح میں پڑے۔

شور کر کے ان کو اڑا نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ کوے تو میرے شور سے اڑ جائیں گے، لیکن دوسرے کوے جوان سے بھی زیادہ کوے ہیں اٹھ بیٹھیں گے صحن میں ذرا فاصلے پر جہاں نوکروں کا خاندان سوتا ہے وہاں بھی ایک سے ایک اچھے درخت ہیں ان کے آس پاس ہر طرح

کے مقویات بھی چھپے ہوئے ہیں، لیکن یہ وہاں نہ جائیں گے۔ میں ان کو چھوڑ کر اپنا کمرہ کھولوں گا، دروازے پر پانچ سات مینڈک اور ہزاروں لاکھوں مچھر ہوں گے، اور میرے ساتھ کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ اب میرا کام یہ ہے کہ ان مینڈکوں کو چارپائی اور تخت کے نیچے گھس کر نکالوں اور مچھروں پر دوائی چھڑک دوں، مینڈک تو خدا جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں مچھروں کا حال یہ ہے۔ جب سے ان پر ڈاکٹروں نے کچھ نئے اتہامات لگائے ہیں انھوں نے ڈی ڈی ٹی سے مرنا چھوڑ دیا ہے کمرے میں روشنی کر کے پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہوں، جہاں انسپریشن مچھروں سے ملتا ہے اور اپدیش مینڈکوں سے اور یہ کم بخت اتنے قریب سے داد دیتے ہیں کہ چونک پڑتا ہوں کہ میں ان پر یا وہ مجھ پر تو نہیں بیٹھے ہیں۔

میں نے اپنے مکان کا مردانہ حصہ کچھ دنوں سے مقفل کر دیا ہے کھلا رہتا تھا تو چور چارپائی اٹھا لے جاتے تھے، مویشیاں باغ چر جاتی تھیں اور راستہ سے گزرنے والے نماز پڑھنے آ جاتے تھے وہ اس طرح کہ اندر سے لوٹا پانی، تولیا، جانماز منگائی اور ان سب کے ساتھ نماز باجماعت اپنے گھر جا کر پڑھی۔

زنان خانے کا دروازہ میرے سائبان سے خاصے فاصلہ پر واقع ہے۔ صبح سے رات گئے تک کھٹ کھٹ ہوتی رہے گی اور میں جا جا کر دیکھوں گا کہ کیا حادثہ ہے۔ حادثات ملاحظہ فرمایئے فلاں کا انتقال ہو گیا آپ کیا کر رہے ہیں؟ فلاں کا ڈنر ہے آپ مدعو ہیں؟ فلاں رسالہ نکلنے والا ہے ایک مضمون لکھئے اور پانچ خریدار بنایئے۔ فلاں مسجد بن رہی ہے۔ نماز پڑھنی ہوگی۔ فلاں کی بیوی بھاگ گئی ہے ذرا چوکنے رہیے گا۔ ایک بچہ گم ہو گیا ہے ذرا دیکھئے گا آپ کے بچوں میں تو نہیں مل گیا۔ میں فیل ہو گیا ہوں ممتحن نے بے ایمانی کی ہے۔ ذرا وائس چانسلر سے چل کر کہہ دیجئے اور فارن اسکالر شپ بھی تو وائس چانسلر صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے میرا ایک سال بچ جائے گا۔ زمین داری کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ یونیورسٹی پہنچا اتنے لکچر میں اتنے ٹیوٹوریل، اتنی میٹنگیں، اتنے انٹرویو، اتنی سعی سفارش، گھر واپس آیا دیکھئے فلاں صاحب سے اتنے روپے لے لیے ہیں اور ہدایت کر دی گئی ہے کہ تم سے لے لیں فلاں گاڑی سے میں بیوی بچے ایک ملازم اور دو نوکرانیوں کے ہمراہ ایک ہفتہ کے لیے آ رہا ہوں بڑا ضروری کام ہے۔ میں

اردو میں پی ایچ۔ ڈی کرنا چاہتا یا چاہتی ہوں عنوان یہ ہوگا۔ مقالہ آپ لکھ دیجئے، از خورداں خطا و بزرگاں عطا۔ ایک ادبی کانفرنس ہو رہی ہے صدارت فرمائیے ورنہ تازہ کلام سے مشرف فرمائیے۔ میرے نانا کا انتقال ہو گیا ویسا ہی ایک مضمون لکھ دیجئے جیسا کہ آپ ایسے موقعہ پر اکثر لکھا کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں سے اردو میں جن لوگوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے ان مقالات کا خلاصہ لکھ بھیجئے۔ کھانا کھانے بیٹھا نوکروں کی چوری، گندگی، نکمہ پن اور دوسروں کے اخلاق و عادات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ نوکروں سمیت سب نے اپنے اپنے زور اور ظروف کے بقدر حصہ لیا۔ کھانا ختم ہوا بات بڑھ گئی۔ کمرے میں آ کر لیٹا برآمدے میں بچوں نے فٹ بال شروع کر دیا۔ سینے کی مشین چلنے لگی اور نل پر جو میرے کمرہ کی دیوار سے لگا ہوا ہے کپڑا دھویا پچھاڑا جانے لگا۔

چار بجتے بجتے خواتین تشریف لانا شروع کریں گی۔ اب میں کمرہ میں مقید ہو گیا۔ خواتین کے ساتھ نوکرانیاں، نوکرانیوں کے بچے، تعداد کے لیے ہندسے مقرر ہیں ان کی تعداد کے لیے اب تک کوئی ہندسہ دریافت نہ ہو سکا۔ ان کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر محلے کے کتے، بلی، بکری، مرغی سب آن پہنچے۔ ان سب نے سارے پھول پودوں کو روند ڈالا۔ خواتین نے پنکھا، پانی، پان، جانماز مانگا اور بیک وقت بولنا، ہنسنا، چیخنا شروع کر دیا اور بیچ میں سوا پیک دان کے ہر جگہ پیک ڈالنی شروع کر دی۔ یہ قافلہ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلا جائے گا۔ وہاں سے کہیں اور، اور میں کلب چلا جاؤں گا۔

(منشور، حیدر آباد۔ مارچ 1956ء)

●

سرگزشت عہدگل

یونین کے پریسیڈنٹ صاحب نے دعوت دی ہے کہ اس مذاکرے میں شریک ہوں جس میں علی گڑھ کے گنہ گار علی گڑھ کے بارے میں اپنے اپنے اعترافات پیش کریں گے۔ موصوف نے مجھے اصالتاً حاضر ہونے سے معاف کر دیا ہے اور اجازت دی ہے کہ بیان تحریری داخل کروں۔ سنتا ہوں عدالت کسی شخص کو ایسا بیان دینے پر مجبور نہیں کر سکتی جس سے اس شخص کے مجرم قرار دیئے جانے کا امکان پیدا ہوتا ہو۔ یہ بات ذرا دیر میں معلوم ہوئی۔ اب سے بہت پہلے علی گڑھ اور اپنے بارے میں ایسے بیانات دیتا رہا ہوں جن سے ایک سے زیادہ جرائم میں ماخوذ ہو سکتا ہوں۔ مگر کیا کروں جناب صدر کے اصرار پر۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے بغیر!
(غالبؔ)

لیکن تنقید نگار برہم ہیں کہ میرے ''ذکر و فکر'' میں علی گڑھ اس درجہ کیوں دخیل ہے۔ یہ شکایت ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ایک عرصہ سے لاحق ہے۔ آشفتہ بیانی[1] کے شائع ہو جانے کے بعد

---

[1] آشفتہ بیانی میری: علی گڑھ میگزین شمارہ اوّل و دوم ۱۹۵۷ء میں صرف دو قسطیں شائع ہوئی تھیں۔

خیال تھا کہ زائل نہیں تو بہت کم ہو جائے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ سرگرانی اور بڑھ گئی۔ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے مدت ہوگئی۔ مخالف اور موافق دونوں طرح کی تنقیدوں سے واسطہ ہوا، کسی نے تعریف کی تو جی یقیناً خوش ہوا کسی نے تنقیص کی تو دل برداشتہ نہیں ہوا۔ یہ تعلّی نہیں اقرار صالح ہے، اس لیے کہ میری جن باتوں کو قابل گرفت قرار دیا گیا وہی تو میرا سرمایۂ افتخار وانبساط ہے۔ ان سے اپنے کو کسی حال میں باز نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً یہی کہ میری تحریروں میں علی گڑھ کا عمل دخل۔ میں ان کا سہارا لیے یا ان کا اشارہ پائے بغیر نہ اپنی شخصیت کا اظہار کر سکتا ہوں نہ اسلوب یا فن کا۔ آپ ہی بتائیں جو شخص اظہار وابلاغ کے وسائل سے محروم کر دیا جائے وہ کس کام کا رہ جائے گا تاوقتیکہ وہ شخص فن کار نہیں کسی کا آلہ کار ہو۔ تو حضرت دمڑی کی ہنڈیا اپنی خیر منانے میں تو اپنی ذات پچھنوائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تصنیف و تالیف کا شوق ہو تو اعتراض سننے اور سہنے کا خوگر ہونا چاہیے۔ مصنف اور پبلک دونوں ایک دوسرے کی امانت ہوتے ہیں، اس لیے دونوں کو ایک دوسرے پر احتساب کا بھی اختیار حاصل ہے اور ایک دوسرے کا احترام بھی لازم آتا ہے۔ اگر مصنف اس احتساب کی تاب نہیں لاسکتا تو اسے غالبؔ کے مشہور فارمولے پر عمل کرنا چاہئے، یعنی ''جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟''

میں تنقید نگار کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لیے کہ اسے شعر و ادب کا ضمیر سمجھتا ہوں، وہ ہماری رہنمائی عزت افزائی یا چشم نمائی نہ کرے تو ہم شعر و ادب کی ذمہ داری کو نہ سمجھ سکیں، نہ اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ لیکن اگر تنقید نگار اپنے آپ کو شعر و ادب کا ضمیر سمجھنے کے بجائے کچھ اور سمجھے تو وہ یقیناً ہمارے احترام و حمایت کا سزاوار نہیں ہے۔ البتہ اپنے جن تنقید نگاروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ وہ مجھ سے برہم ہیں یا علی گڑھ سے آزردہ۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ دونوں سے بیزار ہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ ہم میں سے کسی ایک سے خوش ہوتے تو دوسرے کا گناہ ضرور بخش دیتے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ:

''بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم''

اچھا اس قصہ کو چھوڑیئے آپ کو ایک حادثہ سناؤں جو اب اتنا حادثہ نہیں رہا جتنا قصہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج نان کو آپریشن تحریک کی زد میں آیا۔ موافق اور مخالف طاقتیں صف آرا

ہو گئیں۔ طالب علموں کو راہ راست پر رکھنے یا لانے کے لیے ''والدین'' کثرت سے آئے بھی اور لائے بھی گئے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے طلبا سے زیادہ والدین آ گئے۔ لیکن واقعہ صرف اتنا تھا کہ اس زمانہ میں ایسے طلبا بھی ہوتے تھے جن پر والدین کا دھوکا ہوتا تھا۔ جہاں دونوں گڈمڈ ہوئے، وہاں ظاہر ہے والدین یا والدین نما زیادہ نمایاں ہوتے کمروں میں، میدانوں میں، مسجد کے آس پاس، یونین کے نزدیک، سڑکوں پر، درختوں تلے جہاں دیکھئے مختلف ٹولیاں بحث میں مصروف ہیں۔ کہیں ''ملک الموت کو ضد ہے کہ میں دم لے کے ٹلوں'' تو کہیں ''سر بہ سجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے''۔

اسٹریچی ہال کی پشت پر ٹینس کے کچے کورٹس تھے، کھیل ہو رہا تھا کہ ایک طرف سے نان کوآپریشن کی تبلیغ کرنے والے کچھ طالب علم لیڈر آ گئے۔ کھیل بند کر دیا گیا۔ سب یک جا ہو گئے۔ کھیلنے والوں میں اسٹاف کے ایک ممبر تھے جو اپنے زمانے میں بڑے ممتاز طالب علم تھے اور کھلاڑی بھی اور نان کوآپریشن کے سخت مخالف۔ دوسری طرف تحریک کی حمایت کرنے والوں میں اس زمانے کے سب سے مشہور طالب علم تھے۔ نام کسی کا نہیں لیتا۔ فرض کر لیجئے ایک کا نام زید دوسرے کا عمر تھا۔ بحث رفتہ رفتہ تیز ہونے لگی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ زید نے کہا ''برطانیہ کی فوجیں کعبہ شریف اور ایم۔اے۔او۔ کالج پر گولے برسانے لگیں تو آپ کس کی حفاظت کریں گے۔'' عمر نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا کالج کی'' سب سناٹے میں آ گئے اور مجمع منتشر ہو گیا!

یہ قصہ اس لیے نہیں سنا رہا ہوں کہ مباحثہ کی جہاں تان ٹوٹی ہے میں یا آپ اس پر فخر کریں۔ بتانا یہ ہے کہ علی گڑھ سے مجھے جو الفت ہے اور میرے دل میں اس کا جو احترام ہے، اس میں میرے شریک اور بھی ہیں۔ ایم۔اے۔او۔ کالج کے عہد میں جہاں اور طرح کے طلبا تھے اس رنگ کے بھی تھے۔ مجھے تو یقین ہے آج بھی اس نمونے کے طلبا زیادہ نہیں تو چند ضرور موجود ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ سمجھ دار اور کم بلند بانگ ہوں۔

تو صاحبو! اگر میں ایم۔اے۔او۔ کالج کا ''جاں دادۂ ہوائے سر رہ گزار'' ہوں تو اس میں کسی محمل نشیں کے شاد یا ناشاد ہونے کی کیا بات ہے۔ غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے۔

ہر شخص اپنا محبوب اور عقیدہ منتخب کرنے میں آزاد ہے۔ میرے عہد میں تو اس کی آزادی تھی ممکن ہے آپ کے عہد میں نہ ہو اور آپ اس پر مجبور ہوں کہ دوسرے آپ کے لیے محبوب اور معتقدات متعین اور منتخب کریں۔

ان باتوں سے قطع نظر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ میرا علی گڑھ سرسید کے عہد سے بہت قریب تھا۔ آپ کا بہت دور ہے۔ آج 1958ء میں آپ جتنے امریکہ یا روس کے قریب میں ہیں" میں سرسید اور ان کے رفقاء سے قریب تھا۔ اس لیے میں یا میرے ساتھی جس طرح سرسید ان کے مشن اور ان کے تابعین اور تبع تابعین کے زیر اثر ہو سکتے تھے آپ روس یا امریکہ ان کے مشن یا ان کے تابعین اور تبع تابعین کے زیر اثر ہو سکتے ہیں۔ ما بخیر شما سلامت۔

انیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں پر جو مصیبت نازل ہوئی۔ اس سے ان کو بچا لے جانے کا شرف سرسید کے حصے میں آیا، جن سے زیادہ جامع حیثیت مسلمان اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ ہر تباہی اپنی تلافی بھی ساتھ لاتی ہے۔ اتنی بڑی تباہی اتنا ہی بڑا شخص پیدا کر سکتا تھا۔ اس عہد میں مسلمانوں کو نئی زندگی، نیا شعور اور نیا حوصلہ دینے میں علی گڑھ تحریک اور اس سے برآمد ہونے والے سب سے مبارک مستحکم اور معتبر ادارے علی گڑھ کالج (مسلم یونیورسٹی) نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ محتاج بیان اس لیے نہیں کہ آپ میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو ان سے کم و بیش واقف نہ ہو۔ سرسید نے مدرسۃ العلوم کے وسیلے سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ ہندوستان میں عزت اور فراغت کی زندگی بسر کریں۔ یہی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمان دونوں ہندوستان میں غیر مسلموں کے لیے نیز دنیا کے دوسرے خطوں کے لیے اور خود مسلمانوں کے لیے قابل قدر نمونہ بنیں۔

سرسید کے معتمد رفقاء بعض امور میں ان کے ہم نوا نہیں تھے۔ سرسید نے کہیں اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔ موجودہ عہد کے تقاضوں کی روشنی میں سرسید کے افکار و آرا کو ضرور پرکھنا چاہیے اور سرسید کا کیا ذکر آپ تو جانتے ہیں اسلام سے پہلے کے ادیان اور ان کے صحائف مقدسہ میں خود ان کے مصنف اعظم (خدا) نے حالات زمانہ کے اعتبار سے یکے بعد دیگرے ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ جن حالات و حادثات کی زد میں سرسید نے جو تدابیر اختیار کیں ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جن کو فرسٹ ایڈ سے تعبیر کرنا

زیادہ صحیح ہوگا۔ اگر ہم اس وقتی مرہم پٹی کو مستقل علاج سمجھ لیں تو یہ عقل سلیم اور سرسید دونوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ سرسید کی سیاسی، تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ انگریز اور انگریزی حکومت سے تعاون، مغربی تحریکات کی طرف توجہ، اردو یونیورسٹی کے قیام کے بجائے انگریزی پڑھنے اور ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم گاہ قائم کرنے پر زور دینا مذہب کو روزی کمانے، جہالت پھیلانے اور فتنہ اٹھانے کا وسیلہ بنانے کے بجائے فہم و بصیرت، حوصلہ مندی اور انسانیت دوستی کا محرک اور ترجمان بنانے پر زور دینا کانگریس کی پالیسی سے مسلمانوں کو دور رکھنے کی کوشش اور اس طرح کی دوسری باتیں اس عہد کے حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے مناسب اور مفید سمجھی گئیں۔

70-75 سال بعد ہم ان پر ریویو کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ البتہ اس کے مجاز نہیں کہ ان باتوں پر سرسید کو رجعت پسند ہندوستانی قومیت کا دشمن یا اردو فارسی عربی کا مخالف قرار دیں۔ بذات خود میں ہندوستان کے مسلمانوں کو عقائد اور اعمال کے اعتبار سے دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان سمجھتا ہوں۔ چنانچہ جب کبھی بلادِ اسلامیہ کے مسلمانوں کا نام لے کر مسلمانوں کو ان کی روش پر چلنے کی ترغیب دی جاتی ہے تو اس کو صحیح رہنمائی نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمان باہر کے مسلمانوں کے لیے قابل تقلید ہیں۔ نہ کہ باہر کے مسلمان یہاں کے مسلمانوں کے لیے۔ یہاں کے مسلمانوں کو یہ امتیاز علی گڑھ نے بخشا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان کے دوسرے اسلامی اداروں کا اس میں حصہ نہیں، یقیناً ہے۔ لیکن علی گڑھ نے مذہبی ادارہ نہ ہوتے ہوئے ایک معیاری تعلیم گاہ (کالج و یونیورسٹی) کی حیثیت سے جس کثرت سے اچھے مسلمان اور اچھے شہری پیدا کرنے کی جیسی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کا جواب شاید ہندوستان کی کسی دوسری تعلیم گاہ میں نہ ملے اور یہ فیضان اس علی گڑھ کا ہے جس میں غیر مسلم پوری آزادی کے ساتھ یونیورسٹی کے ان تمام فوائد سے متمتع ہوتے ہیں جن سے مسلمان ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال بھی آیا ہے کہ اچھے مسلمان مذہبی اداروں کے مقابلے بس ایسے اسلامی اداروں سے زیادہ نکلتے ہیں جہاں دنیوی علوم و امور سے بھی طلبا کو آشنا ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔

مجھے اپنے عہد کا علی گڑھ اس لیے خاص طور پر عزیز رہا ہے کہ اس زمانہ میں کالج کی ناموری تمام تر طلبا کی کارگزاریوں کی رہین منت تھی۔ اچھے سے اچھے طالب علم ہونے کے علاوہ بڑے اچھے مقرر، بڑے اچھے کھلاڑی، بڑے اچھے انشاء پرداز اور شاعر ہوتے، جرأت ذوق اور ذہانت کے مواقع تلاش کرتے کہ کوئی اچھے سے اچھا بولنے والا باہر سے آئے اور دیکھے کہ ہمارے ساتھی طالب علم اس فن میں کیسی مہارت رکھتے ہیں۔ کوئی مشہور مقرر یا لیڈر اس زمانہ میں باہر سے آنے والا ہوتا تو ہم اس پر خوش ہوتے کہ آج ہمارے فلاں بولنے والے کا جوہر چمکے گا اور مہمان کو معلوم ہوگا کہ اس کا سابقہ کیسے طالب علموں سے ہے۔ اس پر فخر نہیں کرتے تھے کہ معزز مہمان کے تشریف لانے اور گہر افشانی فرمانے سے ''کلاہِ گوشۂ دہقاں'' کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔

چنانچہ میں کچھ اس طرح پر سوچنے لگا ہوں کہ اس ادارے کی نام وری اور نیک نامی کا مدار جتنا یہاں کے طلبا کی ناموری اور نیک نامی پر ہے کسی اور پر نہیں۔ اتھارٹیز، اسٹاف، سرمایہ، ساز وسامان، کتب خانے، باغ وراغ، کاخ وکو، خورد ونوش، بود وباش، کھیل کود، تفریح وتفنن سب ہیچ ہیں۔ اگر ہمارے طلبا بطور خود اپنے آپ کو بہتر بنانے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں۔ ایسے طلبا متداول اور مقررہ علوم وفنون پر عبور رکھنے کے علاوہ اس ادارے کے بنیادی مقاصد اور بہترین روایات کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ اس لیے کہ انھوں نے ایسا کر دکھایا ہے۔ اس دانشگاہ کے طلبا کی ذمہ داریاں دوسری درسگاہوں کے طلبا کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ مختلف اور مشکل ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے طلبا باہر کی ہر تحریک اور ہر جماعت کی پیروی آنکھ بند کر کے نہ کیا کریں خواہ وہ تحریک اور جماعت طلبا ہی کی کیوں نہ ہو۔

علی گڑھ سے میرا شغف ان عزیزوں کو گراں گزرا ہے جنھوں نے خود کبھی علی گڑھ میں تعلیم نہیں پائی۔ مجھے یقین ہے اگر انھوں نے طالب علمی کے دن یہاں گزارے ہوتے تو میرے ہم نوا ہوتے۔ اتنی سے بات تو وہ بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ اپنے زمانۂ طالب علمی کی یاد ہر شخص کو خوش گوار محسوس ہوتی ہے، چاہے وہ زمانہ تکلیف اور تردد ہی کا کیوں نہ رہا ہو، پھر مجھ سے کیوں بدگمان ہوں جس نے اپنی طالب علمی کا بہترین زمانہ ایسے ادارے میں بسر کیا ہو جو ہندوستان کے

مسلمانوں کی دیرینہ علمی اور تہذیبی ورثے کا امین، ان کے حوصلوں کا مرکز اور امیدوں کا سرچشمہ رہا ہو اور ایسے ساتھیوں میں گزارا ہو جو مذہب، ملک، سوسائٹی اور علوم وفنون کی دی ہوئی طرح طرح کی نعمتوں اور برکتوں سے بہرمند تھے۔ ایسی روایات ایسی فضا ایسا ساتھ، ایسے مشغلے، ایسے شب وروزان سب کا آخر کچھ تو اثر ہوتا ہی ہے۔

مجھ سے آپ کی بیزاری بے وجہ بھی نہیں ہے۔ آپ کو وہ عہد ملا جس میں عالم گیر اختلال وانتشار راہ پا چکا ہے جہاں قدیم اقدار ومعتقدات کی شکست، ریخت کا تو امکان ہے نئے اقدار ومعتقدات کا بروئے کار آنا آسان نہیں۔

نئے اور پرانے میں اس وقت جو تصادم ہے اس کا الم ناک پہلو یہ ہے کہ ہم سائنس کی مدد سے روز بروز نوامیس فطرت پر جو قدرت حاصل کرتے جارہے ہیں، اس سے اس بھول میں پڑ گئے ہیں کہ انسانی اذہان اور وجدان پر بھی قابو پاسکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ سائنس کے زور سے دنیا کو لمحوں میں نیست ونابود تو کیا جاسکتا ہے مگر ایک فرد واحد کے ضمیر کی آزادی کسی طرح ختم نہیں کی جاسکتی اور یہی فطرت انسانی کی وہ ماورائی استعداد ہے جس پر آج تک نہ کوئی حاکم، نہ حکومت، نہ مذہب اور نہ کوئی اور قابو پاسکا ہے جس طرح سائنس نے محیر العقول کرشمے آج دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں۔ اخلاق وانسانیت نے بھی ویسے ہی کرشمے آج نہیں ہمیشہ پیش کیے ہیں۔ چنانچہ فرط جنون میں حکمرانوں نے جب کبھی سائنس کا آخری حربۂ ہلاکت استعمال کرنا چاہا، اخلاق اور انسانیت کی قوتوں نے روک دیا۔ اس لیے میرے نزدیک اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ایسے اعتقاد اور اقدار پر بھروسہ کیا جائے جن کی بنیاد منصفی اور مرحمت پر ہو۔ اس کے بغیر انسانیت کو جائے پناہ میسر نہیں آسکتی۔ خلاصہ یہ کہ میرا عہد اقدار واعتقاد کی محکمی کا تھا، موجودہ عہد اقدار اور اعتقاد کی نامحکمی کا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

جدید اردو جس کو میں نے ایک موقع پر علی گڑھ سے تعبیر کیا ہے، علی گڑھ کا عطیہ ہے۔ اردو چاہے جہاں بنی یا نمودار ہوئی ہو، اس کے اسباب کچھ ہی رہے ہوں، اس کی تنظیم، استحکام، ہمہ جہتی ترقی اور اس کو مقبول عام اور مفید انام بنانے میں علی گڑھ کا بڑا نمایاں اور بیش بہا حصہ ہے۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ اس وقت ہم میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اردو اور

علی گڑھ کی دیرینہ روایات وروابط سے واقف نہ ہو۔ جدید اردو میں ان تمام صالح، دل کش اور وقیع عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے، جن سے خود علی گڑھ عبارت ہے۔ بالفاظ دیگر جن معاشرتی، علمی اور تہذیبی کسروانکسار سے اردو وجود میں آئی انہیں قوتوں کی کارفرمائی علی گڑھ کی تشکیل میں ملتی ہے۔ اگر اردو اور علی گڑھ کا یہ رشتہ تسلیم کیا جا سکتا ہے تو علی گڑھ کے لوگوں کے اس شغف کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو علی گڑھ اور اردو دونوں سے ان کو رہا ہے۔ اردو کی حفاظت، حمایت اور ترقی علی گڑھ کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

کچھ دنوں سے یونیورسٹی کی زمین پر جا بجا بڑی عالی شان عمارتیں نمودار ہونے لگی ہیں۔ ان کی موجودگی سے یونیورسٹی کی شان وشوکت اور قدر وقیمت دونوں میں معتد بہ اضافہ ہوگا۔ آزادی سے پہلے علی گڑھ میں ایسی مرتفع، مستحکم اور بیش قیمت عمارات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن جس تاریخی وحدت اور تہذیبی منزلت کا احساس وافتخار سرسید کی بنائی ہوئی عمارتوں کو دیکھنے سے ہوتا ہے وہ دوسری عمارتوں سے نہیں ہوتا۔ جدید عمارات میں انجینئری کے فن کے معجزے نظر آتے ہیں، ان کی افادیت بھی مسلم ہے، لیکن ان میں پرانی عمارتوں کی وہ شخصیت نہیں ملتی جو تاریخی اور تہذیبی روایات واقدار کو زندہ اور تابندہ رکھتی ہے۔ شاعری ہی کی طرح عمارت میں بھی ورائے فن چیزے دگر ہست کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

میں یونیورسٹی کا شمار اعلیٰ درجہ کے کلچرل اداروں میں کرتا ہوں، بالخصوص قومی یونیورسٹیوں کا۔ اس لیے کہ اس کی عمارتوں میں اس چیز کے دیکھنے کا مشتاق رہتا ہوں جن سے اس یونیورسٹی کے کلچرل اقدار کا پتہ لگ سکے۔

بغداد، دمشق، قرطبہ، غرناطہ، دلی وغیرہ علم وفضل کے کیسے کیسے امصار ودیار انقلابات کی زد میں آئے تو شاعروں نے ان کے ماتم میں جاں گداز مرثیے لکھے۔ علی گڑھ سب کے بعد آیا ہے۔ ممکن ہے سب کے پیچھے بھی ہو۔ لیکن مدینۃ العلوم کی حیثیت سے اس کے پیش رووں کی طرح اس کی حیثیت وعظمت کا بھی اعتراف کبھی نہ کبھی ہم کو کرنا پڑے گا۔ ملک میں یونیورسٹیوں کا اضافہ بڑی تیزی سے ہو رہا ہے اور تعجب نہیں کچھ دنوں میں چپے چپے پر یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں، لیکن ان میں اور علی گڑھ میں بہت سی اصطلاحی اور سرکاری مماثلت ہونے کے باوجود

ایک بڑا اہم اور بنیادی فرق بھی ہے۔علی گڑھ کے نقش کو ایک مردِ خدا نے تمام کیا ہے اس میں رنگ ثبات و دوام ہے۔

ممکن ہے آپ ان تصورات کو آرائش سخن سے زیادہ وقعت نہ دیں اس لیے عرض کروں گا کہ آپ خود کبھی مہدی منزل سے مسجد تک کی عمارتوں پر سرسری نظر بھی ڈالیں تو محسوس کریں گے کہ کس طرح اقبالؔ کی نظم مسجد قرطبہ کے اشعار آپ کے ذہن میں اور عمارات کے خشت و سنگ اور پیچ وخم میں مرتسم ہونے لگتے ہیں۔

1947ء کے رستاخیز میں جب کبھی ادھر سے گزر ااور نظر ان عمارتوں کی خاموش صف سے گزرتی ہوئی مسجد کے گنبد و مینار پر ٹھہرتی تو دل میں مایوسی، غیرت والم کے طرح طرح کے طوفان امنڈنے لگتے ،لیکن اس بشارت کے سامنے ساکت و سربہ سجود ہو جاتے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلمان کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

صاحبو! آخر میں میرے اعترافات کا خلاصہ سن لیجئے اور مجھے بخش دیجئے وہ یہ کہ جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدہ، ارادہ، مقصد یا شخصیت کا احترام اور اس سے بے لوث شغف نہ ہوگا نہ آپ اپنے لیے کسی مصرف کے رہیں گے نہ کسی دوسرے کے لیے۔ ہر شخص اپنے محبوب سے پہچانا جاتا ہے جس پائے کا آپ کا محبوب ہوگا وہی درجہ آپ کو لوگوں کی نظر میں حاصل ہوگا۔ مجھے اپنی درس گاہ سے محبت ہے، جس نے مجھ میں اعلیٰ کو ادنیٰ سے تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور اعلیٰ کو پانے اور ادنیٰ سے بچنے کا حوصلہ دیا۔

(ادیب علی گڑھ، جنوری 1958ء)

●

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصّہ!

زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے بالعموم آخری مرحلہ، جب گذشتہ کی یاد ذہن کے بے کنار سمندر میں بغیر کسی ارادے یا خواہش کے مدوجزر کی طرح چڑھتی اترتی رہتی ہے یہ کیفیت جتنی فطری اور عام ہے اتنی ہی تکلیف دہ بھی ہے۔ ''عیش رفتہ'' اور ''یاد ماضی'' کے شکار عموماً بے وقوف اور بودے ہوتے ہیں لیکن جہاں تک علی گڑھ کا تعلق ہے:

مانمی خواہیم ننگ ونام را!

زمانے میں بدلنے کی خاصیت نہ ہوتی تو اس کو دوام نصیب نہ ہوتا اس لیے کہ حرکت زندگی ہے اور تعطل موت، زمانے کے (نقش گرحیات) یا (گاہے چنیں گاہے چناں) ہونے سے 'کل یوم ھو فی شان'' کا مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے! لیکن میں نہ متکلم نہ فلسفی اس لیے غلط یا صحیح جو کچھ سوچتا ہوں وہ صرف میرے لیے ہوتا ہے۔ اس پر دوسروں کو یقین لانے کی دعوت نہیں دیتا۔ لیکن کیا کیجئے ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ بعض لوگ بن بلائے دعوت قبول کرلیا کرتے ہیں۔

میں زمانے کی گردش پیہم کا کبھی تماشائی تھا، اب شکار ہوں جس کو ایک زبان میں (صید زبوں) بھی کہتے ہیں۔ اکثر جب اپنے سے شاکی ہونے اور دوسروں کی دخل اندازی سے نجات رہتی ہے تو علی گڑھ کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں، اس لیے کہ سوچنا اور کچھ کرنا یا نہ

کر پاتا، شاید وہ مرض ہے جس کا شکار صرف انسان ہوتا ہے۔ اپنے یا دوسروں کے بارے میں کبھی کبھی بآواز بلند سوچنے لگتا ہوں تو جو لوگ قریب ہوتے ہیں یا مجھے عزیز رکھتے ہیں وہ بھی بآواز بلند مجھ پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں۔ اس لیے اکثر غور کرنے کے دوران ہی میں اس طرح کی حرکت سے باز آجاتا ہوں، لیکن علی گڑھ کے بارے میں سوچنے کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا ہوگیا ہے کہ میرے تاثرات اتنے غلط نہیں ہوتے جن کو کوئی برداشت نہ کرسکے بشرطیکہ وہ علی گڑھ کو دوست رکھنے میں اپنے سے شرماتا نہ ہو۔

میں علی گڑھ کو اس کے تاریخی، علمی وتہذیبی کارناموں کے قوس قزح میں دیکھنے کا خوگر ہوں۔ روس یا امریکہ کے جبر و جبروت میں نہیں۔ غیر ملکی زرمبادلہ کا بدرجۂ مجبوری قائل ہوں لیکن علی گڑھ کے زرمبادلہ کا زیادہ معترف ومتلاشی رہتا ہوں۔ عام طور پر زرمبادلہ کی قدر وقیمت جس معیار سے پرکھتے ہیں اس طرح کی چیز تو علی گڑھ کے پاس نہیں ہے، لیکن یونیورسٹیاں جس طرح کے زرمبادلہ پیدا اور پیش کرتی ہیں وہ علی گڑھ نے بہت زیادہ کشادہ دلی سے پیش کیا ہے، چاہے اس سے مستفید ہونے والوں نے اس کے ساتھ وہ شریفانہ یا منصفانہ سلوک نہ کیا ہو جس کی یہ درس گاہ مستحق رہی ہے۔ سوچنے اور رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ صحیح ہو یا غلط میں طبعاً بعض امور میں علی گڑھ کو ایک علمی، تعلیمی وتہذیبی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک قدر اعلیٰ کی بھی حیثیت دیتا ہوں۔

یونیورسٹیاں المپک گیمس (Olympic Games) نہیں ہوتیں۔ جہاں ہر مقابل کوئی نہ کوئی ریکارڈ قائم کرنے یا شکست کرنے کے بحران میں مبتلا رہتا ہے۔ یونیورسٹیاں پانی کے صاف شفاف دھیمے چشمے کے مانند ہوتی ہیں۔ ان سے باہر اور ان سے دور طرح طرح کے سیلاب آتے اور زیروزبر ہوتے رہتے ہیں۔ شورہ پشتی یا عیش کوشی کو انقلاب نہیں کہتے۔ ایسا ہوتا تو انقلاب کا نام ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا۔

میرے لیے یہ بتانا مشکل ہے، گو آپ کے لیے سمجھ لینا اتنا دشوار نہیں کہ علی گڑھ کی داستان سرائی میرا پیشہ ہے۔ تفریح ہے یا عبادت ہے؟ یا یہ سب ایک ساتھ! لیکن اس کا احساس ضرور رکھتا ہوں جو دلچسپ بھی ہے اور تکلیف دہ بھی کہ میرے اس طرز عمل سے احباب فکرمند رہتے ہیں، نقاد مشتعل ہوتے ہیں اور بوڑھیاں اس کو ایک آسیب قرار دیتی ہیں۔ نوجوان خواتین

کا ذکر اس لیے نہیں کرتا کہ بطریق شہاں یا ابلہاں وہ (گاہے بہ سلامے برنجند گاہے بہ دشنامی خلعت دہند) ۔ یہ صورت حال یا ردعمل کچھ ایسا ہے کہ مجھے اپنی حرکت سے باز آجانا چاہئے ، لیکن کیا کیجئے کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو ایک طرف لکھنے والے کو دوسری طرف پڑھنے والے کو ایک دوسرے کو خدا حافظ نہیں کہنے دیتے اور وہ ہیں رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان ! ان کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا اس لیے کہ یہ وہ ہیں جن کا احسان میں تمام عمر نہ اتار سکا۔ ورنہ اس دنیا میں شاید ہی کوئی ہم عصر ہو یا کبھی رہا ہو جس کا اس طرح کا یا کسی اور قسم کا احسان یا قرض مجھ پر واجب ہو۔ ان ایڈیٹر صاحبان سے میری یاد اللہ بہت پرانی ہے ۔ انھوں نے میرے ہفوات کو اس وقت اپنے قیمتی صفحات میں جگہ دی اور عزت ومحبت سے سرفراز کیا جب میری کوئی حیثیت نہ تھی ۔ انھوں نے ایک ایسے کو ''رستم داستاں'' بنا دیا جو سیستان میں کبھی پہلوان نہ تھا۔ دنیا بدل گئی ، لیکن نہ بدلے تو یہ ایڈیٹر صاحبان ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ آسامی ڈوب چکی ہے اور اب کسی حال میں راقم السطور ان کے بے کراں اور غیر منقطع احسانات کا بدلہ اس دنیا میں نہیں دے سکتا، وہ اب بھی لکھنے کا تقاضا کرتے رہتے ہیں ۔ ممکن ہے ان کی ثابت قدمی سے آپ بھی متاثر ہوں اور میرے گناہ بخش دیں ۔

اس طرح کی گفتگو سے ناظرین برہم نہیں تو اکتا ضرور گئے ہوں گے ۔ اس کی تلافی کی یوں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے زمانہ اور ان شخصیتوں کا بھی کچھ ذکر کروں جو اب صرف افسانہ بن کر رہ گئی ہیں ۔ کل کے افسانوں ہی سے آج کے ناول برآمد ہوئے ہیں ۔ لیکن گذشتہ علی گڑھ کا خیال کرتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں ، کیسے افسانوں سے کیسے ناول ۔

ایم ۔ اے ۔ او ۔ کالج کا آخری عہد میری طالب علمی کا زمانہ تھا ۔ اس کے فوراً ہی بعد مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی ۔ طالب علمی کی داستان سے آگے بڑھ کر یونیورسٹی کے حالات و حادثات وتحقیقات کا جائزہ لینے کا نہ اب وقت رہ گیا نہ فرصت ہے نہ جی چاہتا ہے ۔ دل کی طرح علی گڑھ کی تفسیریں بھی برابر لکھی جایا کریں گی ۔ اقبال سے صدہا سال پہلے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ بھی کچھ اسی طرح کی بات کہہ گئے ہیں :

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

آج یہ مصرعہ اس موقع پر ذہن میں آیا تو طالب علمی کے عہد کی بعض تحریریں اور مواقع یاد آ گئے۔ جب پہلے پہل کالج میں داخل ہوا تھا اور یہاں کے درودیوار، لیل ونہار ''دیاران ہر دیار و امصار'' سے متاثر و مسرور ہو کر ''علی گڑھ منتھلی'' کے لیے مضامین لکھے تھے۔ اس وقت بھی یہی مصرعہ زبان پر آیا تھا۔ شاید ایک سے زائد بار۔ یوں بھی یہ مصرعہ مجھے بہت پسند ہے اس میں کتنی بصیرتیں پنہاں اور کتنی بشارتیں پیدا ہیں! حسرتؔ کا بھی ایک شعر میری اس زمانے کی تحریروں میں اکثر آتا تھا، وہ یہ ہے:

ہوئیں بدنامیاں، ناکامیاں، رسوائیاں کیا کیا

نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری!

یادوں کے مینابازار میں ان اشعار کا اس وقت یاد آنا عجیب سا محسوس ہوا۔ خوشبو کی طرح اچھے اشعار میں بھی بیتے ہوئے دنوں اور لمحوں سے آشنا کرانے کی کیسی قدرت ہوتی ہے۔

1915ء میں علی گڑھ آیا تو مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر ہارونز (Harwitz) جو کالج میں عربی کے پروفیسر تھے کچھ ہی پہلے یہاں سے جا چکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے سلسلے میں شاید ان پر حکومت کی طرف سے کچھ پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ ان کا نام ہر حلقے میں عزت و افتخار سے لیا جاتا تھا۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے پروفیسر اسٹوری (Prof. C. A. Story) ڈاکٹر ٹرٹین (Dr. A. S. Tritten) اور ڈاکٹر اوٹو اسپیز (Dr. Otto Spies) آئے۔ انھوں نے عربی کے ہندوستانی رفقائے کار سے محنت و عقیدت کے ساتھ استفادہ کیا اور اب یورپ کی بعض بلند پایہ یونیورسٹیوں اور کتب خانوں کے مایۂ ناز مستشرق مانے جاتے ہیں۔ آج کون اسے سنے یا مانے گا کہ یورپ کے یہ اکابر علم و دانش علی گڑھ ہی کے فیض یافتہ ہیں۔

مولانا عبدالحق حقی بغدادی عربی کا درس غالباً برکت علی خاں لیکچر روم میں دیا کرتے تھے۔ وہی وقت اسٹریچی ہال میں ٹول صاحب کے اکنامکس کے لیکچر کا ہوتا۔ مولانا کی کلاس میں چند ہی طلبہ ہوتے جن کی نشست مولانا کی میز سے ملی ہوتی۔ لیکن پڑھاتے اس بلند آواز سے تھے کہ وکٹوریہ گیٹ تک آواز صاف سنائی دیتی۔ ٹول صاحب پرنسپل تھے مگر انھوں نے کبھی کوئی تعرض نہ کیا۔ کلاس میں کبھی کبھی ہم کو گھبراتے دیکھ کر فرماتے:

This is part of the game take it یعنی تحمل سے کام لو جس کھیل میں ہم تم شریک ہیں اس کا ایک جزو یہ بھی ہے۔ ایک دفعہ لیکچر دیتے دیتے رک گئے، فرمایا: ''میں مولانا کے غیر معمولی طاقت ور پھیپھڑوں پر رشک کرتا ہوں'' ایک طالب علم نے کہا: ''جناب والا، ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں لیکن ہم کو اپنے ان ساتھیوں کے کان کے پردوں پر بھی کچھ کم فخر نہیں جو مولانا کی کلاس میں موجود ہوتے ہیں۔'' ساری کلاس دم بخود ہوگئی۔ لیکن ٹول صاحب نے صرف زہر خند فرمایا اور ہم لوگوں کی جان میں جان آئی اس لیے کہ ٹول صاحب کے سامنے لب کشائی، اس زمانے میں ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی تاوقتیکہ وہ مہا مسخرا، غیر معمولی ذہین طالب علم، اول درجہ کا یونین کا مقرر یا فرسٹ الیون کا کھلاڑی نہ ہوتا۔ ایسوں کا ٹول صاحب لحاظ رکھتے تھے لیکن اسی طرح جس طرح غالبؔ نے کہا ہے:

پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں!

اس زمانے میں سائنس کے سارے شعبے لٹن لائبریری کے متصل اور ایک آدھ اس سے ملحق تھے۔ ایک یورپین پروفیسر کبھی کبھی شام کو گھوڑے پر سوار سائنس یا لائبریری کا کام دیکھنے آیا کرتے۔ گھوڑے پر سوار برآمدے کے زینے سے گزر کر کمرے کے سامنے اتر پڑتے اور گھوڑا سائیس کے سپرد کر دیتے جو ساتھ ہوتا۔ ایک دن سائیس نہ تھا۔ پروفیسر صاحب عجلت میں تھے، گھوڑے کو برآمدے کے دروازے سے باندھ دیا اور جلد ہی کام سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ اب ہزار کوشش کرتے ہیں گھوڑا زینے سے نہیں اترتا۔ طلبا کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ گھوڑا زینے کے پاس آ کر رک جاتا پھر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ معلوم نہیں اس دن اس کے دل میں کیا شک یا خوف سا گیا تھا۔ ایک نے صاحب سے فرمائش کی کہ ''گھوڑے پر سوار ہو جائیے ہم لوگ نیچے سے اس کی لگام کھینچتے ہیں'' یہی کیا گیا لیکن گھوڑے نے زور لگایا تو سب لگام تھامے برآمدے میں کھنچ آئے، جس طرح رسہ کشی کے مقابلے میں جس فریق کو زک ہوتی ہے وہ برابر کھنچا گھسٹتا چلا جاتا ہے۔ اس پر پورے مجمع نے قہقہہ لگایا۔ گھوڑا بدکا تو صاحب اور زیادہ شرمندہ یا چراغ پا ہوئے۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر عرض کیا: ''اندر جا کر آپ اپنا کام دیکھیں، گھوڑے سے ہم نپٹ لیں گے''۔ موصوف نے یہی کیا۔ ایک نے کہا یوں کام نہ چلے گا۔ اس گھوڑے کے ساتھ وہی سلوک کرنا

پڑے گا جو تم نے قصے میں سنا ہوگا ایک کسان اور اس کے لڑکے کو اپنے خچر سے کرنا پڑا تھا یعنی اس کے اگلے پچھلے پاؤں باندھ دیئے جائیں اور ان میں سے ایک مضبوط ڈنڈا گزار کر ہم لوگ اسے کندھے پر اٹھالیں اور اس کے گھر پہنچا دیں"۔ دوسرے نے کہا "اور صاحب بہادر" پہلے نے جواب دیا کہ "جی چاہے گا تو وہ بھی کندھا دے لیں گے" ایک اور صاحب آگے بڑھے اور فرمایا: "صاحبو یہ کوئی معمولی گھوڑا نہیں ہے کہ آسانی سے قابو میں لایا جاسکے یہ سودا کے مشہور گھوڑے کی نسل کا ہے۔ آپ میں سے کوئی صاحب جا کر سائیس کو بلا لائیں اور اس سے کہیں کہ توبڑا لیتا آئے۔ وہ آگے سے توبڑا دکھائے گا، پیچھے ہم لوگ پٹائی کریں گے تب کہیں یہ آگے بڑھے گا۔" چنانچہ ایک صاحب دوڑے ہوئے گئے اور سائیس کو بلا لائے۔ اس نے بغیر کسی تکلف یا اہتمام کے اپنے کاندھے پر سے جھاڑن اتار کر گھوڑے کی آنکھ پر رکھ دیا اور نہایت آسانی سے اسے برآمدے کے زینے سے نیچے اتار لایا۔ صاحب لڑکوں کا شکریہ دیر تک اور بار بار ادا کرتے رہے۔ ایک شوخ طالب علم نے کہا: "جناب والا! سیکسی علم دریاؤ ہے"۔ موصوف کو اس کہاوت کا مفہوم طرح طرح سے سمجھایا گیا۔ لیکن نہ سمجھے مگر اس کے بعد پھر کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر جائے وقوع پر تشریف نہیں لائے

پروفیسر آکٹرلونی کے بارے میں کبھی کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا موڈ علی گڑھ کی برسات کی مانند کب کیا ہو جائے۔ یہی حال پروفیسر انعام اللہ خاں مرحوم کا تھا جن کا تفصیلی ذکر کہیں اور کر چکا ہوں۔ ایک صاحب مرحوم کے بڑے چہیتے طالب علم تھے۔ دعویٰ یہ تھا کہ انعام اللہ خاں صاحب ان سے کبھی برہم نہیں ہو سکتے۔ اس زمانے میں ساتھیوں میں سے کسی کا کسی قسم کا دعویٰ کرنا بد مذاقی سمجھا جاتا تھا۔ کلاس میں ایک نہایت شریر اور غیر ذمہ دار طالب علم میرا دوست تھا۔ ایک دن انعام اللہ خاں صاحب کے گھنٹے میں وہ ان چہیتے صاحب کے پہلو میں جا بیٹھا اور بہت جلد جلد جیسے کوئی وظیفہ پڑھ رہا ہو، آہستہ آہستہ لیکن تواتر کے ساتھ بڑبڑانا شروع کیا حاضر جناب، حاضر جناب، حاضر جناب، حاضر جناب۔ انعام اللہ خاں صاحب نے حاضری لیتے وقت ان چہیتے صاحب کا نام لیا تو ان کے منہ سے "پریزنٹ سر" کے بجائے "حاضر جناب" نکل گیا۔ پروفیسر صاحب آگ بگولا ہو گئے، رجسٹر بند کر دیا اور کتاب

پٹک دی، پھر جوانھوں نے جتنی عجیب اورادق انگریزی میں اس چہیتے کوصلواتیں سنائی ہیں اسے کون دہرا سکتا ہے۔ حکم دیا کہ "فوراً" کلاس سے باہر نکل جاؤ، انعام اللہ خاں کے انگریزی کے گھنٹے میں، حاضر جناب" جیسے یہ سب کافی نہ تھا، خود بھی کلاس سے باہر نکل گئے۔

یہ صاحب کلاس سے باہر نکلے تو وہ حضرت بھی جو اس فتنے کے مصنف تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سامنے سڑک پر ساری کلاس جمع ہوگئی تھی۔ ذیل کا مکالمہ سنیے:

پہلا: (جو اس ڈرامے کا بانی تھا) دوست خفا نہ ہو، معاف کردو، انعام اللہ خاں صاحب کی بات پر نہ جاؤ، ان کو کون نہیں جانتا اور سب سے زیادہ تو وہ خود تم کو جانتے ہیں دیکھا نہیں تمہارے ساتھ خود بھی کلاس سے نکل گئے۔ پھر ہماری غیرت نے بھی گوارا نہ کیا کہ کلاس میں بیٹھے رہتے۔ تمھارے اعزاز میں ہم سب نے کلاس چھوڑ دی۔

دوسرا: (جو انعام اللہ خاں صاحب کا موردِ عتاب ہوا تھا غضب ناک ہوکر) تم بدمعاش ہو، سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ تمہارا خون پی جاؤں گا۔

پہلا: مسلمان کا خون حرام ہے (سگریٹ نکالتے ہوئے) لو یہ پی لو اور غصہ تھوک دو۔

تیسرا: شارع عام پر تھوکنا منع ہے۔ خاص طور پر جب کہ اس میں خون کی بھی آمیزش ہو۔

چوتھے نے لقمہ دیا:...... کا خون ضرور پیا جائے گا تم ہی نہیں ہم سب پئیں گے۔

پانچواں: اچھا اب جھگڑا ختم کردو ورنہ انعام اللہ خاں صاحب کے یہاں چلو وہ فیصلہ کریں گے۔ ایک طرف سے آواز آئی، لیکن اس کا تو اطمینان کرلو کہ کہیں موصوف خود ان دونوں کا خون پینے پر اصرار نہ کرنے لگیں۔ اس پر ایک قہقہہ لگا اور سب ایک دوسرے سے ہنسنے بولنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

آکٹرلونی صاحب ہماری سائنڈ کے ٹیوٹر تھے۔ ٹیوٹر کو اس زمانے میں کم و بیش وہی اختیارات حاصل تھے جو آج پروسٹوں کو ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ اس عہد کے بورڈنگ ہاؤس کے معاملات میں طلبا شاذ و نادر اپنے ٹیوٹر کا سامنا کرتے بہت کچھ رفت و گزشت تو سائنڈ کے مانیٹر ہی کردیتے۔ کبھی کبھی ان سے آگے بڑھ کر اسسٹنٹ ٹیوٹر تک پیشی کی نوبت آجاتی۔ ٹیوٹر کا سامنا ہونا بورڈنگ ہاؤس کی رہن سہن میں ایک سانحہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا

ایک سبب تو سائڈ کی رائے عامہ ہوتی جس سے سرتابی محال تھی۔ دوسرے ٹیوٹر کا بالعموم یورپین ہونا تھا۔ تیسرے یہ کہ آج کل کی طرح طلبا کو خارجی مذموم اثرات اور سیاسی لیڈروں کی تائید حاصل نہ تھی۔

میں، الیاس برنی صاحب، غلام محمد صاحب اور زاہد حسین صاحب (مرحومین) کا بی۔اے۔ اکنامکس میں شاگرد رہ چکا ہوں۔ الیاس برنی صاحب اپنے فن کے علاوہ جس میں اکنامکس کی سب سے پہلی مستند و عالمانہ تصنیف اردو زبان میں چھوڑی [1] ہے، شعر و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اردو نظموں کے ایسے اعلیٰ پایہ کے جامع انتخابات اس زمانے میں شائع کیے تھے جب نظم کو اتنی مقبولیت حاصل نہ تھی۔ اتنے دنوں بعد آج جب اردو کی طرح طرح کی نظموں کا چلن اتنا بڑھ گیا ہے کوئی انتخاب نظر سے ایسا نہیں گزرا جیسا کہ الیاس برنی صاحب نے مرتب کیا تھا۔ ٹول صاحب کے عزیز شاگرد تھے۔ ٹول صاحب شاید ہی کسی اور کو گفتگو کرنے کا اتنا زیادہ اور بار بار وقت دیتے ہوں جتنا الیاس برنی صاحب کو، یہاں سے عثمانیہ یونیورسٹی چلے گئے جہاں بالآخر اکنامکس کی پروفیسری پر فائز ہوئے۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ وہاں اور بڑھ گیا تھا۔ آخر میں طبیعت کا رجحان تصوف کی طرف زیادہ ہو گیا تھا اور مذہب میں بھی زیادہ متقشف ہو گئے تھے۔ خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی ناک نقشہ سبک، چھریرا بدن، بات جلدی جلدی کرتے، جس طالب علم سے ملتے وہ ایسا محسوس کرتا جیسے الیاس صاحب اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگریزی روانی سے بولتے تھے اور اچھی بولتے لیکن جہاں تک ممکن ہوتا اردو سے کام نکالتے۔ شستہ و شیریں اردو ہوتی کہیں جا رہے ہوں، کسی حال میں ہوں جو طالب علم چاہتا روک کر حرف مطلب زبان پر لاتا بغیر کسی تامل یا عذر کے کھڑے ہو جاتے اور طالب علم کو اچھی طرح مطمئن کر لیتے تب آگے بڑھتے۔ بڑے قاعدے کے آدمی سمجھے جاتے تھے اور طالب علم ان کو پروفیسر سے زیادہ بڑے بھائی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جہاں تک کالج کی زندگی اور طلبا کی اعانت و حمایت کا تعلق تھا کچھ حدود مقرر کر لیے تھے جن سے نہ خود آگے بڑھتے تھے، نہ طلبا کو بڑھنے دیتے۔

زاہد حسین صاحب میری طالب علمی کے زمانہ سے قبل فارغ التحصیل ہو چکے تھے، غلام

---

[1] اصول معاشیات، مطبوعہ 1922ء دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

محمد صاحب کے ہم عصر اور ان کے بڑے معتبر رفیق تھے۔ اس زمانے میں کچھ مریض نحیف اور متفکر سے رہتے تھے۔ ان کو مسکراتے یا مذاق کرتے ہوئے ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا۔ کلاس میں بھی پژمردہ اور کھوئے کھوئے سے رہتے لیکن اپنے فن میں طاق تھے۔ کتنا ہی مشکل مسئلہ کیوں نہ پوچھیے بڑے اعتماد سے فی الفور چند جملوں میں واضح کر دیتے۔ یہ بھی بتا دیتے کہ موضوع سے دلچسپی ہے تو فلاں فلاں کتاب پڑھو جو لائبریری کے فلاں فلاں شلف پر مل جائے گی۔ فنانس کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے اور اس زمانے میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ غلام محمد صاحب ان سے دو ایک سال قبل یہ امتحان پاس کر چکے تھے۔ چنانچہ زاہد صاحب نے حکومت کی نوکری کر لی،، وہیں سے کچھ دنوں کے لیے حیدر آباد دکن کی مالیات کی دیکھ بھال کے لیے مدعو کر لیے گئے تھے۔ تقسیم ملک سے کچھ پہلے یہاں کے وائس چانسلر ہو کر آ گئے تھے۔

علی گڑھ سے جانے کے بعد رفتہ رفتہ طبیعت میں روانی و شگفتگی آ گئی تھی، مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ ان کی شفقت و وضع داری کے واقعات سنانے میں وقت صرف ہو گا اور غلط فہمی پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے، لیکن دو ایک کا ضمناً تذکرہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ علی گڑھ میں ان کی وائس چانسلری کا زمانہ بہت مختصر تھا۔ تمام ملک میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی اکثر بڑے غم ناک انداز سے کہہ جاتے: Bad days are ahead (برے دن آنے والے ہیں) اور کیسے کیسے بُرے دن دیکھنے میں نہیں آئے۔

ایک بار ایک معمولی سا واقعہ طول کھینچ گیا۔ خواہ مخواہ گتھی پڑ گئی۔ جس میں ایک فریق کی حیثیت میری تھی۔ معاملے نے طوالت اختیار کی اور وائس چانسلر صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ خیال تھا کہ تحقیقات کی جائے گی۔ فریقین کے بیانات لیے جائیں گے۔ ممکن ہے اس کے بعد مصالحت کا مرحلہ آئے اور معلوم نہیں یہ قضیہ کب طے ہو۔ ایک دن دفعتہً وائس چانسلر صاحب کے دفتر سے ایک مراسلہ موصول ہوا جس میں مقدمے کا فیصلہ دس بارہ سطروں میں درج تھا اور میرے حق میں تھا۔ مسئلے کے ہر پہلو اور فریقین کے دلائل پر نظر رکھتے ہوئے جس قابلیت سے جتنی اچھی اور قانونی انگریزی میں فیصلہ لکھا گیا تھا اس کو جس نے پڑھا عش عش کرنے لگا۔ ایک دن اسٹریچی ہال کے قریب سامنا ہو گیا۔ بولے "میرا فیصلہ پہنچ گیا، مطمئن ہو؟" میں نے عرض کیا:

''جی ہاں فیصلہ موصول ہو گیا، مطمئن ہوں، شکریہ ادا کرنے البتہ اب تک حاضر نہ ہو سکا۔''
فرمایا: ''شکریے اور حاضری کے اس سے بہتر مواقع کے ہم دونوں منتظر رہیں گے۔ البتہ اتنی بات یاد رکھو کہ آئندہ کبھی Fundamentals (اساسی اصول) میں مصالحت یا مفاہمت (Compromise) کرنے پر آمادہ نہ ہونا، معمولی باتوں میں مصالحت کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تمہاری غلطی یہ تھی کہ تم نے Fundamentals میں مصالحت کو دخل دیا۔ آگے چل کر اس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسا آدمی ہمیشہ خوف و خفت کا شکار رہتا ہے۔''

آفس کے جن لوگوں نے زاہد صاحب کے ساتھ کام کیا ہے وہ سب اس پر متفق ہیں کہ زاہد صاحب ایسا شارٹ ہینڈ میں ڈکٹیشن (Dictation) دینے والا مشکل سے ملے گا۔ بڑی ستھری انگریزی اور لہجے میں بغیر کہیں رکے، بولتے چلے جاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے شارٹ ہینڈ والوں کی مشکلات کا پورا علم ہو۔ کبھی رک کر یہ نہ پوچھتے کہ کہاں تک کیا بول چکے ہیں۔ اس کی بعد ٹائپ کیا ہوا مسودہ پیش ہوتا تو وہ اتنا مرتب اور واضح ہوتا کہ علامات وقوف تک ادھر ادھر نہ کرتے اور دستخط کر دیتے۔

پاکستان میں فنانس (مالیات) کے سب کچھ تھے۔ جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے مجھے دیکھنے ضرور آتے، بغیر کسی تکلف کے یا پہلے سے بتا کر۔ درس گاہ کے شیدائی تھے۔ گھوم پھر کر علی گڑھ ہی کا ذکر چھیڑتے اور یہاں کی زندگی کے ہر پہلو پر بڑی دلچسپی سے گفتگو کرتے ایسا محسوس نہ ہوتا کہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں۔ میں ڈیوٹی سوسائٹی کا کیپر تھا۔ ایک دفعہ دوران گفتگو میں نے عرض کر دیا ''آج کل سوسائٹی کی مالی حالت بڑی سقیم ہے، ملک کے اندر ہماری آمدنی کے سارے ذرائع و وسائل بند ہو گئے، پاکستان میں آپ کا منصب اور شخصی پوزیشن ایسی ہے کہ آپ کے التفات سے ہمارا کام بن جائے گا۔ اور کتنے نوجوان ہونہار لیکن غیر مستطیع طالب علم آپ کے کرم کے شکر گزار ہوں گے۔'' مسکرائے فرمایا: ''کیا میں ان باتوں سے واقف نہیں ہوں؟ جتنا روپیہ کہو پاکستان سے 24 گھنٹے کے اندر بھجوا دوں، شرط صرف

اتنی ہے کہ تمہاری گورنمنٹ تم سے اور پاکستان سے مشتبہ نہ ہو اور ہمارا عطیہ قبول کر کے تمہارے حوالے کردے۔" میں نے کہا: "یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ آپ کا فرمانا صحیح ہے۔ پھر کجا میں کجا حکومت ہند میری تو نہ کہیں پرسش ہے نہ پہنچ" فرمایا: "وہیں کیوں نہ آجاؤ اور ایک آل پاکستان انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی) قائم کردو۔ مستحقوں کو دینے کی ذمہ داری تمہاری، روپے فراہم کرنے کی میری" عرض کیا: "یہ تو میرے لیے پہلی شرط سے بھی زیادہ ناممکن العمل ہے۔" بات رفت گزشت ہوگئی۔ ایک دن اچانک رحلت کی خبر آئی تو مرحوم کی کیسی کیسی خوبیاں یاد آئیں۔ کتنی بے سروپا و بے سود یہ آرزو ہے کہ کاش مرحوم زندہ ہوتے کہ یہ خوبیاں اس طرح یاد نہ آتیں۔

غلام محمد صاحب کی کلاس میں بڑی زندہ دلی کی فضا رہتی تھی خاص طور پر جب ٹیوٹوریل کا گروپ ان کے سامنے ہوتا۔ ہر شخص کو ہمہ وقت و ہمہ تن حاضر دماغ و حاضر جواب رہنے کی ضرورت بھی رہتی اور حوصلہ بھی ہوتا۔ دفعتہً وہ کوئی ایسا چبھتا ہوا علمی تفریحی یا تفریحی علمی فقرہ کہہ دیتے کہ مشکل سے جواب بن پڑتا اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں کے طلبا موجودہ سطح کے طلبا سے بلند ہوتے تھے اور موقع ومتانت کا لحاظ رکھتے ہوئے حاضر جوابی میں طاق تھے۔ اچھی انگریزی لکھنے اور بے تکلف بولنے میں شہرت تھی۔ یونین میں شاید کبھی تقریر کی ہو، لیکن جہاں تک انگریزی اور اردو زبانوں کا تعلق ہے دونوں پر عبور تھا۔ مزاج رنگین اور طبیعت شوخ پائی تھی۔ چہرہ اور آنکھوں سے ہمہ وقت مسکراتے ہوئے معلوم ہوتے رنگت صاف، نقشہ باریک، قد لمبا، جسم متناسب، خوش رو، تندرست، قوی ہیکل، صاف گو اور دلیر تھے۔ بڑے سے بڑا فیصلہ جلد کرتے اور اس پر قائم رہتے۔ اس نام کے دوسرے لوگوں سے امتیاز دینے کے لیے طلبا میں عام طور پر غلام محمد، گاما کہلاتے طبیعت کی ان صلاحیتوں میں سے بعض نے آگے چل کر عجیب عجیب گل کھلائے۔ کالج چھوڑنے کے بعد جہاں اور جس منصب پر رہے کسی نہ کسی بہانے ضرور یاد کر لیتے۔ ہندوستان اور پاکستان میں بڑے سے بڑے مناصب پر فائز ہونے کے باوجود ملتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اپنے منصب کو انھوں نے اتنی دیر کے لیے کہیں اور رکھ دیا ہو۔ لیکن باوجود اس کے کہ یہاں اس ذکر کا موقع نہیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس طرح کی

وضع داری کا پاس رکھنے میں راقم السطور نے اپنے مخدوم و مکرم نواب صاحب چھتاری[1] بالقابہ (موجودہ پرو چانسلر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا ثانی نہیں دیکھا۔ 1915ء سے آج تک موصوف عزت و عروج کی کیسی بلندیوں تک پہنچے مگر اس لطف و مرحمت میں شمہ برابر فرق نہ آنے دیا جو پہلے دن میرے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ غلام محمد صاحب کو آخر میں فالج اور دوسرے عوارض نے تقریباً از کار رفتہ کر دیا تھا۔ ہاتھ پاؤں زبان سبھی ماؤف ہو گئے تھے لیکن ان کی آنکھوں کی ذہین، حسین اور نفوذ کر جانے والی چمک جوں کی توں تھی۔ طبیعت کی شوخی و شرارت میں مطلق فرق نہ آیا تھا۔ خدا جانے کس آب و گل سے ان کے جسم و جاں کی تعمیر ہوئی تھی کہ اس ناقابل علاج اور ناقابل برداشت معذوری میں بھی ان کا عزم جوان تھا اور طبیعت خورسند۔

آخری بار گورنر جنرل کی حیثیت سے شاید ہندوستان اور پاکستان میں صلح صفائی کرانے کے ارادے سے آئے تھے۔ ایک دن علی گڑھ کے حکام میں سے کسی کا اطلاع نامہ موصول ہوا کہ گورنر جنرل پاکستان تم سے فلاں تاریخ کو دہلی میں ملنا چاہتے ہیں۔ طبیعت اچھی نہ تھی، عذر کرنا بھی اچھا نہ معلوم ہوا۔ گرتا پڑتا پہنچا۔ نہ یہ معلوم کہ اس ملاقات کے آداب کیا ہیں، کس سے کس وقت کہاں ملنا چاہئے۔ دہلی پہنچ کر بیگم قدسیہ[2] زیدی مرحومہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی دشواریاں بتائیں۔ مرحومہ نے ادھر اُدھر دیر تک ٹیلی فون کر کے بتایا کہ یا تو فوراً گورنمنٹ ہاؤس چلے جاؤ یا شام کو جامعہ ملیہ میں ملنے کی کوشش کرو۔ عجب بے سروسامانی میں جامعہ نگر پہنچا، نہ لباس کا اہتمام، نہ کھانے کا انتظام، نہ کہیں آرام کا ٹھکانہ، طبیعت نڈھال جامعہ میں گورنر جنرل کے شایان شان اہتمام تھا۔ حکومت ہند کی طرف سے ہدایت نافذ کی گئی تھی کہ ناسازی طبع کے باعث گورنر جنرل موٹر سے اترنے کی زحمت نہ فرمائیں گے۔ سب لوگ صف بستہ رہیں اور باری باری حاضر خدمت ہو جائیں۔ بڑی لمبی قطار تھی۔ ایک طرف میں بھی کھڑا ہو گیا۔

---

1. نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری باغ پت (میرٹھ) میں 11/جنوری 1889ء میں پیدا ہوئے اور 6/جنوری 1982ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ آبائی قبرستان سدھ پور (چھتاری) میں مدفون ہیں۔

2. کرنل سید بشیر حسین زیدی، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بیگم، تاریخ پیدائش 23/دسمبر 1914ء لاہور، وفات 27/دسمبر 1960ء

موٹر گزری تو معلوم نہیں کیسے دیکھ لیا۔ وہیں گاڑی رکوادی۔ مرحوم نے تو اشارے سے اپنی خاص مسکراہٹ کے ساتھ بلایا، دوسروں نے فرط عقیدت (معلوم نہیں مجھ سے یا گورنر جنرل سے) اور تعمیل حکم میں مسلسل دھکا دیتے ہوئے جلد سے جلد موٹر کے پاس پہنچا دیا۔ موصوف نے اندر بلا لیا۔ دیکھ کر دل بھر آیا، ہاتھ پاؤں جواب دے چکے تھے۔ زبان سے الفاظ صاف ادا نہیں ہوتے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ بھی اٹکل سے ایک آدھ فقرہ سمجھ میں آتا، ورنہ اتنا بھی نہیں۔ نحیف و نزار لیکن چہرے پر وہی طبعی اور تازہ مسکراہٹ اور طبیعت میں وہی شوخی جیسے طالب علمی کے زمانے میں تھی۔ میں نے سلام کیا، ہنسنے کی حد تک مسکرائے اور ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیا۔ پذیرائی میں کچھ فقرے خالص ہندی کے کہے جو یوں بھی میری سمجھ میں نہ آتے چہ جائیکہ ان کی زبان سے صاف ادا بھی نہ ہو سکے دل کی کیفیت عجیب ہوگئی، بے اختیار ان کے شانے پر ہاتھ رکھ دیے اور بولا: ''پروفیسر صاحب (میں نے ان کو ہمیشہ یہی کہا) اب تک وہی ٹیوٹوریل والا انداز؟'' زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ ان کے چہرے پر جیسے بدلی چھا گئی ہو اور آنکھیں دھندلا گئی ہوں میں جلدی سے دوسری طرف موٹر سے اتر پڑا اور علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگیا۔

رہا یہ کہ پاکستان میں اور پاکستان کے لیے انھوں نے کیا کیا کیا اور وہاں کے شہریوں کی نظر میں کیسے رہے، مجھے یہاں اس سے سروکار نہیں۔ دنیا میں ہر روز ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ بدترین شخص کسی کا بہترین دوست ہے اور بہترین انسان کسی کی نظر میں بدترین شخص لیکن یہاں کسی کی جواب دہی مقصود نہیں ہے۔ ایک عجیب حقیقت یا ستم ظریفی کی طرف توجہ دلانا ہے۔ مجھے تو اس وقت مرحوم اسی طرح یاد آتے ہیں جس طرح عرض کیا ہے۔

انٹرمیڈیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے۔ جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مرادآبادی تھے۔ موصوف علی گڑھ منتھلی (اردو سیکشن) کے ایڈیٹر اور نگراں بھی رہے تھے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آ گیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ کبھی مایوس و ملول نہیں دیکھے گئے، نہ کسی دوسرے کو اپنی بذلہ سنجی سے محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ اساتذہ اور طلبا دونوں میں یکساں عزت و محبت کی نظر سے دیکھے جاتے۔ قاضی صاحب کے بغیر ہر

تقریب سونی اور بے مزہ معلوم ہوتی۔ خوب سوجھتی تھی۔ تفریحی والوداعی نوع کی نظم لکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ بعض شاعروں اور شاعری کی ایسی نقل کرتے کہ حاضرین کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا:

نکلی غلاف نور سے تفسیر جوہری

یا آ کے دست بوس سلیماں ہوئی پری

کو اس اہتمام سے پڑھتے اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز میں جس طرح مختلف اعضا و جوارح سے کام لے کر سناتے بتاتے یا دکھاتے، وہ سماں اب تک نہیں بھولا ہے۔ اس ایک شعر کا پڑھنا یا دکھانا وہ کم سے کم پندرہ منٹ میں ختم کرتے اور پڑھنے والے، سننے والے اور داد دینے والے کے مختلف پارٹ جس ڈرامائی انداز سے ادا کرتے۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ بالخصوص دوسرے مصرعے میں پری کا پورے چم وخم کے ساتھ آ کر حضرت سلیمان کے ہاتھ کو چومنا تو دیکھنے کی چیز ہوتی۔ موصوف کو جتنے چٹکلے، لطیفے اور کہاوتیں یاد تھیں شاید ہی کسی اور کو ہوں جن کو وہ ایسے انداز سے ایسے موقع پر سناتے کہ کوئی کیسا ہی افسردہ ہوتا باغ باغ ہو جاتا۔ دعوت کے موقعوں پر بہت جلد اور بڑے مزے کی نظم فی الفور لکھ ڈالتے جس میں میزبان اور مہمان دونوں کی چٹکی لیتے اور کھانوں پر بڑے لطف کے فقرے ہوتے۔

جغرافیہ پڑھانے میں ملکوں، شہروں، دریاؤں، پہاڑوں اور جھیلوں کے ٹیڑھے میڑھے طویل الذیل ناموں کو ایسے دلچسپ فقروں، مصرعوں اور مکالموں میں تصنیف کر کے کھپا دیتے کہ ان ناموں کو بھولنا ناممکن ہو جاتا۔ تمام ملکوں کے نقشوں کو بھی اس طرح قابو میں لا چکے تھے مقررہ کشش اور شوشوں کو گھٹا بڑھا کر اس طرح لکھتے کہ مخصوص نام یا فقرے سے مخصوص نقشہ تیار ہو جاتا۔ مثلاً ''بابر بڑا شریر لڑکا ہے۔'' اس کو اس طرح کھینچ تان کر لکھتے یا اس کا طغرہ بناتے کہ ہندوستان کا خاکہ بن جاتا۔ نقشہ کھینچنے میں ایسا باکمال مشکل ہی سے کہیں نظر آئے گا، آنکھ پر پٹی کیوں نہ باندھ دی جائے جس ملک، دریا یا پہاڑی سلسلے کا نام لے دیجئے اس کا نہایت صحیح خاکہ بے تکلف اور بہت جلد صفحۂ کاغذ یا تختۂ سیاہ پر کھینچ دیتے۔

ہندوستان کے نقشے کا ایک طویل وعریض ریلیف ماڈل زمین پر مسٹر ریس، ہیڈ ماسٹر کے نام پر قاضی صاحب نے بڑی محنت اور ہر ناپ تول کو مدنظر رکھ کر اپنے ہاتھ سے تعمیر کیا تھا۔

جس میں ایک طرف پانی بھر دیا جاتا تو ہندوستان کے سارے دریا رواں دواں نظر آنے لگتے۔ اس زمانے میں اس ''ریس ماڈل'' (Rees Model) کی بڑی شہرت تھی اور جو لوگ علی گڑھ آتے وہ اس کو بھی ضرور دیکھنے جاتے۔ بالآخر بے توجہی کا شکار ہو کر یہ ماڈل گرد اور مٹی میں مدفون ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ضروری مرمت و تزئین کے بعد اب اس کو پھر منظر عام پر لایا گیا ہے۔

قاضی صاحب نے اسٹریچی ہال کی اندرونی لکڑی کی چھت پر ثوابت و سیارگان فلک کا نقشہ بنانے کی ایک مبسوط اسکیم بنائی تھی۔ ہم سب نے اسے بہت پسند کیا تھا اور بلاشبہ اس سے اسٹریچی ہال کی سپاٹ چھت بہت خوبصورت ہو جاتی۔ فرماتے تھے: ''بس پاڑھ باندھنے اور پینٹ وغیرہ خریدنے پر جو کچھ صرف ہوگا اس کا کسی طرح انتظام کر دیا جائے باقی سارا کام میں خود بغیر کسی معاوضے کے اپنے شوق اور محنت سے کروں گا۔ مجھے حق المحنت یا انعام وغیرہ درکار نہیں۔ بس جی چاہتا ہے کہ یہ کام ہو جائے۔'' یہ اس زمانے کی بات ہے جب بجلی کے پنکھوں کا انتظام نہیں تھا۔ پوری چھت ایک لق و دق ٹیالا میدان معلوم ہوتی تھی۔ بالآخر ایک دن جی کڑا کر کے ٹول صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ اپنی اسکیم دکھائی اور تفصیلات سنائیں۔ حسب معمول ٹول صاحب نہایت خاموشی کے ساتھ یہ داستان سنتے رہے۔ اس کے بعد اسی زہر خند سے جو ان کا معمول تھا بس اتنا فرمایا: ''خیال برا نہیں ہے۔'' (Not a bad idea) قاضی صاحب چلے آئے اور اسکیم جہاں کی تہاں رہ گئی البتہ ٹول صاحب کا یہ فرمودہ مدتوں ہم لوگوں کی زبان پر رہا یعنی جب کچھ کرنا نہ چاہتے تو کہہ دیتے: Not a bad idea۔

شاید اسی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا طفلانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا تھا۔ الفاظ کے الٹ پھیر اور ان سے حسب خواہش مفہوم اخذ کرنے کے ایسے ایسے اصول گھڑے یا پرانے اصولوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے اور بعض سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اس مہم میں یہ خاکسار قاضی صاحب کا دست راست تھا۔ جہاں کہیں بعض الفاظ کے لیے اصول گھڑنے یا معنی پہنانے میں دقت ہوتی اور وہ الفاظ کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مشورہ فرماتے اور میں توجیہ و تلبیس کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا عطائی بھی امراض یا

عقائد کی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے الفاظ کے لیے ایک نیا کھاتہ کھول دیا گیا تھا جس کا نام ''گھپلا کھاتا'' تھا۔ میرا معروضہ یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کے نام رکھنے کا مرحلہ آئے گا، اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دریافت نہ ہوسکا تو لغت ہی کا نام ''گھپلا کوش'' یا ''کذھب کوش'' رکھ دیا جائے گا۔ ہندی میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں، فارسی میں بھی آیا ہے ''درعمل کوش ہر چہ خواہی پوش'' اور اس ''کوہ کندن'' میں کوش و کوشیدن کا حال کوئی ہم سے یا ہمارے قدر شناسوں سے پوچھے۔ چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دیے جاتے جو کندن سے اتنا تعلق نہ رکھتے تھے جتنا ''کاہ برآوردن'' سے اور جن کی تعبیر و توجیہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشائش کی امید باقی رہ جاتی۔ یہ توقع ضرور تھی اور کچھ ایسی بے سروپا بھی نہ تھی کہ امتداد زمانہ اور علم اللسان میں انقلاب آجانے سے یہ ناہمواریاں ہموار ہو جائیں گی۔

قاضی صاحب کا ''ہوش افگن'' بہ ترکیب شیر افگن یا مست پچھاڑ بہ مفہوم دھوبی پچھاڑ انکشاف یہ تھا کہ انگریزی الفاظ کی بیش تر تعداد اردو سے سرقہ کی گئی ہے، ان تمام زبانوں سے بھی جن سے اردو کا لگاؤ ہے اور جن سے قاضی صاحب اور میں واقف تھے۔ فرماتے تھے کہ انگریز پہلے پہل ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ نیم متمدن تھے اور انگریزی ایک کم مایہ زبان تھی۔ چنانچہ انگریز ہمارے جو الفاظ سنتے ان کو کسی نہ کسی طرح انگریزی تلفظ میں ڈھال کر اپنا لیتے۔ جیسے آج کل تاریخیں اور تہذیبیں حسب دل خواہ سانچوں میں ڈھال لی جایا کرتی ہیں، جن لوگوں کا سابقہ قاضی صاحب سے رہا ہے وہ مرحوم کی طرفہ طرازیوں سے بھی آشنا ہوں گے ان کی اس ڈکشنری سے مثالیں پیش کرنا طوالت و تضیع اوقات کا موجب ہوگا۔ یوں بھی اس کے بہت سے الفاظ زبان زد ہیں۔ بہ ایں ہمہ آپ کے تحمل و درگزر کے غیر معمولی ذخیرے پر بھروسا کرتے ہوئے دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں مثلاً ٹریژرر یا خازن کی تاویل اس طرح کی گئی تھی کہ یہ عہدہ دار عموماً لوگوں کی تنخواہوں اور بلوں میں کاٹ چھانٹ کر دیا کرتے ہیں اس لیے:

''ٹریژرر کا ہے عہدہ ترے ضرر کے لیے!

پراکٹر چونکہ ڈسپلن کے معاملے میں رو رعایت نہیں کرتا اس لیے یہ لفظ ماخوذ ہے بڑا کٹر سے۔ ڈپٹی وہ جو ڈپٹتا رہتا ہے، سپرنٹنڈنٹ، سوپر ڈانٹ رکھنے والا۔ قاضی صاحب کے

زمانے میں زبانی امتحان (Viva Voce) کا کوئی معاوضہ مسلم یونیورسٹی، اندرونی ممتحوں کو نہیں دیتی تھی اس لیے اس کی تاویل کی گئی ''واہ واہ ویسے ہی'' پروفیسر ماخوذ تھا بڑ دیا بڑا اصفر سے (بہ صنعت مقلوب) اور پرووسٹ (Provost) ''براوست'' سے۔

اس تفنن کا المیہ یہ ہوا کہ مرحوم جب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن تشریف لے گئے تو جہاں اور منصوبے مدنظر تھے وہاں اس ڈکشنری کو شائع کرنا بھی مقصود تھا۔ ''جلالی ڈکشنری'' کے نام سے اس کو چھاپنا بھی شروع کر دیا۔ ہم سب نے اپنے آپ پر نفرین کی اور قاضی صاحب سے درخواست کی کہ یہ سب بے فکری اور تفریح و تفنن کا ایک مشغلہ تھا۔ اس کو چھاپنے اور شائع کرنے سے محنت و زیر باری کے علاوہ جگ ہنسائی بھی ہوگی، لیکن مرحوم نہ مانے۔ کچھ اجزا چھاپ بھی ڈالے۔ بالآخر قضا و قدر کو بیچ میں پڑنا پڑا، یعنی قاضی صاحب نے ہم سب کو اور ان کے ورثا نے پریس کو اپنے سے جدا کر لیا ورنہ آپ دیکھتے۔ ''زمین لغت (چمن) گل کھلاتی ہے کیا کیا''[1] کے کیسے کیسے، عجوبے ہمارے سامنے آتے۔

ایک دن قاضی صاحب نے اپنے عقیدت مندوں اور حاشیہ نشینوں سے مچھلی کے شکار پر چلنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ موصوف کی یہ فرمائش جتنی عجیب اور اصرار جتنا شدید تھا اسی اعتبار سے لوگوں نے اپنی طرف سے شرائط بھی سخت رکھے۔ ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ موصوف ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال سے مرغ اور شیرمال دونوں خوب مرغن اور اعلیٰ درجہ کے پکے ہوئے ساتھ لے چلیں۔ قاضی صاحب نے طرح طرح سے وار خالی دینے کی کوشش کی لیکن اتفاق سے ''الٹی پڑ گئیں سب تدبیریں''۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں چیزیں رات گئے تک تیار کرائی گئیں۔ دوسرے دن صبح ہم سب پروفیسر حمید الدین خاں صاحب کی موٹر پر جو شرائط رکھنے اور ان کو منوانے میں سب سے آگے تھے، شکار کی مہم پر روانہ ہو گئے۔ قاضی صاحب کی تجویز یہ تھی کہ جہاں جہاں مچھلی پکڑی جائے وہیں بھون کر کھالی جایا کرے اور مرغ مسلم و شیر

---

[1] اصل شعر یہ ہے:

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

مال علی گڑھ واپس لاکر کام میں لایا جائے۔ دوسروں نے اس میں یہ ترمیم پیش کی کہ مچھلی نہ ملا کرے گی تو مرغ اور شیر مال کھالیا کریں گے۔ جو صرف قاضی صاحب کے اختلاف کے ساتھ بہ اتفاق رائے پاس کردی گئیں۔

بد قسمتی یہ کہ جس تالاب، نہر اور ندی پر قسمت آزمائی کی گئی کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی اور مرغ مسلم شیر مال کے ساتھ کھایا جاتا رہا۔ آخری بار جب ایک ندی کے کنارے ناشتہ کھایا اور ختم کیا جارہا تھا ایک صاحب نے جن سے قاضی صاحب کی ہمیشہ سے دوستانہ چشمک رہی تھی، کھاتے ہوئے بولے: ''قاضی صاحب آپ کا شکریہ کس طرح ادا کیا جائے آپ نے کس خلوص سے مرغ اور شیر مال تیار کرائے تھے، کتنے لذیذ ہیں اور سب نے کس شوق سے کھائے''۔ قاضی صاحب نے دستر خوان سے سر اٹھائے بغیر فرمایا: ''بھئی تو کھائے جا، رہا خلوص، اس کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

قاضی صاحب کا یہ فقرہ کہ ''خلوص کا حال اللہ ہی جانتا ہے'' بڑا مشہور ہوا۔ آج بھی اس زمانے کے جو چند ساتھی رہ گئے ہیں وہ اس فقرے کو موقع آنے پر بغیر کہے نہیں رہتے۔

''خوب دن تھے ابتدائے عشق کے۔''

اس زمانے میں ہندوستانی معلموں کو کالج سے بڑی معمولی تنخواہ ملا کرتی تھی۔ ایک دفعہ کسی بد مذاق یا ضرورت سے زیادہ قاضی صاحب کے ہواخواہ نے وطن میں یہ سوال کردیا: ''قاضی صاحب آپ کو علی گڑھ میں کیا تنخواہ ملتی ہے؟''۔ موصوف نے کچھ زیادہ التفات کیے بغیر جواب دیا: ''بھئی اللہ کا شکر ہے، ڈاکٹر ضیاء الدین اور میری تنخواہ ملا کر کوئی ہزار ایک روپیہ ہو جاتے ہیں۔'' البتہ ڈاکٹر ضیاء الدین کا نام بڑی رواروی میں آہستہ سے لیا اور ہزار روپے کا اعلان بہ آواز بلند کیا۔

اس عہد میں فارسی، عربی اور دینیات کی تعلیم کا انصرام جن بزرگوں کے سپرد تھا ان میں سینئر اور ہر اعتبار سے قابل تکریم اساتذہ میں شمس العلماء مولانا قبلہ سید عباس حسین صاحب، شمس العلماء مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا عبداللہ انصاری صاحب تھے۔ امتداد زمانہ اور بعض دوسرے اسباب سے ان کے گرد تقدس، علمیت اور فضیلت کا ایسا منور ہالا ہے کہ لب کشائی

کی ہمت نہیں ہوتی، لیکن تھوڑی سی رعایت اور عضو تقصیر کا راقم السطور بھی مستحق ہے اس لیے کہ اس نے ان مغتنم ہستیوں کو بہت قریب سے عرصہ تک ہر حال میں دیکھا ہے، پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اس زمانے میں بورڈنگ ہاؤس کی زندگی اور طلبا کی زندہ دلی بھی کچھ کم پہلودار نہ تھی۔ شریف گھرانوں کے تربیت یافتہ نوجوان طلبا بھی ضروری تعظیم وتکریم کے ساتھ تفنن کا کبھی کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے تھے۔ اساتذہ اور طلبا دونوں اس طرح کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہ باتیں اس زمانے میں بڑے اور چھوٹے کے حفظ مراتب کی محرک بھی ہوئیں اور محافظ بھی تھیں۔

یہ روایات یا طور طریقے آج ناقابل التفات ہیں اور دنیا ترقی کرے یا تنزل، اس کا ماتم کیا جائے یا نہ کیا جائے، یہ اب واپس نہیں آتے جس طرح کے شب وروز ماہ وسال اب آئیں گے اور جس آب وہوا سے اب سابقہ ہے یا آئندہ ہوگا وہ ان کے لیے کسی طرح سازگار نہ ہوں گے۔ موجودہ نوجوان طلبا کی ہم نوائی کرتے ہوئے چاہے وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہوں غالب کی زبان میں کہوں گا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔" یا

"جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟"[1]

وجوہ سے سبھی واقف ہیں اس لیے ان کو دہرانے کی بد مذاقی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ تو جناب آج کی شب بھی آپ سو سکیں یا نہیں حسن اپنا قصہ پھر چھیڑتا ہے۔ میرے اختیاری مضامین میں فارسی شروع سے آخر تک رہی اور بہ قدرِ ظرف واستعداد جس پر آج تک کسی نے مجھ پر رشک نہیں کیا، میں نے اس وقت کے تمام اساتذہ سے استفادہ کیا۔ مولانا خلیل احمد صاحب شہر میں رہتے تھے۔ مولانا عباس حسین صاحب کی طرح کافی معمر ہو چکے تھے۔ ان کے حلقہ درس میں بیٹھنے کا کم اتفاق ہوا۔ کبھی ایسا ہوا بھی تو موصوف نے نصاب سے باہر کی ایسی ایسی

---

[1] مکمل شعر اس طرح ہے:

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
غالب

چیزیں بتائیں جو عجیب و غریب ہونے کی وجہ سے آج تک ذہن میں تازہ ہیں۔ امراض کے نسخے لکھ دیتے اور دوا بھی تیار کرا دیتے۔ اس زمانے میں ڈائننگ ہال کا کھانا جیسا اور جتنا ملتا تھا اور اس کے جن عواقب کا سامنا کرنا پڑتا اس کا اندازہ ناظرین کر سکتے ہیں۔ انھیں کے ازالے یا تلافی کے لیے یہ نسخے لکھائے جاتے اور دوائیں تیار کرائی جاتیں اور چونکہ میٹھی اور لذیذ ہونے کے علاوہ بے ضرر ہوتیں اس لیے کبھی ناشتے کے طور پر اور کبھی دوستوں کی تواضع میں بھی کام آتیں۔ مولانا پر معلوم نہیں کیوں اور کیسے کچھ اس طرح کا عالم طاری رہتا تھا کہ ان کے سامنے ہم لوگ سہمے ہوئے رہتے۔ سہارہنا بالخصوص نوجوانوں کے لیے اچھی علامت نہیں، یہ بالعموم بغاوت یا ظرافت کا محرک ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم جب تک ان کی کلاس میں رہتے دم بہ خود رہتے، لیکن جب ان سے دور ہوتے تو حاشیہ آرائی کرتے۔ مولانا کبھی کبھی براق، جنت یا غلماں وغیرہ کے بارے میں ایسی روایات اس انداز سے سناتے کہ وہاں سے واپس آ کر دوستوں کو سناتے تو وہ ہم پر اور براق دونوں پر رشک کرنے لگتے۔ شعر کے معنی بتانے سے زیادہ دوسرے ایسے مفید اور دل چسپ رموز سے آشنا کراتے کہ ہمارے لیے وہ شعر تو جہاں کا تہاں رہ جاتا بہت سے اور شعر یاد آنے لگتے!

مولانا عباس حسین صاحب ہم کو ایم۔ اے میں ''سہ نثر ظہوری'' بڑے شوق و شد و مد سے پڑھاتے تھے۔ جہاں تک ضلع جگت اور رعایت لفظی کا تعلق ہے ظہوری سے خود مولانا کسی طرح کم نہ تھے اور یہی سبب تھا کہ ہم میں کوئی کسی حال میں ہوتا مولانا کی کلاس میں ضرور پہنچ جاتا۔ ہم میں سے بہتوں نے جن میں راقم السطور سب سے آگے نہیں تو کسی سے پیچھے بھی نہ تھا۔ رعایت لفظی، ضلع جگت اور متعلقہ فنون میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی اور مولانا کے مقرب شاگردوں میں تھا۔ مولانا کو اس طرح کے مشغلے سے جس حد تک شیفتگی تھی اس کا قصہ کسی دوست سے سنا یا کسی رسالے میں نظر سے گزرا، صحیح طور پر یاد نہیں۔

قصہ یہ ہے، سر سید کا زمانہ تھا۔ مولانا شبلی بھی کسی کام سے سر سید کے دولت کدے پر موجود تھے۔ اتنے میں مولانا عباس حسین صاحب تشریف لائے۔ سلام و مزاج پرسی کے بعد مولانا شبلی نے دریافت کیا: ''مولانا تکلیف فرمائی کا سبب کیا ہے؟'' مولانا نے جواب دیا:

''تنخواہ جتنی ملتی ہے ناکافی ہوتی ہے۔ مزید ستم یہ ہے کہ کئی مہینے سے وصول بھی نہیں ہوئی۔ سید صاحب کی خدمت میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔'' مولانا شبلی نے یوں ہی یا جان بوجھ کر فرمایا: ''مولانا شکایت بجا ہے، ہم سب اسی مصیبت میں مبتلا ہیں لیکن کیا کیجئے ان دنوں روپے کا توڑا ہے۔'' روپے کے ساتھ توڑے کی رعایت پر مولانا اچھل پڑے اور علامہ شبلی کو ایسی داد دی کہ شاید ان کی اچھی سے اچھی تصنیف پر بھی ان کو کبھی نہ ملی ہو۔ مولانا عباس حسین صاحب جھومتے جاتے اور روپے اور توڑے کی ترکیب پر سر دھنتے، وجد کرتے ہوئے گھر واپس آ گئے اور جو شکایت لے کر گئے تھے اسے بجنسہٖ واپس لائے۔

بی۔ اے (فارسی) کی کلاس بڑی ہوتی تھی۔ ایک دن مولانا نے دوران لکچر انگریزوں کی مذمت شروع کر دی۔ گھنٹے کے ختم ہونے میں چند منٹ رہ گئے تو ہم میں سے ایک نے دور ایک صاحب کی طرف جو مسلمان تھے اشارہ کرتے ہوئے مولانا سے عرض کیا: ''جناب والا وہ منشی شیتل پرشاد بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے والد خفیہ پولیس کے افسر ہیں۔ آپ کی قابلیت اور شہرت سن کر نام بدل کر یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔'' یہ بات سنتے ہی مولانا نے گفتگو پر بریک لگایا اور پکار کر کہا: ''ارے بھئی منشی شیتل پرشاد وہ بات جو میں کہہ رہا تھا دراصل یہ تھی کہ غدر کے فوراً بعد ہندوستان میں عام لوگ انگریزوں کے بارے میں کیسی کیسی غلط فہمیوں کے شکار تھے لیکن جب سے ملکہ وکٹوریہ آں جہانی کا اعلان شائع ہوا اس وقت سے سب چین کی بانسری بجاتے ہیں۔'' یہ سب مفروضہ سن کر منشی شیتل پرشاد اتنے ہی حیران تھے جتنے مولانا پریشان۔ آخر وہی صاحب جن کی تصنیف یہ لطیفہ تھا مولانا کی خدمت میں گھر پر حاضر ہوئے اور اطمینان دلایا کہ خود ان کے والد محکمہ خفیہ کے سب سے بڑے افسر ہیں اس لیے وہ اس معاملے کو آگے بڑھنے نہ دیں گے۔ یہ سب تو ہوا لیکن اس کے بعد مولانا جب کبھی کلاس میں آتے تو سب سے پہلے گردن اونچی کر کے پوچھ لیتے: ''کیوں منشی شیتل پرشاد تو نہیں تشریف لائے ہیں؟'' جب اطمینان ہو جاتا کہ نہیں آئے ہیں تو مولانا اپنی گفتگو یا لکچر شروع کر دیتے۔ مدتوں ہم میں یہ فقرہ بہت مقبول رہا۔ جب کبھی راز کی کوئی بات کہنی ہوتی تو پہلے یہ پوچھتے: ''یہاں کوئی منشی شیتل پرشاد تو نہیں ہیں؟''

آخر میں مولانا بہت معمر اور ضعیف ہو گئے تھے۔ ہماری جماعت ایم۔اے (فائنل) میں پہنچ چکی تھی۔ مولانا کی سکونت پھوس کے اس بنگلے میں تھی جو یونین سے قریب جنوب مشرق کے گوشے پر واقع تھا۔ ہم سب درس کے وقت وہیں پہنچ جاتے۔ ہمارے دیرینہ ساتھی بریلی کے آغا مرزا صاحب بھی ہمراہ ہوتے۔ کالج ہاکی الیون کے کپتان اور مشہور کھلاڑی رہ چکے تھے اور کچھ ہی دن پہلے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ چھٹی لے کر پرائیویٹ امتحان میں شریک ہونے آئے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں یہاں کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ خوب رو، قوی ہیکل، شریف النفس، منکسر مزاج اور بذلہ سنج، جب کبھی شوخی اور خوش طبعی پر آجاتے تو مسکنت اور خاک ساری اور زیادہ بڑھ جاتی۔ ان کے بغیر مولانا کے کلاس کا لطف آدھا رہ جاتا۔

ہم سب درس کے کمرے میں داخل ہوتے۔ مولانا پہلے سے رونق افروز ہوتے تھے۔ ادب و عقیدت کے اظہار کے بعد بیٹھ جاتے۔ مرزا کمرے میں داخل ہوتے ہی مولانا کی جوتیوں کی طرف جھکتے۔ مولانا سختی سے احتجاج کرتے، وہ عرض کرتے: ''حضور یہ سب تو پابندی سے کلاس میں آپ کے فرمودات سے مستفید ہوتے رہے ہیں اور پاس ہو جائیں گے۔ یہ ہیچ مداں تو نوکری پیشہ ہے۔ سارا آسرا حضور کی جوتیوں کا ہے۔ ان کو سر پر رکھوں گا۔ ان کے طفیل کچھ تو دماغ میں محفوظ رہ جائے گا۔'' مولانا کسر نفسی سے کچھ فرماتے۔ مرزا اصرار کرتے کہ ''پھر حضور اس کی اجازت دے دیں کہ جوتیاں سیدھی کر دیا کروں۔ اگلے زمانے میں استاد کی جوتیاں سیدھی کرنے سے لوگ فاضل اجل ہو جاتے تھے۔'' تمام گھنٹہ ہم سب مرزا کی نیاز مندی اور مولانا کی شفقت آمیز باتوں اور بشارتوں سے مستفید ہوتے رہتے۔

ایک دن اتفاق سے کمرے میں ایک چڑا آ گیا اور ادھر اُدھر پھدکنے لگا۔ مرزا فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے اور چڑے سے نبرد آزما ہونے پر تیار ہو گئے کہ کم بخت لکچر میں کیسے مخل ہوا۔ مولانا نے روکا۔ اپنے پوتے کو آواز دی جو مشکل سے چار پانچ سال کا ہوگا اور عربی میں فرمایا کہ ''پرند کو یہاں سے اُڑا دو۔'' ساتھ ہی چڑے کی طرف اس طرح ہاتھ پھینکا کہ وہ اڑ کر دروازے سے نکل گیا۔ بچہ کچھ دیر تک متحیر رہا۔ اس کے بعد چڑے کی طرح وہ بھی کمرے سے باہر ہو گیا۔ مرزا کی بن پڑی۔ بولے ''حضور نے بچے سے عربی میں جو کچھ فرمایا وہ بالکل ہماری سمجھ میں نہ

آیا، لیکن بچے نے پرندے کو کتنا جلد اور کس آسانی سے اڑا دیا۔" مولانا نے فرمایا: "میں نے اس کو عربی میں یہی ہدایت دی تھی کہ پرندے کو باہر نکال دو۔" مرزا صاحب نے اپنے ہمدم دیرینہ حاذق صاحب[1] کو جو میرے بھی کرم فرما ہیں، ایک ٹھوکا دیا اور ذرا بلند آواز سے یاس آمیز لہجہ میں کہا: "حاذق، دیکھا ایک ہمارے تمہارے والدین ہیں کہ نہ خود لکھنے پڑھنے کا شوق، نہ ہم کو کسی کام کا رکھا، بس انا للہ و انا الیہ راجعون تک عربی پڑھا کر رہ گئے۔ یہاں دیکھو عالموں کا گھرانا ایسا ہوتا ہے، اس کمسن بچے کو دیکھو اور عربی میں اس کا چڑا اڑانا دیکھو۔ ہماری تمہاری تو ساری عمر اکارت گئی۔"

مولانا نے مرزا صاحب کو اوران سے زیادہ ان کے اور غالباً ہم سب کے والدین کو کلمۂ خیر سے یاد فرمایا اور ہماری تالیف قلب کی۔ آخر میں فرمایا: "مرزا صاحب دل میلا مت کرو۔ ایں سعادت بزور بازو نیست" بازو پر یہاں تشابہ لگ رہا ہے، وہ بھی سن لیجئے۔ امتحان دینے ہم سب الہ آباد جانے لگے (اس وقت تک بی۔ اے اور ایم۔ اے کا امتحان الہ اباد میں الہ آباد یونیورسٹی لیتی تھی) تو مرزا نے سب کو اکٹھا کیا اور کہا "چلو آخری بار مولانا کو سلام کر آئیں اور رخصت ہو لیں۔" ہم سب تیار ہو گئے۔ مرزا صاحب نے سردار جماعت کی حیثیت سے ہم سب کی طرف سے مولانا سے اپنی دیرینہ ارادت و عقیدت مندی کا اظہار اور مولانا نے ہماری سعادت مندی کا اعلان کیا اور فلاح دارین کی دعا دی۔ یہ ہو چکا تو مرزا نے اپنا دایاں بازو شیروانی کی آستین سے نکال کر مولانا کے قریب کر دیا اور استدعا کی کہ "اس پر حضور کچھ دم فرما دیں تاکہ امتحان میں قلم صحیح اور تیزی سے چلے۔" مولانا نے کچھ دیر تک زیر لب پڑھا اور بازو پر پھونک دیا۔ دوسرے کس طرح باز رہتے، سب نے باری باری اپنے بازو شیروانی سے باہر کر کے مولانا کے قریب کر دیئے اور مولانا نے سب پر دم کر دیا۔ چنانچہ ہم بنگلے سے برہنہ بازو شیروانی کی آستین نکالے ہوئے اس طرح نکلے جیسے ہسپتال سے ٹیکے لگوا کر آ رہے ہوں۔

مرزا صاحب ہم سب کے ساتھ امتحان میں شریک ہونے الہ آباد پہنچے اور حسب معمول مسلم بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ وہاں بانس کی نئی لیکن نہایت کمزور، چھوٹی اور ادنیٰ درجے

---

1. محمد حاذق صاحب، شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ تھے۔

کے بانوں سے برائے نام بنی ہوئی چار پائیاں سونے کے لیے ملیں۔ مرزا صاحب کا قد لمبا اور جسم وزن میں دو من سے اوپر۔ انھوں نے دو چار پائیوں پر قبضہ کیا۔ ایک کے اوپر دوسری کو الٹ کر رکھا اور چپ چاپ لیٹ رہے۔ نہ غسل کیا نہ کپڑے بدلے، نہ ناشتہ کیا نہ سامان کو قرینے سے رکھا، نہ دوست دشمن کسی سے گفتگو کرنا گوارا کیا۔ سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ ہاؤس کو خبر پہنچائی گئی۔ وہ بے چارے بھاگے ہوئے آئے۔ علی گڑھ کے طلبا کی بڑی خاطر مدارات کی جاتی تھی اور ان کے آرام کا بورڈنگ کا ہر چھوٹا بڑا لحاظ کرتا تھا۔ نامی صاحب مرحوم بورڈنگ ہاؤس کے انچارج تھے۔ دریافت حال کیا تو مرزا صاحب نے فرمایا: ''گنگا میں مردہ پھینکنے کے لیے یہ چار پائیاں حضور نے تیار کرائی تھیں تو اس کا بھی لحاظ رکھا ہوتا کہ بورڈنگ ہاؤس سے دریا کافی دور ہے اور کوئی مردہ اتنا وزنی بھی ہوسکتا ہے جو گنگا پہنچنے سے قبل ہی چار پائی کے اندر سے زمین پر ٹپک پڑے۔ اس لیے احتیاط کی خاطر میں نے چار پائی کو دہری کر لیا ہے۔ ادوائن بھی برائے نام ہے اس لیے درخواست کروں گا کہ اس کی بجائے بانس کا ایک ڈنڈا کیلوں سے جڑوا دیجیے۔'' یہ لطیفہ بورڈنگ ہاؤس میں مشہور ہوگیا اور ہم سب کے لیے اچھی اور کشادہ چار پائیوں کا انتظام کر دیا گیا۔

اس زمانے میں ٹلّن نامی ایک بوڑھا دودھ فروخت کرنے بورڈنگ ہاؤس کا گشت لگایا کرتا تھا۔ ٹلّن کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ بوڑھے زیادہ تھے یا گندے زیادہ۔ قریب ہوتے تو ایسی بو آتی جیسے برسات میں بھیڑ، بکری، گائے اور بھینس مہینوں کسی بوسیدہ جھونپڑے میں ساتھ رکھی گئی ہوں اور ان کی آلائش سے گند پھوٹتی ہو۔ بے تحاشا بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھ نے ان کے چہرے کے چپے چپے پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا تھا۔ کچھ محققین کا خیال ہے جنگ، وبا، قحط یا سیلاب کی مانند درخت اور طرح طرح کے پودوں کی کثرت روئیدگی بستیوں پر یورش کر کے ان پر قبضہ کر لیتی ہے اور وہاں کے رہنے بسنے والے پسپا ہو کر کہیں اور پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ٹلّن کی داڑھی مونچھ اور سر کے بالوں نے گردن کے اوپر کے سارے حصوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ جیسے سرحدی علاقے ملے جلے اور غیر متعین ہوں تو جس حکومت کی بن پڑے 'ملک خدا خر گرفت' کے اصول پر اس پر قابض و متصرف ہو جائے۔

بولتے کم تھے، سوجھتا برائے نام تھا۔ سماعت بھی مشتبہ تھی۔ ہم میں سے کسی نے ان کو

دن میں نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہہ نہیں سکتے کہ یہ معذوریاں معمر ہونے کے سبب سے تھیں یا اس سانحے کا باعث یہ تھا کہ چہرہ پر سارے منفذ بالوں یا میلی پیچ در پیچ پگڑی کی گرفت میں تھے۔ گھٹنوں سے اوپر جسم کا تمام حصہ میلی دبیز گزی کی کئی چادروں میں ملفوف رکھتے۔ان کے چلنے کی آواز تو آتی لیکن بولنے اور سننے میں تکلف سے کام لیتے۔ کبھی کبھی اندیشہ گزرتا کہ ایسا تو نہیں کہ متعلقہ اعضا کو کم سے کم کام میں لانے کے سبب سے ان میں سے بعض از کار رفتہ یا سرے سے غائب ہو گئے ہوں۔ دودھ پکانے کے لیے ادھر اُدھر کا ہر قسم کا کوڑا جھونپڑی میں مسلسل جلاتے رہنے سے ان کے سارے بال دخانی خضاب سے دھواں دھار ہو گئے تھے اور خود Smoked fish بن گئے تھے۔

جاڑے میں 8-9 بجے رات کے درمیان ان کا پھیرا ہوتا تھا۔مرشد کا کمرہ ڈائننگ ہال سے بہت قریب تھا۔رات کے کھانے کے بعد وہیں نشست ہو جاتی اور تلن کے انتظار میں کالج یا زندگی کے لطائف وظرائف پر گفتگو ہوتی رہتی۔ تلن اپنے شبینہ راؤنڈ (گشت) پر برآمدے کی دھندلی روشنی میں مقررہ وقت پر نمودار ہوتے۔ پاؤں میں سائز سے بڑا چرودھا جوتا ہوتا۔عمر میں ان سے کچھ کم،شباہت میں ان کے مثل۔ یہ ایک قدم چلتے تو جوتا سوا قدم طے کر لیتا۔ جیسے کسی موقع پر غالب نے کہا ہے: ’’سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔‘‘ جوتے میں نعل لگی ہوتی جو ڈھیلی ہو جانے کے سبب سے ان کے قدموں کی آواز اور زیادہ دوررس اور خوش آئند بنا دیتی۔ برآمدے کے پتھر کے فرش پر سنگ وآہن کا یہ تصادم یا ترنم تلن کے ’’شکمیوں‘‘ کے لیے ’’طاؤس ورباب‘‘ از اوّل تا آخر کی حیثیت رکھتا۔اس زمانے میں ’’شمشیر وسناں اول‘‘ اور ’’طاؤس ورباب آخر‘‘ کی تقدیم وتاخیر یا ان کے لازم وملزوم ہونے کی طرف ہمارا ذہن کم جاتا۔ ایک ہاتھ میں دودھ کا برتن دوسرے میں موٹا ڈنڈا لیے ہوتے۔انھیں کے درمیان کشمیری کانگڑی کی طرح ایک پوٹلی آویزاں ہوتی،نہایت کثیف اور بدبودار کپڑے میں جس پر ہمارے باورچی خانوں کی صافی رشک کرے،شکر ملی ہوئی کھوئے کی لگدی ہوتی یہیں سے وہ پیڑا یا لڈو برآمد ہوتا جس نے اس زمانے میں ہم کو غذائی کمی کی شکایت اور اشتہائی غلبہ سے ایک حد تک بے نیاز اور تلن کے نام کو روشن کر رکھا تھا۔

ڈائننگ ہال میں کھانے سے فراغت پاکر اس پیڑے یا لڈو کی ایسی ہی طلب ہوتی جیسے الکشن میں کوئی امیدوار، ایک حلقۂ انتخاب سے ناکام رہے تو دوسرے سے کھڑے ہوکر فائزالمرام ہونے کے لیے بے قرار ہو۔ ٹلّن کو اس کا یقین تھا کہ ان کی طلبی کی آواز کہیں اور سے آئے یا نہیں، مرشد کے کمرے سے بالضرور آئے گی۔ اس پر ان کو اتنا اعتماد تھا کہ ہم کسی اور طرف الجھے ہوئے ہوتے تو وہ بے تکلف پیڑا یا لڈو بناتے ہوئے کمرے میں چلے آتے۔ ظاہر ہے ان پیڑوں کے ساتھ جتنی مختلف النوع آلائشیں اور جراثیم ''کوفتہ بیختہ آمیختہ'' ہوتے وہ سب ہم معدے میں تہ نشیں کر لیتے۔ زندگی کا یہ وہ دور تھا جب ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی اس اندیشے کا گزر نہ ہوتا کہ دنیا میں بیماری اور موت بھی کوئی چیز ہے۔ اس زمانے میں تو سب سے زیادہ فکر اس کی رہتی کہ بھوک سے پناہ ملے اور برسر آفس کا حساب بے باق رہے۔ بورڈنگ ہاؤس کا کوئی طالب علم شاید ہی کسی خوانچہ والے سے نقد کوئی چیز خریدتا۔ مہینے دو مہینے اُدھار پر کام چلتا۔ اس میں فریقین اپنے اپنے طور پر فائدے میں رہتے۔ ہم کو ہر چیز ہر وقت مل جاتی اور خوانچہ والے کو منہ مانگا ہرجانہ وصول ہو جاتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ کوئی طالب علم دام دے کر چیزیں خریدتا تو خوانچہ والا پہلے اس کو نیچے سے اوپر تک دیکھتا اور یہ سمجھ کر نقد دام لے لیتا کہ ''میاں شاید نوگرفتار (Fresher) ہیں۔''

آج جب مجھے ہر جگہ کا پانی پینے میں تکلف ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کیسا برتن اور پانی ہو۔ سوچتا ہوں کہ ٹلّن کے پیڑے کس شوق سے کیسے کیسے جراثیم کے ساتھ بے تکلف و بے تحاشا تقریباً ہر روز کھاتا اور دردِ سر، زکام، بخار، پیچش، قبض وغیرہ میں اتفاقیہ بھی کبھی مبتلا نہ ہوا۔ سنا ہے بعض اہل تحقیق کا ارادہ گدھوں (Vultures) پر ریسرچ کرنے کا ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ صرف مردار اور غلاظت پر بسر کرتے ہیں کیوں اور کیسے اتنے توانا رہتے ہیں اور غیر معمولی طویل زندگی پاتے ہیں۔ یہ خیال کسی کو ہمارے عہد میں نہ آیا ورنہ وہ ہم پر اور ہمارے خوردونوش پر تحقیقات کر کے بہت پہلے یہ راز دریافت کر لیتا۔ یہ عمل آج بھی کیا جا سکتا ہے اور چیزوں کے علاوہ طالب علموں کا سابقہ کسی نہ کسی تلّن سے کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ بایو کمسٹری (Bio-Chemistry) کا نہایت مکمل و مستند شعبہ ہماری یونیورسٹی میں موجود ہے جو نہایت

جلد اور آسانی سے یہ راز دریافت کرسکتا ہے۔

ہوسٹل میں کسی کا کوئی عزیز یا سرپرست بطور مہمان آجاتا، چاہے وہ کوئی ہو، کیسا ہی ہو، کہیں کا ہو کمرے کے ساتھی مہمان ومیزبان کے آرام وتخلیہ کی خاطر پورا کمرہ خالی کردیتے اور کہیں کسی دوست کے کمرے میں قیام کرلیتے ،لیکن کھانے اور ناشتے کے لیے کمرے ہی میں آتے اور مہمان کے ساتھ کھانے پینے میں شریک ہوتے۔ ظاہر ہے میزبان طالب علم کو نہ صرف اپنے مہمان کے لیے بلکہ اپنے ساتھیوں کے لیے بھی دعوتی کھانے میں گنجائش رکھنی پڑتی۔ کھانے پر کمرے کے ساتھی یا ساتھیوں کا شریک ہونا لازمی تھا۔ اسے تواضع وتہذیب کے لوازم میں سمجھا جاتا۔ ایسے طالب علموں کی ڈائننگ ہال کی حاضری معاف کردی جاتی۔ سندھ، سرحد بنگال اور جنوبی ہند کے طالب علموں کے رشتہ دار عجیب عجیب لباس میں طرح طرح کی زبانیں بولتے اور طور طریقے برتتے ہوئے آتے لیکن ہم میں سے بڑے سے بڑے کی مجال نہ تھی کہ اپنے یا ان کے وارڈ پر ہنسے ،فقرے کسے یا ان سے دور رہے۔ کالج کے سینئر طالب علم معیاری تہذیب کے تمام آئین وآداب ملحوظ رکھتے ہوئے مہمان سے ملنے آتے ،عقیدت کا اظہار کرتے اور مہمان کے رکھ رکھاؤ میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے۔ ہر طالب علم دوسرے کے مہمان کو اپنا مہمان اور بزرگ سمجھتا۔ اس کا اثر بڑا خوش آئند اور پائدار ہوتا۔ نو وارد محسوس کرنے لگتا کہ بورڈنگ ہاؤس کے وہ طلباء جن سے اس کا سابقہ ہوتا کس طرح خود اس کے اپنے وارڈ یا عزیز معلوم ہونے لگتے اور وہ غیر شعوری طور پر ہمارے طور طریقوں کی پیروی کرنے لگتا۔ اس کے بعد تعجب کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ کس طرح زندگی کی ہر سرگرمی میں علی گڑھ کی خصوصیت کارفرما ہوتی ہے، بالخصوص ان لوگوں کی زندگی میں جو اس کے حلقۂ اثر میں کسی نہ کسی حیثیت سے آئے یا آتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ کا یہ رنگ اتنا دلکش وپائیدار ہوتا کہ امتداد زمانہ سے ماند پڑنے کے بجائے اور زیادہ پختہ اور روشن ہوجاتا۔

مضمون ختم کرنا چاہتا تھا کہ یونین کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اس کے لیے ناظرین سے معافی کا خواست گار نہیں ہوں، اپنے حافظے سے البتہ رنج ہوں کہ پہلے کیوں نہ یاد آیا۔ یونین میں میٹنگ تھی۔ پورا ہال اور گیلری بھر چکی تھی اس کے علاوہ جس کو جہاں ذرا جگہ مل گئی وہیں بیٹھایا

کھڑا ہوا تھا۔ اس زمانے میں یونین ہال میں سامعین کی نشستوں کی ساخت ایسی تھی، کہ تکیہ دار اور گداز بینچیں پہلی قطار سے آخر تک درجہ بہ درجہ اونچی ہوتی چلی گئی تھیں۔ چنانچہ ہال پورا بھرا نہ ہوتا جب بھی بھرا ہوا معلوم ہوتا۔ رونق اور شائستگی کی ایک فضا ہوتی۔ ڈائس پر بھی ویسی ہی بینچیں ہوتیں جیسی کہ سامعین کے لیے ہال میں تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ نیچی اونچی نہیں بلکہ یکساں سطح کی تھیں۔ خوب صورت، آرام دہ اور شان دار۔ کچھ دن ہوئے یونین جانے کا اتفاق ہوا تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ معلوم نہیں کس طرفہ طراز نے سامعین کی تمام نشستوں کو ہم سطح کرا دیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہال کی ساری نشستیں بھری ہوتیں جب بھی خالی خالی اور ویران نظر آتا۔ ڈائس پر جو تکیے دار نشستیں رکھی گئی ہیں ان کا حلیہ عجیب تر ہے ان پر بیٹھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے "جاکی" (Jockey) اپنے اپنے راہوار پر بیٹھے ہوئے "اسٹارٹ" کے منتظر ہیں۔ دیکھنے میں کاواک، بیٹھنے میں تنگ اور تکلیف دہ۔ یونین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شایان شان فرنیچر رکھے۔ سنیما، تھیٹر اور پنواڑی کی دکان کی اور بات ہے وہ جس طرح کے فرنیچر چاہیں رکھیں۔ علی گڑھ کی یونین کلب کا فرنیچر یونین کی روایات کے مطابق ہونا چاہیے۔ لیکن اس ایک جملہ معترضہ نے ایک غیر معمولی طویل پیراگراف کی صورت اختیار کر لی۔

بات معلوم نہیں کہاں سے شروع کی تھی اور کہاں پہنچی۔ قصہ یہ تھا کہ ہال بھرا ہوا تھا غالباً بجٹ کی سالانہ میٹنگ تھی۔ بجٹ کی تجاویز پر سخت اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس لیے پروفیسر اے ایف رحمٰن قائم مقام پرنسپل کی حیثیت سے اس جلسے کی صدارت کرنے تشریف لائے۔ پرنسپل اپنے منصب کے اعتبار سے یونین کا صدر ہوتا تھا۔ لیکن عام طور سے یونین کے جلسوں کی صدارت یونین کا نائب صدر کرتا جو طالب علم ہوتا تھا۔ اس دن یونین کے اس طوفان کو سنبھالنے کے لیے خود صدر کو آنا پڑا۔ کچھ قانونی نکتے تھے، کچھ انتظامی امور درپیش تھے، کسی نے یونین کے بنیادی اغراض و مقاصد کا سوال اٹھا رکھا تھا۔ کوئی مجلس منتظمہ (Cabinet) کو ہدف ملامت بنانے کے درپے تھا۔ بعض معلوم نہیں کب کا اور کہاں کا غم و غصہ نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔ بحث میں چند ممبران اسٹاف بھی تھے جو یونین کے "اکس آفیشیو" ممبر تھے، شریک تھے۔ زیادہ زور قانون دانوں کی طرف سے تھا۔ ایسی ایسی موشگافیاں کرتے کہ جواب نہ بن پڑتا۔ عجب افراتفری کا عالم تھا۔

رحمٰن صاحب تقریباً ایک گھنٹہ موافقین و مخالفین کی تقریریں بڑے تحمل سے سنا کیے جب دیکھا کہ طوفان فرو نہیں ہوتا تو فرمایا: ''پندرہ منٹ مزید گفتگو کر لی جائے۔ اس کے بعد آپ کی اجازت سے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔'' پندرہ منٹ ختم ہو گئے تو رحمٰن صاحب کھڑے ہوئے۔ حاضرین یک لخت خاموش ہو گئے جیسے پورے ہال میں کوئی متنفس نہ ہو، فرمایا: ''صاحبو! میں قانون کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں سے تو آشنا نہیں ہوں لیکن اس کی عظمت سے واقف ہوں اور اس کی حرمت کا ضامن۔ آپ نے قانون کا حق ادا کر دیا۔ لیکن قانون میں یہ صفت بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ تیغ دودم ہے۔ اب میں اپنے قانون داں دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مسائل متنازعہ کو پیچیدہ تر بنانے کے بجائے اس کو مفید تر بنانے کی بھی ایک بار کوشش کریں۔ یہ اس لیے عرض کرتا ہوں کہ قانون کا کام دشواری ہی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ دشواری کو دور کرنا بھی ہوتا ہے۔ میں ایسے دوستوں سے خاص طور پر اعانت کا خواست گار ہوں جو قانون اور اپنی صواب دید کے اعتبار سے مسئلے کا کوئی ایسا حل پیش کر سکیں جو کالج کے بہترین مقاصد اور یونین کے عہدے داروں کے وقار کے مطابق ہو۔'' نہایت شیریں و شستہ انگریزی میں اتنا فرما کر بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی پر جوش چیرز (Cheers) ہوئی اور دیکھتے دیکھتے بغیر کسی مخالف آواز کے، ساری تجاویز اسی طور پر منظور کر لی گئیں جن کی طرف صدر نے توجہ دلائی تھی۔ اور ہنستے بولتے سارا مجمع منتشر ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

آج یہ واقعہ کتنا بعید از قیاس اور دور از کار افسانہ معلوم ہوتا ہے، ناظرین ہی کو نہیں مجھے بھی۔

میرا مقصد طالب علمی کے زمانہ کی ان یادوں سے ایسے عناصر اور شخصیتوں کو چُن چُن کر آپ کی توجہ پر مسلط کرنا نہیں ہے جن کو آج بھی قابل تسلیم سمجھا جائے یا جو روایات انھوں نے چھوڑی ہیں ان پر عمل کیا جائے۔ البتہ مجھے ذاتی عقیدت اور اس صحت مند اور صحت بخش فضا سے ضرور ہے جو مادی وسائل کی کمی اور سیاسی محکومی کی سختی کے باوجود کالج کے مختلف النسل اور مختلف الخیال طالب علم، اساتذہ، منتظمین اور متعلقہ اشخاص کی آزاد، مخلصانہ و متفقہ کوششوں سے علی گڑھ میں قائم ہوئی اور برگ و بار لائی۔

اس کا دلکش، قابل رشک اور اہم پہلو اس ہمہ گیر اور ہم آہنگ تہذیبی زندگی کی تشکیل و ترقی تھا جو ہندوستان کا دیرینہ امتیاز مانا جاتا ہے اور جس کی بنا پر اس ادارے کو ایک اعلیٰ درسگاہ، بہ الفاظ دیگر تہذیبی ریاست (Culture State) کا درجہ حاصل ہوا۔ علی گڑھ کی اس تہذیبی ریاست کا قابل قدر اور شاندار کارنامہ اس طرز فکر اور طریق کار کو سمجھتا ہوں جن کی رو سے خیالات و معتقدات کا، خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں جارہانہ یا مفسدانہ اظہار و ابلاغ قابل نفرین قرار دیا گیا۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ نہ صرف بنیادی طور پر مقامی یا علاقائی عصبیت اور مذہبی یا نسلی منافرت سے دور اور محفوظ رہا بلکہ اس نے ان فتنوں کا انسداد بھی کیا۔

یہ نہیں کہتا کہ اس پالیسی سے انحراف نہیں کیا گیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہاں اس کو سراہا کبھی نہیں گیا۔ اس انحراف کی مثال ماضی قریب میں ملتی ہے۔ آزادی حاصل ہونے سے چند سال پہلے ہندوستانی سیاست نے جو پلٹا کھایا اور جیسا شدید تہلکہ ظہور میں آیا اس کی زد سے علی گڑھ بھی نہ بچ سکا۔ ایسا کیوں ہوا اس کا جواب طویل اور تکلیف دہ ہے، شاید سبق آموز بھی۔ لیکن اس کو دہرانے سے کہیں بہتر اس کو بھلا دینا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر اس شخص، جماعت یا نظریے نے علی گڑھ کی اعلیٰ تہذیبی روایات کو نقصان پہنچایا ہے۔ جس نے کہیں یا کسی چیز میں خواہ وہ مذہب ہو یا سیاست، ادب ہو یا تعلیم، جارحانہ یا تشدد آمیز، اختیار کیا۔ ایک یونیورسٹی کے لیے سب سے مایوس کن اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ اس کے اراکین اختلاف رائے کو تخلیقی فکر و عمل کا محرک سمجھنے کے بجائے اس کو ایک دوسرے کی تذلیل و تضحیک کا بہانہ بنائیں۔ اس سے خود غرضی، حماقت اور گمراہی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ مقاصد پامال ہوتے ہیں اور تعلیم گاہیں ''فکر کا زنداں'' یا مخاصمت و منافرت کا مزبلہ بن جاتی ہیں۔

جس طرح دنیا میں ہندوستان کو جغرافیائی طور پر ایک محدود رقبہ زمین لیکن اعلیٰ نصب العین و مقاصد کے اعتبار سے ایک عالمی ریاست (World State) کا درجہ دیتا ہوں اور اس کے مسائل کو سیاسی طور پر اندرونی یا ملکی، لیکن اخلاقی اعتبار سے بین الاقوامی یا آفاقی معیار کے مطابق دیکھنے اور پرکھنے پر اصرار کرتا ہوں، اسی طرح ہندوستان میں علی گڑھ کو جغرافیہ کی رو سے ایک نہایت مختصر رقبہ زمین سمجھنے کے باوجود ثقافتی اعتبار سے اس کو نئے ہندوستان میں سماجی انصاف پر مبنی

ایک مہذب وانسانیت دوست سوسائٹی کے قیام واستحکام کا بڑا مؤثر وسیلہ سمجھتا ہوں، اس لیے کہ علی گڑھ نے شائستگی، معقول پسندی اور روشن خیالی کی ان روایات کو ابتدا سے عزیز رکھا اور پروان چڑھایا جن کی اہمیت وضرورت حالات حاضرہ کے پیش نظر آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

علی گڑھ تحریک کا نفاذ اور علی گڑھ کالج کا قیام نتیجہ ہے تاریخ کے ایک بہت بڑے چیلنج کو قبول کرنے کا۔ وہ چیلنج تھا انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان پر ایک بدیسی مغربی قوم کے مکمل سیاسی تسلط اور جدید مغربی تہذیب کا قدیم مشرقی تہذیب سے تصادم کا۔ سرسید نے بطور خاص اس چیلنج کو مسلمانوں کی طرف سے قبول کیا۔ اس لیے کہ یہ چیلنج مسلمانوں کے لیے خاص طور پر سخت تھا اور ان کی موت وزیست کا سوال بن گیا تھا۔ چوں کہ انگریزوں کی عمل داری سے قبل ملک کے بیش تر حصے پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی اور انگریزوں نے انھیں کے ہاتھ سے حکومت چھینی تھی اس لیے انگریزی حکومت کا رویہ مسلمانوں کی طرف غیر منصفانہ ہی نہیں انتقامانہ بھی تھا۔ ایسے نامساعد اور پُر خطر حالات میں سرسید نے قوم کی آبادکاری وترقی کا جتنا جامع اور ہمہ گیر پروگرام بنایا۔ اس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ تنہا ایک شخص نے بیک وقت اتنے مختلف اور پیچیدہ مسائل پر فکروعمل کی اتنی نئی راہیں کھولیں۔ اکثر ایسا محسوس ہوا ہے کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی ہم سرسید کے مرتبے کا صحیح اندازہ نہیں کرسکے ہیں۔

سرسیّد کی گہری بصیرت، ذہنی قوت، وسیع ہمدردی اور بے نظیر عملی صلاحیتوں کا خیال آتا ہے تو یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی شخصیات یاد آنے لگتی ہیں جنھوں نے ایک جامد یورپی تہذیب کو سائنس اور انسان دوستی کی اعلیٰ روایات سے آشنا کرکے جدید حرکی یورپی تہذیب کو جنم دیا۔ اپنے عہد میں سرسید اور ان کے رفقاء نے بھی اسی قسم کا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے تعلیم میں مشرق ومغرب اور قدیم وجدید کی تخصیص کو نظرانداز کرکے اچھی اور اعلیٰ تعلیم کو انسانی تہذیب کا مشترک سرمایہ قرار دیا۔ مذاہب بالخصوص اسلام کو اعلیٰ اخلاقی شخصیت اور متمدن سوسائٹی کی تخلیق وتہذیب کے لیے ضروری قرار دے کر مذہب کی سچائی اور اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ وقتی سیاست کے مطالبات سے حقیقت پسندانہ طور پر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی لیکن مستقلاً اس کی پابندی کو غلط قرار دے کر سیاست کو تعلیم اور انسانیت کا خادم بنانے کی کوشش کی۔

اردو کو جو زبان و بیان کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ اپنے بے بہا خیالات اور تحریروں سے مالا مال کیا اور اس کے ادب کو ایک جان دار، صحت مند اور فکر انگیز ماحول دیا۔ ایک قوم کو جو شکست خوردگی اور درماندگی کا شکار تھی اسے امید اور حوصلہ بخشا۔ جب طرح طرح کے مشکلات و مصائب میں اسیر، سب اپنی اپنی فکر میں تھے۔ اس وقت قومی عزت اور وطن دوستی کے جذبے کو عام کیا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں زیادہ تر جہالت اور تنگ خیالی کا دور دورہ تھا۔ وہاں ''اصلاح معاشرت و رسوم'' کے راستے دکھائے اور تدابیر اختیار کیں۔ ہندوستان کے مختلف تہذیبی عناصر جو بظاہر اختلاف کا سبب نظر آتے تھے ان میں مشترک انسانیت کے احساس کو فروغ دے کر دوستی و دردمندی کے جذبات پیدا کیے۔ مختصر یہ کہ صدیوں اور نسلوں کی غفلت و تعصب کو صرف ایک نسل (اور وہ بھی بوڑھوں کی ایک نسل) یعنی سرسید اور ان کے رفقائے کرام نے دور کرنے کی کوشش کی اور کامیابی حاصل کی۔

سرسید اور ان کے عہد کو گزرے ہوئے کم و بیش ساٹھ سال ہوئے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے کسی واقعہ پر صحیح رائے قائم کرنے کے لیے یہ مدت ناکافی ہے۔ کسی عہد، شخص یا تحریک کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے بے لاگ'' تجزیہ کی ضرورت اور اہمیت سے سب واقف ہیں، لیکن اس طرح کے تجزیے کی بنیاد جس تاریخی معروضیت پر ہونی چاہئے اس کا احساس کم ہے۔ یہ معروضیت بعد زمانی سے ظہور پاتی ہے۔ اس لیے غلط یا صحیح میرا خیال کچھ اس طرح کا ہے کہ آئندہ زمانے میں سرسید اور ان کے رفقاء کے گوناگوں کارناموں کا زیادہ گہرا مطالعہ اس لیے زیادہ صحیح اندازہ کیا جا سکے گا۔ کیا عجب کہ اس زمانے کے لوگ علی گڑھ میں سرسید کے عہد کو وہی درجہ دیں جو ہم آپ آج اتھینز (Athens) میں پرکلیز (Pricles 490-429 B.C) کے عہد کو دیتے ہیں۔

آج علی گڑھ کا پرکلیز یونیورسٹی کی جامع مسجد کے صحن کے ایک طرف آسودۂ خواب ہے لیکن کیا ہم اسی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا علی گڑھ پرکلیز کا اتھینز بھی ہے۔

فکر و نظر (سہ ماہی)، علی گڑھ۔ جولائی 1963

●

ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں

نہ پوچھ، نامۂ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

نامۂ اعمال کا حال تو حشر میں کھلے گا۔ اس شعر کے دل آویز ہونے میں کلام نہیں جس کو پڑھتے ہی تمام عمر کا قصہ سامنے آجاتا ہے جس کی جنوں انگیزی، عقل سے شرم ساری اور ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داستانیں، انسانی یادداشت اور تخیل کی صدگونا پیکر تراشی اور فسوں کاری کو کیا کہیے کہ ماضی کی وہ تصویریں جو اپنے وقت میں کچھ ایسی قابل التفات نہ تھیں اب اس طرح سامنے آتی ہیں جیسے ان سے زیادہ دل نشیں نہ کوئی تصور ہو نہ تصویر۔

کبھی ایسا نظر آنے لگتا ہے جیسے شام کے وقت کسی لق و دق ریگ زاروں میں، دور بہت دور افق پر اونٹوں کے لدے پھندے قافلے، تھکے لیکن ہم دار قدم اور ناقابل شکست عزم و امید کے ساتھ گزر رہے ہوں اور ان کی پرچھائیں سورج کی آخری لرزاں و رقصاں کرنوں میں آسمان و زمین کے موہوم خط فاصل پر ایک دوسرے کے پیچھے رینگتی چلی جا رہی ہو۔ جیسے کسی سیاہ دفتی سے اونٹوں کی تصویریں تراش کر نہ دکھائی دینے والے تار میں منسلک کر دی گئی ہوں اور کوئی غیبی طاقت ان کو کشاں کشاں کسی نامعلوم منزل کی طرف لیے جا رہی ہو۔ تصور کی محبوبہ

تراشی کبھی یہ سینما پیش کرتی ہے جیسے ماضی کے دھندلکے سے یادوں کا یہ کارواں اس طرح گزر رہا ہو جیسے زمین کے شمالی سرے کے ناپائیدار برف زاروں سے سفر نصیب مرغابیوں کی لمبی لمبی لہریے دار قطاریں تن بہ تقدیر اڑتی چلی جارہی ہوں۔ جیسے ان کا سفر کبھی ختم نہ ہونے والا ہو اور وہ ہمیشہ کے لیے کسی سرور ساکن اور پراسرار افق میں اسیر پرواز ہوں، سمجھ میں نہیں آتا ان لامتناہی یادوں کے کارواں کو کیسے اور کہاں گرفت میں لاؤں۔

معلوم نہیں کیا عمر تھی، کون سا قریہ یا قصبہ تھا، ان اشخاص کا بھی علم نہیں جو میری پرورش اور دیکھ بھال کرتے تھے البتہ کچی دیوار کی ایک کشادہ کوٹھری یاد ہے اس کی مٹیالی لیکن ستھری اور روشن دیواریں اور دروازے، سوچتا ہوں یہ بات کیا ہے کہ کوئی چلتا، پھرتا، مجھے چھوتا اور سنبھالتا ہوا شخص کیوں نہیں یاد آتا۔ وہ کوٹھری کیوں ذہن پر نقش ہے۔ ایسا تو نہیں کہ انسان کی آنکھ سب سے پہلے اشخاص پر نہیں بلکہ کھلی ہوئی یا چھپی وسیع پر کشش اور بوقلموں کائنات پر کھلتی ہو۔ پیدا ہوتے ہی نہیں، مرتے وقت بھی یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگ یا اس کوٹھری کے باہر کے اطراف و مقامات کب اور کیسے پہچان میں آئے۔

کچھ دنوں بعد ایک دوسری جگہ یاد آتی ہے سڑک کے کنارے معمولی سا ایک مکان، گھنے مضبوط، شاداب درختوں اور ان سے چھن کر آنے والی سورج کی کرنوں کی دھوپ چھاؤں میں لوگ چلتے پھرتے نظر آتے۔ آدمی آتے جاتے رہتے لیکن نگاہ سائے اور روشنی کے ان بے ترتیب اور ان گنت نقشوں پر جمی رہتی جو زمین پر جابجا بکھرے ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے دنیا میں جو کچھ تھا یہی تھا اور اتنا ہی تھا۔ پھر ایک اور جگہ سے سابقہ ہوا۔ وہاں تصور میں وسعت آئی ماں باپ کو پہچاننے لگا اور وہ ہر تکلیف و راحت میں یاد آنے لگے۔

چاروں طرف طرح طرح کے لوگ، چیزیں، حالات و حوادث روز بروز بڑھنے لگے پھیلنے لگے۔ اچھا کھانا، اچھا لباس، اچھا سلوک، اچھے لوگ پسند آنے لگے۔ برے اور بدصورت برے معلوم ہونے لگے۔ کیوں اور کیسے؟ یہ نہیں معلوم۔ جس ''تاثراتی تنقید'' سے آج متہم ہوں اس کی چھوت شاید اسی وقت سے دامن گیر ہو۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب مقرر کیے گئے جو کچھ پڑھاتے وہ سمجھ میں نہ آتا۔ ان کی شکل بھی اچھی نہ تھی۔ لیکن ان کا طور طریقہ بات چیت کرنے اور بتانے سمجھانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بہتوں کی خوبصورتی سے ان کی بدصورتی زیادہ اچھی لگتی۔ بہت دنوں بعد خیال آیا کہ وہ مذہبی آدمی تھے۔ اتنے ہندو مسلمان کے معنوں میں نہیں جتنے اللہ و رسول کے مفہوم میں۔ دنیا کے کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرا ہوں۔ مذہب و اخلاق کے اس Pull یا کشش سے میں نے اپنے آپ کو آزاد نہ پایا۔ کتنی ہی دیر ہو جائے، کتنا ہی دور ہو جاؤں، ہر پھر کر اسی دائرے میں قدم پڑنے لگتے ہیں۔ طفولیت کے اس خیاباں سے شگفتہ و شاداب یادوں کی کیسی دلنواز خوشبو آتی ہے۔

مولوی صاحب کے ہمہ گیر و ہمہ وقت تسلط کے علاوہ دیہات کے اسکول کی گرفت میں آیا۔ جہاں ہم عمروں کے ساتھ پڑھنے، لکھنے، سیکھنے، کھیلنے، جھگڑنے اور جلد صلح صفائی کر لینے، لطف اٹھانے کے طور طریقے سیکھے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں میں نے گھر میں پلے ہوئے جانوروں کے علاوہ انسانوں سے محبت کرنے اور ان کی محبت سے سرخوش و سرفراز ہونا محسوس کیا۔ ہر روز گھر سے خوش گوار امیدوں کے ساتھ جانا اور اس نا قابل اظہار احساس سے مطمئن و مفتخر واپس آنا کہ گھر پر کتنا پُر تپاک خیر مقدم ہوگا۔ جیسے میرا جیسا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اپنے سے خوش رہنا اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی نعمت شاید مجھے اسی وقت سے میسر ہے۔

دیہاتی مدرسے سے شہر کے انگریزی اسکول میں آنا یاد آتا ہے۔ عمر و شعور کے بڑھنے اور ماحول کے بدلنے سے دفعتاً اب معلوم ہوا، جیسے زمان و مکاں، حالات و حوادث انسان و اشیا بھی بدل گئے ہوں۔ معلومات کے کتنے دروازے کھلتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ کیسے کیسے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تقاضوں کا سامنا اور زندگی کے کتنے اور کیسے کیسے مسائل سے سابقہ ہونے لگا۔ بڑوں کا پاس، اعلیٰ اقدار سے وابستگی اور کبھی کبھی ان سارے بندھنوں سے آزاد ہو جانے کی بے پناہ خواہش، ان بزرگوں اور خاندانوں کی یاد کتنی قوی تازہ اور متحرک ہے جن سے وہ شہر معمور تھا، جو اپنے سے چھوٹوں کے لیے خواہ وہ کسی طبقہ سے ہوں، اپنی بزرگی اور ذمہ داری کو کبھی نہ بھولتے تھے کوئی ان دنوں شریف و وضیع نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اپنے سے

چھوٹوں کے لیے شریف وضع تھا۔ یہ یادیں ہیں یا رگ و پے میں پیوست زنجیریں جن سے اب تک رہائی نہ ملی۔

اسکول اور کالج کے درمیان کا ایک سال ایسا گزرا جب زندگی کا قافلہ راستے سے بھٹک گیا۔ اب معلوم ہونے لگا جیسے دنیا میں کوئی خوبی باقی رہی ہے نہ خوب صورتی۔ اپنے اور دوسروں کے بارے میں جتنی اچھی رائے قائم تھی وہ نقش برآب نظر آنے لگی۔ دل میں یہ خیال گزرنے لگا جیسے مجھ جیسا بے مصرف آدمی اور کوئی نہ ہوگا۔ کیسی بددلی اور بے بسی کے دن تھے۔ یادوں کے وہ کریہہ وقبیح پیکر، ماضی کے دھندلکوں میں کریہہ وقبیح تر نظر آتے ہیں۔ یکا یک فلم کا یہ فیتہ کٹ گیا اور وہ منظر سامنے آتا ہے جب کالج میں داخل ہوا۔ یہ زمانہ اور کتنا کافی زمانہ حاصل زندگی رہا۔ اعلیٰ بامقصد زندگی کے کیسے کیسے امکانات کا علم ہوا اور ان پر عمل کرنے کی سہولتیں نصیب رہیں۔ یہ سہولتیں مجھے کہیں اور میسر نہیں آسکتی تھیں۔ کیسے دن تھے جب بڑے سے بڑے قصور کو ادنیٰ سے ادنیٰ بہانے پر معاف کردینے کی خوشی اور بڑائی حاصل ہوتی تھی۔

اعلیٰ اقدار، روایات کا احترام خوردوں کی سعادت مندی، بزرگوں کی شفقت علم و ہنر کا چرچا، ذوق و ذہن کی تازہ کاری، طرح طرح کی شوخی، شرارت، رزم ہو یا بزم، اعلیٰ انفرادی انسانی صلاحیتوں کو کام میں لاکر ممتاز رہنے کا حوصلہ۔ یہ یادیں محض یادیں نہیں ہیں وہ تو جسم و جاں کا جزو اور سوچنے کا انداز بن چکی ہیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں نہ صرف اچھی صلاحیتوں کو برگ و بار لانے کا موقع ملتا ہے بلکہ یہ صلاحیتیں یہاں پیدا بھی کی جاتی تھیں۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ جن بعض اچھی استعدادوں کو پیدا کرنے میں فطرت بخل کرتی تھی یہ دانشگاہ اسے بڑی فیاضی سے اپنی طرف سے پورا کردیتی تھی۔

معلوم نہیں کیسے کیسے تہذیبی عوامل یہاں کس کس طرح اور کن کن لوگوں کے ذریعے کارفرما رہے ہوں گے، جن کے طفیل یہ یادیں شب تاریک میں قندیل رہبانی کا کام دے رہی ہیں۔

(نگار کراچی، اپریل 1965)

●

ایک واقعہ

وہ جو میں نہ بھلا سکا

میری زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جسے یہ اصرار ہو کہ میں اسے ضرور یاد رکھوں۔ مجھے اپنے بارے میں یہ خوش فہمی بھی ہے کہ کسی اور کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا ہوگا جس کا تعلق مجھ سے رہا ہو اور وہ اسے بھول نہ گیا ہو۔ نہ بھلائے جانے والے واقعات عام طور پر یا تو توبۃ النصوح قسم کے ہوتے ہیں یا تعزیرات ہند کے۔ بقول شخصے یعنی گویا کہ ''ترقی پسند'' ہوتے ہیں۔ میری زندگی کے اوراق میں اس طرح کے ''سال کا بہترین افسانہ'' یا ''بہترین نظم'' نہیں ملتی۔ میں تو اس درجہ بدنصیب یا سرپھرا ہوں کہ لکھتے وقت یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ ادب میں صرف ''اشترائیت'' ترقی پسندی کی علامت ہے۔ اس کا سبب کیا ہے مجھے بالکل نہیں معلوم، مجھے اس کی فکر بھی نہیں کہ معلوم کروں۔ اگر آپ اس کے درپے ہیں کہ کوئی نہ کوئی وجہ دریافت کرلیں تو پھر صبر کیجئے اور اس وقت کا انتظار کیجئے۔ جب میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے زیادہ خوش حال اور نیک نام ہو جاؤں یا مجھ پر غبن یا اغوا کا مقدمہ دائر ہو جائے۔ اس وقت آپ میرے عزیزوں یا دوستوں ہی سے میرے بارے میں ایسے واقعات سن لیں گے جو مجھ پر گزرے ہوں یا نہیں، آپ خود ان کو کبھی نہ بھلائیں گے۔

لیکن ارباب ریڈیو نے مجھے اس پر مامور کیا ہے کہ میں آپ کو کوئی واقعہ سناؤں ضرور اور میں سناؤں گا بھی ضرور۔ آپ نے گاؤں کی ایک روایت یا کہاوت تو سنی ہوگی یعنی ''نائی کا نوشہ جمانوں کو سلام کرتا پھرے۔'' اس روایت پر جو اصول بنایا گیا ہے وہ البتہ ایسا ہے جو کبھی نہ بھلایا جا سکے یعنی حق تمام تر جمانوں کا اور ذمہ داری تمام تر نائی کے نوشے کی۔ ایک دفعہ پھر ''یعنی گویا کہ'' لکھیں ہم، ترقی پسند آپ۔ یہ اصول ہماری سوسائٹی اور زندگی پر کتنا لاگو ہے۔ میں نے لاگو کا لفظ ان دوستوں کے احترام میں استعمال کیا ہے جو عدالت یا کاؤنسل میں بحث مباحثہ میں حصہ لیتے ہیں۔ ان معنوں میں ہرگز استعمال نہیں کیا ہے جن معنوں میں دلی کی میونسپلٹی نے حال ہی میں لاگو جانوروں کے بارے میں اشتہار دیا ہے کہ جو شخص ان کو مار ڈالے اس کو انعام ملے گا۔ میں اس غرض سے دلی آیا بھی نہیں ہوں۔ البتہ مجھے انعام لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ خواہ انعام کی رقم آدھی ہی کیوں نہ کر دی جائے۔ میرا یہ کارنامہ کیا کم ہوگا کہ میں کسی لاگو جانور کا شکار نہ ہوا تو وہ واقعہ یہ ہے۔

زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے۔ میں حاضر غائب متکلم کی حیثیت سے آپ سے گفتگو کرنے دلی آرہا تھا، جس ڈبے میں مجھے جگہ ملی وہ خلاف توقع اتنا بھرا ہوا نہ تھا جتنا کہ ریلوے والے چاہتے تھے۔ یہ بات بھی میں بھول نہیں سکتا، لیکن اس اعتبار سے ڈبہ بھرپور تھا کہ اس میں ہر جنس، ہر عمر اور ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ایک بوڑھا کسان بھی گرتا پڑتا داخل ہوا، زندگی میں اس طرح کے بڈھے کم دیکھے گئے ہیں۔ بڑی چوڑی چکلی ہڈی، بہت لمبا قد اس طور پر جھکا ہوا جیسے بڑھاپے میں قد سنبھلتا نہ تھا، اس لیے جھک گیا تھا۔ جسم پر کچھ ایسا گوشت نہ تھا لیکن اس کی شکل اور نوعیت کچھ اس طرح کی تھی کہ اس کے دیکھنے سے اس کے چھو لینے کا احساس ہوتا تھا جیسے گوشت اور چمڑے کے بجائے مصنوعی اور مرکب ربر وغیرہ قسم کی کوئی چیز منڈھ دی گئی ہو سخت اور ناہموار موسم پروف ہی نہیں، رگڑ پروف بھی ہتھیلی اور اس سے متصل انگلیوں کی سطح ایسی ہو گئی تھی جیسے کچھوے کی پیٹھ کی ہڈی کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کی پچی کاری کر دی گئی ہو۔ میرے دل میں کچھ وہم سا پیدا ہوا جیسے یہ آدمی نہ تھا کھیت، کھاد، ہل، بیل، مرض، قحط، فاقہ، سردی، گرمی، بارش سب سے نبٹنے اور اپنی جیسی کر گزرنے کی ایک ہندوستانی علامت سامنے آ گئی ہو۔

ڈبے میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس کی پذیرائی اس طور پر نہ کی ہو، جیسے کوئی معذور، مرقل خارشی کتا آ گیا ہو، نوجوانوں نے مار ڈالنے کی دھمکی دی، عورتوں نے بیٹے بیٹی مرجانے کے کوسے دیئے، بوڑھوں نے یہ دیکھ کر کہ نووارد بڈھا ان سے پہلے مرجائے گا، اپنوں کو نوجوانوں میں شمار کرلیا اور ماں بہن کی گالی دینی شروع کردی، گالی بے دردی اور اپنی اپنی بڑائی بگھارنے اور بکھاننے کا ایسا بھونچال آیا کہ میں نے محسوس کیا کہ کچھ تعجب نہیں کہ ڈبہ بغیر انجن کے چلنے لگے۔ نووارد کی نظر ایک دوسرے بڈھے پر پڑی جو شاید اس قسم کے سلوک سے دوچار ہو کر ایک گوشے میں سہما سمٹا اپنے ہی بستر پر جو فرش پر پڑا ہوا تھا، بیٹھا تھا، دونوں یک جا ہو گئے۔ آنے والا اپنی لٹھیا کے سہارے فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور سر کو اپنے دونوں گھٹنوں میں اس طور سے ڈال لیا کہ دور سے کوئی اپنی اچٹتی نظر ڈالے تو چونک پڑے کہ یہ کیسا شخص تھا" جس کے کندھوں پر سر نہ تھا۔"

شور اور ہنگامہ کم نہ ہوا تھا کہ گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی، ایک ٹکٹ کلکٹر صاحب نازل ہو گئے، ڈبے میں کچھ ایسے لوگ تھے جن کے پاس ٹکٹ نہ تھے صرف قیمتی سگریٹ کیس، فاؤنٹین پین، گھڑی اور سونے کے بٹن تھے۔ ٹکٹ کلکٹر کو کسی نے سگریٹ پیش کیا۔ کسی نے دو بڑے بڑے انناس دیئے، کسی نے اپنی ساتھی خاتون کا یوں تعارف کرایا کہ وہ بی۔اے پاس تھیں اور فلم میں کام کرتی تھیں۔ سب کو نجات مل گئی۔ بڈھا پکڑا گیا اور وہ سب جو ٹکٹ نہ لینے کے مواخذہ سے نجات پا چکے تھے ٹکٹ کلکٹر کی حمایت میں بڈھے کو برا بھلا کہنے لگے اور وہی قصے پھر سے شروع ہو لیے۔ یعنی پھبتی، پھکڑ، گالی گلوچ اور معلوم نہیں اور کیا کیا۔

بڈھا بھو چکا تھا اور برابر کہے جا رہا تھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ بڑی مصیبت اور تکلیف میں تھا۔ کسی کے پاؤں پکڑ لیتا، کسی کی دہائی دیتا۔ اس کی بیوہ لڑکی کا اکیلا نوعمر ناسمجھ لڑکا گھر سے خفا ہو کر دلی بھاگ گیا تھا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے یا لیے۔ جس کے فراق میں ماں پاگل ہو رہی تھی اور گھر کے مویشیوں کے گلے میں باہیں ڈال ڈال کر روتی تھی۔ جس طرح بڈھا ہم سب کے پاؤں میں سر ڈال کر منتیں کرتا اور روتا تھا گاؤں والے کہتے تھے کہ ماں پر آسیب ہے، بڈھا بے اختیار ہو ہو کر کہتا تھا" حجو رسچ مانو، میری بہو پاگل نہیں ہے، اس پر آسیب نہیں ہے، وہ تو میری خدمت کرتی ہے، ڈھور ڈنگر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیتی باڑی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے

اور گھر کا سارا دھندا کرتی ہے۔" اس پر سونے کے بٹن نے فرمایا "ارے بڈھے تو کیا جانے وہ اور کیا کیا دھندا کرتی ہے۔" بڈھا بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر رونے لگا۔ بولا "سرکار مائی باپ ہو، یہ نہ کہو، میری بہو ہیرا ہے۔ دس سال سے بیوہ ہے، سارے گاؤں میں اس کی مان دان ہے۔" ٹکٹ کلکٹر نے ایک موٹی سی گالی دی اور بولا: ٹکٹ کے دام لا۔ بڑا بہو والا بنا ہے۔ بڈھا پھر گڑگڑانے لگا۔ اس پر ایک صاحب نے جن کا لباس میلا فاؤنٹین پین امریکن اور شکل بنجاروں جیسی تھی اور پتے پر سے انگلی سے چاٹ چاٹ کر دہی بڑے ختم کیے تھے، سنی ہوئی انگلی سے بالوں کو خلال کرتے ہوئے فرمایا: "کیوں رے بڈھے منہ پر آنکھ نہ تھی کہ ہمارے درجے میں گھس آیا۔ شریفوں میں کبھی تیرے پرکھے بھی بیٹھے تھے؟" بڈھا گھگھیا کر بولا: "بابو اسرا پھوں ہی کو دیکھ کر چلا آیا۔ اسرا پھ دیالو ہوتے ہیں تمہارے چرنوں میں سکھ اور چھایا ہے۔ تھرڈ کلاس میں گیا تھا، ایک نے ڈھکیل دیا گر پڑا۔ بہو نے بچے کے لیے ایک نئی ٹوپی اور کچھ سوکھی جلیبی دی تھی جو انگوچھیا میں بندھی تھی کہ لونڈا بھوکا ہوگا، دے دینا۔ ٹوپی پہن کر جلیبی کھائے گا تو خوشی کے مارے چلا آئے گا۔ ہر بڑ میں جانے کس نے انگوچھیا ہتھیالی۔"

ٹکٹ کلکٹر نے سگریٹ کا آخری ٹکڑا کھڑکی کے باہر پھینکا اور فیصلہ کن انداز سے کھڑے ہو کر فیصلہ دیا "بڈھے تو یوں نہ مانے گا۔ اچھا کھڑا ہو جا اور جامہ تلاشی دے، ورنہ لے چلتا ہوں ڈپٹی صاحب کے ہاں جو پاس کے ڈبے میں موجود ہیں اور ایسوں کو جیل خانے بھیج دیتے ہیں" بڈھا جامہ تلاشی کے لیے اس خوشی اور مستعدی سے تیار ہو گیا جیسے بے زری اور ناکسی نے بڑے آڑے وقت میں بڑے سچے دوست یا بڑے کاری اسلحہ کا کام کیا تھا۔ اب دوسرے بڈھے سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا "بابو صاحب بڈھے نے برا کیا جو اس ڈبے میں چلا آیا اور ٹکٹ نہیں خریدا لیکن اس کو سزا بھی کافی مل چکی۔ اب مار دھاڑ ختم کر دیجیے، بڈھا بڑا دکھی معلوم ہوتا ہے۔" ٹکٹ کلکٹر کا نزلہ اب دوسرے بڈھے پر گرا فرمایا: "آپ ہوتے کون ہیں؟ ہم کو تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔" بڈھے نے جواب دیا "آپ فرض ادا کرتے ہیں۔ بڑا اچھا کام کرتے ہیں لیکن فرض ادا کرنا تو ۲۴ گھنٹے کا کاروبار ہوتا ہے۔ کیا آپ یقین کرتے ہیں کہ چند منٹ پہلے بھی اس ڈبے میں اپنا فرض ادا کرتے رہے تھے۔ بڈھے کی جامہ تلاشی کیوں لیتے ہیں، آپ کو جس

چیز کی تلاش ہے وہ اس کے پاس تو کیا اس کی نسل میں بھی کبھی نہ تھی۔ اس کے ہاں تو صرف وہ بہو ہے گی جس کا ایک دھندا اپنے لڑکے کو کھو دینا اور اپنی سوکھی مویشیوں کے گلے سے لپٹ کر تسکین پانے کی کوشش کرنا ہے۔ ممکن ہے وہ دھندا بھی ہو جو ہمارے ان ساتھی دوست کو معلوم ہے جو ایک لاچار بڈھے کے غم نصیب بہو کا دھندا خود اپنے بے ٹکٹ سفر کرنے سے زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں۔ کتنی بے عقل بہو ہے کہ بچے کے غم میں مویشیوں کے گلے سے لپٹ کر روتی ہے اور ہمارے دوست کے گلے سے لپٹ کر رقص نہیں کرتی۔'' ٹکٹ کلکٹر نے کہا: ''یہ دیہاتی بڑے حرفوں کے بنے ہوتے ہیں اور دام رکھ کر بے ٹکٹ سفر کرتے ہیں۔ پکڑے جاتے ہیں تو رو پیٹ کر چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ بڈھے نے جواب دیا ''لیکن آپ کو اس کا بھی تو تجربہ ہوگا کہ بعض دیہاتی ایسے نہیں ہوتے۔'' فرمایا رہنے دیجئے میں تو اس کے حلق میں سے دام نکال لوں گا۔''

طوفان تھم سا گیا۔ گاڑی کی رفتار معمول سے زیادہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ٹکٹ کلکٹر اٹھ کر اس حلقے میں جا بیٹھے جہاں جوان عورت سونے کے بٹن اور قیمتی سگریٹ تھے۔ ایک سگریٹ اور حاصل کیا اور سیاسی مسائل پر سستے جذبات کا اظہار کرنے لگے۔ دوسری طرف ننھے بڈھے نے کسان کو ٹکٹ کے دام دیئے۔ وہ شکریئے میں کچھ اور رونے پیٹنے پر آمادہ ہوا تو ننھے نے بڑے اصرار اور کسی قدر سختی سے روک دیا۔ ٹکٹ کلکٹر صاحب پھر سے تشریف لائے اور بے ٹکٹ بڈھے سے مواخذہ شروع کر دیا۔ بڈھے نے کرایہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ ٹکٹ کلکٹر متحیر رہ گیا۔ لیکن فوراً سمجھ گیا کہ واقعہ کیا تھا۔ دوسرے بڈھے سے بولا آپ نے روپے کیوں دیے، آپ کا نقصان کیوں ہو، میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بڈھے کو یہ معلوم ہو کہ بے ٹکٹ سفر کرنا معاف کیا جا سکتا ہے۔ دو چار روپے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

ٹکٹ کلکٹر کچھ دیر تک خیال میں کھویا رہا۔ بے خبری ہی میں اس نے اپنا سگریٹ نکالا اور سلگا کر پینے لگا۔ ابھی نصف بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال دیا اور جوتے سے مسل دیا اور دیر تک مستغرق رہا اس کا خیال کہیں اور تھا۔ دور بہت دور قریب کی جھاڑیاں، تار کے کھمبے، درخت، مولیشیاں پانی کے گڈھے، آسمان کی وسعتیں، افق کا نیم دائرہ تیزی سے گزرتی اور چکر کاٹتی معلوم ہونے لگیں۔ ٹکٹ کلکٹر اٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ یا تو ڈبے کی زنجیر کھینچ لے گا

یا خود کھڑکی سے باہر جست کر جائے گا۔ اس نے دونوں اثاثہ ہاتھ میں اٹھائے اور لے جا کر اس کے مالک کے پاس رکھ دیئے اور بولا ''ان کو واپس لیجئے اور ٹکٹ کے دام لائیے۔'' ٹکٹ کلکٹر کے ارادے میں ایسی قطعیت اور اس کے تیور کا کچھ ایسا انداز تھا کہ مسافر نے پرس کھول کر ٹکٹ کے دام گن دیئے۔ دوسروں نے بھی بغیر کسی تمہید یا تامل کے ٹکٹ کے دام دے دیئے۔ ٹکٹ کلکٹر نے سب کو رسید دے دی۔ ان سے فارغ ہو کر وہ جوان عورت سے مخاطب ہوا اور بولا ''شریمتی جی میں آپ سے روپے نہ لوں گا۔ خود دوں گا۔ یہ لیجئے رسید حاضر ہے۔'' عورت تیار نہ ہوئی اور ردوقدح شروع ہو گئی۔

گاڑی دلی کے اسٹیشن پر آ کر رکی۔ میں بھی اتر پڑا، اب دیکھتا ہوں کہ ایک طرف بڈھا کسان دوسرے بڈھے کے پیچھے پیچھے روتا، دعائیں دیتا چلا جا رہا ہے۔ دوسری طرف جوان عورت ٹکٹ کلکٹر کے تعاقب میں چلی جا رہی ہے۔ اور میں آپ کی خدمت میں باتیں بنانے حاضر ہو گیا۔

(نئی روشنی، ہفتہ وار) دہلی، یکم رجون 1949ء

●

1915 و مابعد

بذاتِ خود مجھے ''اولڈ بوائے'' میں لکھنے سے سوا ''اولڈ بوائے''[1] کے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی (یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے تابع مہمل ہیں) سے میں نے کالج کے کھلنڈروں کا زمانہ نہیں دیکھا ہے اور میں علی گڑھ اس زمانے میں آیا جب کالج کی بہت سی خصوصیات زائل ہونے لگی تھیں اور اب جب کہ اس میں نہ وہ دلچسپی ہے اور نہ وہ خصوصیات، مجھے اس زمانے کی یاد زیادہ خوش گوار معلوم ہوتی ہے جب کالج کا مفہوم انھیں دو الفاظ سے مرکب تھا۔ کالج میں میرا داخلہ 1915 میں ہوا اور طالب علمانہ زندگی 1921 میں ختم کردی۔ یوں تو نمک خواری کے سلسلے میں اب بھی دادِ زیست دے رہا ہوں لیکن:

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

''ایامِ جاہلیت'' میں اور اسے میں اس زمانے سے تعبیر کرتا ہوں جو علی گڑھ سے باہر کالج آنے سے قبل میرا یا کسی ''غیر علیگ'' کا گزرا ہے، میں علی گڑھ کو اپنی زندگی کا بہترین ''تصور'' سمجھتا تھا اور کسی علیگ کو دیکھ پاتا تو سمجھتا کہ یہ بزرگ گویا ''کرۂ مریخ'' سے آئے ہیں۔

---

1. اولڈ بوائے سب سے پہلے 1910 بنارس سے نکلا تھا، اس کے ایڈیٹر عشرت حسین تھے۔ اس مضمون کے بارے میں تعین نہیں ہوسکا کہ کس سال اور مہینہ میں یہ مضمون شائع ہوا۔

بعض لوگ خیال کریں گے، یہ نرمی لفاظی ہے لیکن کم سے کم وہ لوگ جو موجودہ اردو افسانہ نگاری سے آشنا ہیں، میرے عقیدے کی تصدیق کریں گے۔ میں نے تو آج تک جدید رسائل یا ناولوں میں کوئی ایسا ہیرو نہ پایا جو علی گڑھ کالج کا گریجویٹ نہ ہو یا الہ آباد سے بی۔اے کا امتحان دے کر واپس آتا ہوا کسی فرسٹ یا سکنڈ کلاس کے دوشیزہ ''پیکر عفت''، ''زہرہ جبیں''، ''کافر ماجرا''، ''ولد''، ''کوئی پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر'' بت کو دیکھ کر اعضائے رئیسہ کی کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو گیا ہو۔علی گڑھ کالج کے بجائے اب مسلم یونیورسٹی عالم وجود میں آگئی ہے اس لیے بی۔اے وغیرہ کے امتحان دینے کے لیے الہ آباد آنا مسدود ہو گیا ہے۔اندیشہ ہے کہیں یہ واقعہ اردو ناول نویسوں کی پروازِ تخیل کو اور زیادہ نہ محدود کر دے۔

کون نہیں جانتا آج کل افسانہ نگاری کے لیے صرف یہ درکار ہے کہ ہیرو اور ہیروئن دونوں علی گڑھ کی ''پیداوار'' ہوں۔ ہیرو کے لیے تو یہ ضروری ہے کہ وہ علی گڑھ کا گریجویٹ ہو، کرکٹ کپتان ہو اور یونین کا جادو بیاں مقرر۔عشق اکثریوں سرزد ہوتا ہے کہ وہ الہ آباد جاتا یا وہاں سے آتا ہو جس کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے یا کالج ٹیم کہیں گئی ہو اور وہیں کپتان صاحب اور میزبان کی صاحب زادی یا بھتیجی بھانجی سے کوئی ''ماجرا'' ہو گیا ہو۔ ہیروئن کا لازمی طور پر علی گڑھ گرلز اسکول سے تعلق ہو، ساڑھی پہنتی ہوں، عینک لگاتی ہوں، حسن و جمال میں شہرہ آفاق ہوں، پیانو بجانا جانتی ہوں اور خط ایسا لکھ سکتی ہوں گویا ''شباب اردو'' یا ''نقادآگرہ'' کی مدیر معاون رہ چکی ہیں۔

مجھے اکثر تعجب آتا ہے کہ مولانا محمد علی صاحب کی طرف سے ناول نویسوں نے کیوں اتنی خاموشی اختیار کر رکھی ہے؟ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک ہفتہ وار اخبار میں جو حسنِ اتفاق سے علی گڑھ سے نکلتا ہے، ایک ایسا افسانہ شائع ہوا جس میں ہیرو ہیروئن ''ترک موالات کی پیداوار'' تھے۔اگر تحریکِ ترکِ موالات میں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے تو پھر مولانا محمد علی صاحب سے زیادہ اس عزت کا کون مستحق ہو سکتا ہے؟ اردو ناول نویسوں کے لیے تو اس کا بہترین موقع تھا کہ وہ مولانا کی پُرآشوب زندگی میں اس قسم کی دلچسپیاں پیدا کر دیتے۔ ان کی تحریر اور تقریر دونوں اس قسم کے حادثے کی محرک ہو سکتی ہیں۔ بہت ممکن ہے اس دفعہ آم کے دورے کے بعد نول کشور پریس سے کوئی جرنلسٹ مولانا کو زندۂ جاوید بنا دے، لیکن آج کی خبر سے یہ معلوم کر کے

مایوسی ہوئی کہ مولانا کے دفعتاً علیل ہو جانے سے یہ بار مولانا شوکت علی صاحب کے شانوں پر منتقل ہو گیا۔ ہیرو بننے کی صلاحیت تو مولانا شوکت علی میں کافی سے زیادہ ہے لیکن ان کی جوڑ تلاش کرنے اور مضمون میں کھپانے میں البتہ کافی دقت ہے۔ میرا خیال ہے اس کے لیے جناب دل گیر کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

جدید یونی ورسٹیوں کے قائم ہو جانے سے گریجویٹوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی نسبت سے علیگوں کی تعداد میں بھی کافی ترقی ہو گئی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ لوگوں میں وہ ولولے باقی نہ رہے جو کسی ''علی گڑھ کالج والوں'' (اس کے جوڑ پر آغا حیدر حسن صاحب ہمیشہ ''دلّی والیان'' لکھا کرتے تھے) میں تھے۔ ایک زمانہ تھا جب علی گڑھ لوگ فیل ہونے کے لیے آیا کرتے تھے، اب پاس کرنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ جس زمانے میں منٹو سرکل کالج بورڈنگ ہاؤس تھا ہم لوگ بہ ظاہر باہر گھنٹے کے انتظار میں اسٹریچی ہال کے سامنے مولسری کے درخت کے نیچے کھڑے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سید آل عبا صاحب قادری (کاؤس جی) بھی اپنے خاص انداز میں ہیملٹ کا تصور کر رہے تھے، اتنے میں چند اصحاب اور آ گئے۔ چہرے پر پریشانی، جوتوں پر گرد، ہاتھ میں کاپیاں، آنے کے ساتھ ہی پوچھنے لگے، کون سا گھنٹا ہے.... پروفیسر آئے، گھنٹے میں کتنی دیر ہے؟ آل عبا صاحب یک لخت چونک پڑے اور ان کا چونک پڑنا بھی عجیب لطف کا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ نو واردوں کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر فرمایا: ''کیا جناب اجازت دے سکتے ہیں کہ میں دریافت کروں، آپ کا دولت خانہ منٹو سرکل تو نہیں ہے؟'' اس پر سب کے سب ہنس پڑے۔ آل عبا صاحب اب بھی کافی سیریس (Serious) تھے، لیکن لہجہ کسی قدر نرم کر کے بولے ''کیوں حضرت! علی گڑھ کوئی پاٹ شالا ہے جو آپ یہاں پڑھنے کی نیت سے آئے ہیں۔ آپ کے غریب والدین کو کیا خبر کہ صاحب زادے ان کی دولت یوں لٹا رہے ہیں۔ میاں تم کو پکی بارک کے غسل خانے میں بھی جگہ نہ ملی کہ رُخ اور پاپوش مبارک صاف کر لینے کی توفیق ہوتی۔''

یہ بہ ظاہر ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے لیکن جو لوگ کالج کا وہ زمانہ دیکھ چکے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت کالج اور کالج کی زندگی کا مفہوم کیا تھا؟ اس زمانے میں خالص کالج والے وہ لوگ

ہوتے تھے جو پکی بارک میں رہتے تھے اوراس کی تمام آئین وروش کا نمونہ ہوتے تھے۔ آخرآخر میں یہ سعادت ایک حد تک کچی بارک والوں کو بھی نصیب ہوگئی تھی۔ منٹوسرکل حال میں کھلا تھا اور پکی بارک سے فاصلے پر تھا، وہاں کی فضا میں ابھی کالج کی حقیقت سرایت نہ کرسکی تھی۔ وہاں کی کوئی روایات نہ تھیں، اس لیے ان کا شمار دوسرے درجے کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ یونی ورسٹی قائم ہوجانے کے بعد منٹوسرکل انٹرمیڈیٹ کالج ہوگیا، اسٹاف جدا، طلبا جدا، کھانا پینا جدا، دوست احباب جدا، رہنا بسنا جدا، فکر وعمل جدا، غرض کہ ہر چیز جدا ہے۔ کالج کی روایات سے مانوس کرنے والے علاحدہ ہوگئے۔ چھوٹے بڑے کا مفہوم مفقود ہوگیا۔ ہر شخص نے اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ اختیار کرلیا، نتیجہ وہی ہوا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں اور منوانے والے منوا سکتے ہیں کہ جب کالج تھا، اب یونی ورسٹی ہے۔ ماہرانِ تعلیم کا بھی فیصلہ ہے، مہذب دنیا اسی پر کاربند ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے، ہر کالج سے ہر یونی ورسٹی بہتر ہو تو ہو لیکن ایم۔اے۔او۔کالج سے مسلم یونی ورسٹی کم تر، اس اعتبار سے نہیں کہ اس میں نقائص ہیں بلکہ اس میں وہ خوبیاں نہیں، جو ایم۔اے۔او۔کالج میں تھیں۔ اب تو لوگ پاس ہونے اور ڈگریاں لینے کے خیال سے آتے ہیں، اس وقت انسان بننے اور بنانے کے لیے آتے تھے۔ لوگوں کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ ڈگری ملی یا نہیں، خیال اس کا رہتا تھا کہ زندگی کے ہر معرکے میں اور جاں بازوں کے ہر صف میں علی گڑھ والے ہی کا نام اُچھلا یا نہیں۔ بعض لوگ پکار اُٹھیں گے، گزرا ہوا زمانہ حال سے زیادہ خوش گوار معلوم ہوتا ہے، ایسوں کا جواب خاموشی ہے۔ داغؔ نے شاید اسی موقعے کے لیے کہا:

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

میں خوش ہوں کہ میں اس وقت بھی کالج میں لیل ونہار کی کتنی کروٹیں لے چکا تھا، جب تک ترک موالات کی تحریک کالج میں پیش کی گئی، تاریخ کالج کے اس باب سے میں خاموشی کے ساتھ گزر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں موزوں ہوں اور نہ ہمارا ''اولڈ بوائے''۔ ہاں جو غم اب تک تازہ ہے وہ ہماری انجمن اخوت، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا ہے۔ شاید اسے کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ علی گڑھ کی کامیابی کا تنہا اور اولین راز اولڈ بوائز ہیں۔ جب تک اولڈ بوائز زندہ ہیں، علی گڑھ زندہ ہے، ہاں دیکھنا یہ ہے ''قبیلہ مجنوں'' کا کوئی باقی بھی ہے یا نہیں!

میں کہیں اوپر ظاہر کر چکا ہوں کہ میں نے ایم۔اے۔او۔کالج کا صرف آخری دور دیکھا ہے، لیکن باوجود اس کے اس کا بہ خوبی اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ محفل کیسی رہی ہوگی جس کی آخری شمعیں یوں جھلملا جھلملا کر خاموش ہوگئیں۔کالج یونی فارم اور ڈائننگ ہال کی پابندی دو ایسی خصوصیات تھیں جو بہ طور فسانے کے اب تک زبانوں پر ہیں۔طالب علمی کے پورے چار سال میں نے ٹول صاحب کی پرنسپلی میں گزارے ہیں۔ٹول صاحب کے علاوہ اس وقت آکٹرلونی صاحب، رینل صاحب اور چند دیگر یورپین پروفیسر تھے۔میں نے کالج کا اتنا اچھا دور جہاں تک ڈسپلن کا تعلق ہے، آج تک کہیں نہ پایا۔اس زمانے میں کوئی ایسا نہ تھا جو یونی فارم سے مستثنیٰ رہنے کی ہمت کرتا، کیوں کہ ایک طرف ڈائننگ ہال کی پابندی تھی اور دوسری طرف ٹول صاحب کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ٹول صاحب اکنامکس (اقتصادیات) پر اسٹریچی ہال میں لیکچر دیا کرتے تھے اور ٹھیک دس بجے پرنسپل آفس (پکی بارک کمرہ نمبر 2 یا 3) سے نکل کر اسٹریچی ہال کا رُخ کرتے، جو لوگ مسجد کے قریب ہوتے اور یونی فارم میں کسی قسم کا نقص ہوتا اس طور پر جان بچا کر بھاگتے تھے کہ سنبھلنا دشوار ہوتا تھا۔ایک روز کا واقعہ ہے، ہمارے دوست محمد یٰسین خاں صاحب ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی جن کو ڈائننگ ہال اور الکشن سے خاص نسبت تھی، ایک اوورکوٹ یا ایسی کوئی چیز پہنے ہوئے آسمان منزل کے قریب کسی کلاس میں جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اتفاق سے ٹول صاحب اسٹریچی ہال سے برآمد ہوئے۔انھوں نے مسکرا کر خان صاحب کو بلایا، خان صاحب حال ہی میں داخل کالج ہوئے تھے۔ان کے ساتھیوں کو ٹول صاحب کے اس اظہار خصوصیت پر رشک بھی ہوا اور حیرت بھی۔ٹول صاحب نے آفس میں پہنچ کر خان صاحب کو ایک پرزہ دیا، بر سر آفس پہلو ہی میں تھا، وہاں تک ان کو پہنچا دیا۔پرزے پر کچھ نیلی اور سرخ نیلی پنسل سے لکھا ہوا تھا۔کسی کو نہ معلوم ہوسکا کہ کیا پیش آیا لیکن لوگوں نے بعد میں خان صاحب کو کبھی وہ اوورکوٹ پہنے نہ دیکھا۔کچھ لوگوں نے دریافتِ حال پر اصرار کیا تو خان صاحب نے کچھ ایسے تیور ظاہر کیے کہ پھر ہمت نہ ہوئی۔ایک افواہ بعد میں سنی گئی کہ خان صاحب نے آئندہ ماہ میں جو خرچ گھر سے منگوایا اس میں دو روپے زائد تھے۔یہ پتا اس طور پر چلا کہ خان صاحب نے اس ماہ میں چٹھی رساں کو بھی کچھ نہ دیا۔

یہ ایک دیرینہ سنت چلی آتی ہے کہ پروفیسر اگر کچھ دیر میں کلاس میں آئے تو لڑکوں کو آنے سے قبل گھر چلے جانے کا حق ہے لیکن ٹول صاحب کے گھنٹے میں یہ کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی طور پر غیر حاضر ہو سکے۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا تذکرہ کردینا بھی غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ رینل صاحب وقت کے نہایت پابند تھے۔ ایک دفعہ شاید ان کو آنے میں دیر ہوئی، لڑکے چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپین اسٹاف نے استعفیٰ داخل کردیا تھا اور لڑکوں کو خیال تھا کہ شاید یہ لوگ اپنی دیرینہ پابندی ملحوظ نہ رکھیں گے۔ دوسرے رینل صاحب نے کلاس میں اس کے متعلق دریافت کیا تو صورتِ حال بیان کردی گئی جس کے جواب میں فرمایا کہ: ''آئندہ سے میری باری میں ایسا مت کرنا الاّ ایسی حالت میں کہ جب تم یہ سنو کہ مسٹر رینل صاحب وفات کر گئے۔'' استعفیٰ منظور ہو چکا تھا۔ یہ لوگ اپنا تمام سامان نیلام کرا رہے تھے اور ایک عجیب بے سروسامانی تھی، لیکن پھر آخر دن تک کلاس میں آئے اور جزوی مسائل پر بھی نہایت تن دہی سے لیکچر دیتے رہے اور تمام انتظامی معاملات میں پورے طور پر منہمک رہے۔

ہمارے دوست اشفاق احمد صاحب جو اس سال ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی ہونے سے بال بال بچے اور جن کی انگریزی خط لکھنے کی فیس ایک پیڑا تھا، کالج میں انفلوائنزا کے ہم عصر تھے۔ گو بیماری کا حملہ سخت تھا اور بہت سے لوگ مکان کو چلے گئے تھے، لیکن یہ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ٹول صاحب سے عام تعطیل کی فرمائش کرتا۔ بالآخر اشفاق صاحب سے رجوع کیا گیا۔ ٹول صاحب کا گھنٹہ تھا، اشفاق صاحب کی ہمت براہِ راست اس مسئلے کے چھیڑنے کی نہ پڑی، آخر میں کچھ کہا نہ سنا چھینکنا شروع کیا۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ٹول صاحب نے کچھ نوٹس نہیں لیا۔ لیکن گھنٹے کے ختم ہونے کے بعد اشفاق صاحب کلاس ہی میں روک لیے گئے۔ لوگوں نے سمجھا مراد پوری ہوگی لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ صاحب موصوف براہِ راست اسٹریچی ہال سے کرزن اسپتال پہنچا دیے گئے اور ان کا بستر وغیرہ عقب سے بھیج دیا گیا۔ اسی سال ایک صاحب کیننگ کالج سے تشریف لائے، علی گڑھ میں ان کا نام سرا اینڈریوا گوچیک رکھا گیا۔ سہولت کے خیال سے بعد میں صرف اینڈریو پر اکتفا کرلیا گیا تھا۔ ممدوح کو اس خطاب سے سخت بیزاری تھی۔ لمبا چھریرا قد، متلون مزاج، پتلی پتلی ٹانگوں پر لکھنوی آڑا پائجامہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔

جیسا قاعدہ ہے کالج میں داخل ہوتے ہی اپنی اہمیت منوانے پر سخت مصر ہوئے اور اپنے احباب کی فہرست میں بعض مقتدر یورپین حکام کا نام بھی شامل کرلیا کرتے تھے۔ کلاس بہت بڑا ہوتا تھا اور ان کو سب سے اگلی صف میں پروفیسر کے سامنے بیٹھنے پر سخت اصرار رہتا۔ اکثر تمام نشست گاہوں کو پھاندتے ہوئے اگلی صف میں جا بیٹھتے تھے اور ہمیشہ کتاب پر کچھ نہ کچھ نوٹ کرتے رہتے تھے۔ اپنی کتاب دینا تو درکنار یہ بھی نہیں گوارا کرتے تھے کہ کوئی کتاب کی سمت نظر اٹھا کر دیکھے۔ اشفاق صاحب نے ایک روز کسی ڈے اسکالر ہندو طالب علم سے دوران لیکچر میں چپکے سے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ذرا مسٹر اینڈریو کی کتاب تو لے کر مجھے دے دینا۔ اس غریب کو کیا معلوم، مسٹر ممدوح کس قدر فاصلے پر بیٹھے تھے۔ اس نے کہا، مسٹر اینڈریو مہربانی کرکے اپنی کتاب تو دیجیے گا۔ یہ سننا تھا کہ ممدوح کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی، لیکن کر کیا سکتے تھے، آکٹرلونی صاحب کا گھنٹہ تھا، وہاں بات بات پر لوگ محجوب اور مردود ہوتے تھے، پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ کلاس ختم ہونے پر جو کچھ پیش آیا ہے وہ بس دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ آکٹرلونی صاحب ان کو ماننے لگے تھے۔ ایک دن جب پورا کلاس بیٹھ چکا اور آکٹرلونی صاحب کلاس میں داخل ہونے لگے تو اشفاق صاحب نے اشارہ کیا، جو شخص ان کے پاس بیٹھا تھا وہ اُٹھ کر چل دیا اور اشفاق صاحب لپک کر سر موصوف کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ وہ غضب آلود نگاہیں اور مشکوک تیور اب بھی یاد آتے ہیں تو یک بہ یک ہنسی آجاتی ہے۔ آکٹرلونی صاحب نے حاضری لینی شروع کی اور اشفاق صاحب نے چپکے چپکے لیکن اس طور پر کہ پاس والے سن سکتے، حاضر جناب، حاضر جناب کہنا شروع کیا۔ سر موصوف اپنے نام پر یک لخت بول اٹھے، حاضر جناب! آکٹرلونی صاحب نے پنسل میز پر رکھ دی اور اس پیچ و تاب کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ حواس باختہ ہو گئے۔ سارا کلاس ہنسی ضبط کرنے سے بے تاب ہو رہا تھا، یہ بڑی سخت ٹریجڈی تھی، ان کو کلاس سے باہر کردیا گیا، سنا جاتا ہے کہ ایک مدت تک آکٹرلونی صاحب ان سے رام نہ ہو سکے، ان کو پان سے بھی خاص ذوق تھا، جس روز یہ کالج میں پان دان لے کر اُترے ہیں اسی روز سے لوگوں کی نظریں ان پر پڑنے لگی تھیں۔ اشفاق صاحب بھی اس کے عادی تھے، لیکن آج تک انھوں نے نہ پان دان رکھا اور نہ پان خریدا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سنا تو کہنے لگے،

بھئی میں بھی تلاش میں ہوں اور تمھیں بھی کوئی نظر آ جائے تو بتانا۔ اتفاق سے سب لوگوں کے ساتھ ان کی نظر بھی سر موصوف کے پان دان پر پڑی۔ اشفاق صاحب نے پہلے تو یہ فرمائش کی کہ وہ پان دان میں ان کو بھی شریک کر لیں لیکن جب یہ نہ ہوسکا تو ایک روز ان کا پان دان غائب کر دیا، سر موصوف جب کسی پیچیدگی میں پڑتے تھے تو اشفاق صاحب سے ہی مشورت بھی کرتے تھے۔ حسب معمول ان سے رجوع کیا، انھوں نے فوراً تول صاحب کو ایک عرضی لکھوائی، نفسِ مضمون یہ تھا کہ یہ پان دان ان کی بیوی کو جہیز میں ملا تھا اور پان دان پوش بھی اسی نیک بخت نے تیار کیا تھا۔ آخر میں یہ بھی لکھا دیا تھا کہ اگر پورا پان دان نہ مل سکے تو کم سے کم چھالیا ضرور دلائے کیوں کہ اسے ان کی بیوی نے خاص طور پر تراش کر دیا تھا اور اس قسم کی ترشی ہوئی چھالیا ہندوستان میں نایاب تھی۔ یہ عرضی راستے ہی میں روک لی گئی۔ اشفاق صاحب کے سپرد تفتیش کا کام ہوا۔ بالآخر مستغیث اور تفتیش کنندہ میں مصالحت ہوگئی۔ شرط مصالحت یہ تھی کہ سر اینڈریو تمام پان کھانے والوں کو مدعو کریں اور چھالیا متنازع سب میں تقسیم کر دیں۔

سر اینڈریو کے واقعات نہایت دلچسپ ہیں لیکن مضمون ضرورت سے زیادہ طویل ہوتا جاتا ہے اور ابھی بہت سے بزرگوں کا تذکرہ باقی ہے اس لیے فی الحال موصوف سے رخصت ہوتا ہوں۔ بہت ممکن ہے وہ خود ''اولڈ بوائے'' میں اپنے جوہر دکھائیں۔ معلوم نہیں آج کل کہاں ہیں، پچھلے سال اشفاق صاحب ان کو نمائش میں تلاش کرتے ہوئے پائے گئے۔

اشفاق صاحب اور راقم الحروف ایک ہی سال کالج میں داخل ہوئے اور ایک ہی ہاؤس (پکی بارک مغربی) میں قیام پذیر رہے۔ اسی سائڈ میں شاہ علاء الحق صاحب، مولانا اقبال سہیل صاحب، عبدالعلی انصاری صاحب، ذاکر حسین خاں صاحب بھی رہتے تھے۔ شاہ صاحب نے اشفاق صاحب کو تاک لیا تھا کہ رات میں بے چارے کو برابر پانی اور مٹی سے گل حکمت کیا کرتے تھے۔ طرّہ یہ کہ اشفاق صاحب کو اس کی خبر نہ تھی کہ شاہ صاحب کی توجہ ان پر ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ داخل کالج ہوتے ہی اشفاق صاحب کی زبان سے چند غیر آئینی کلمے نکل گئے تھے (یہ عادت اب ان کے فضائل میں شمار ہونے لگی ہے) اور یہ اسی کا خمیازہ تھا، اسی زمانے میں سوئمنگ باتھ کا افتتاح ہوا تھا۔ لطف یہ کہ جس روز لارڈ کچنر کے غرقابی کی خبر آئی ہے اسی روز

اشفاق صاحب بھی سوئمنگ باتھ میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔اس واقعے کی شان نزول بھی عجیب ہے۔ ایک صاحب حوض میں داد شناوری دے رہے تھے، کچھ لوگ پیراک اور کچھ پیراکی کا مشاہدہ کرر ہے تھے۔اشفاق صاحب کے جذبات کچھ زیادہ بے ساختہ ہو گئے اور کوئی ہوتا تو اس فروگزاشت پر کہیں دور یا نزدیک سے محض کھانسنے کی ایک آدھ آواز سن لیتا، لیکن اشفاق صاحب تو ابھی ''کے آمدی و کے پیر شدی'' میں تھے، کسی نے ان کو پیچھے سے ایک ہلکا سا ہچکولا دے دیا اور یہ سیدھے حوض میں جا رہے، دو ہی چار بار پانی سر سے گزرا تھا کہ ان کے پہلے دوست نے جن کا نظارہ ان کے لیے بلائے جاں ہو رہا تھا، ان کو باہر نکالا۔اشفاق صاحب کو بعد میں معلوم ہوا کہ لارڈ کچز غرقاب ہو چکے تھے۔بعضوں نے ان کو افسوس کرتے بھی سنا، لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اپنی نجات پر یا لارڈ موصوف کی وفات پر اظہار کم زوری کرر ہے تھے۔

اولڈ بوائے (بنارس) 1925

●